

انتخاب کلام میر





میر تقی میر (۱۷۲۲ - ۱۸۱۰ء) اردو کے بلند مرتبت شاعر ہیں، وہ آگرہ میں پیدا ہوئے، انتہائی نامساعد حالات میں انھیں تلاشِ روزگار کے لیے دلّی کا رُخ کرنا پڑا، لیکن وہاں کی سیاسی افراتفری، طوائف الملوکی اور بدامنی نے انھیں قلبی سکون سے محروم رکھا، لکھنو گئے، لیکن وہاں کی ظاہری چمک دمک انھیں راس نہ آئی، تاہم زندگی کے بقیہ ۳۱ سال مسلسل جدو جہد، پراگندگی اور پریشاں حالی میں گزار کر وہیں وفات پائی۔

میر تقی میر نے اٹھارھویں صدی کے اضطراب و انتشار اور درد کو پورے خلوص سے اپنی شخصیت میں جذب کیا، ان کی عظمت کا راز یہ ہے کہ انھوں نے شخصی درد و غم کو انسانی درد و غم بنایا، اور اپنے کثیر المعانی تجربات و واردات کو علامتی پیرائے میں پیش کیا۔

میر نے چھ ضخیم دواوین بطور یادگار چھوڑے ہیں، میر شناسوں نے ان کے کلام کے بعض انتخابات مرتب کیے ہیں، تاہم وہ ان کی بھرپور نمائندگی نہیں کرتے، زیر نظر انتخابات اُن کے جملہ اصنافِ سخن کا ایک جامع اور بھرپور انتخاب ہے۔

انتخابِ کلامِ میر

انتخابِ کلامِ میرؔ

مُرتّبہ

حامدی کاشمیری

ساہتیہ اکادمی

سرورق کے آخری صفحہ پر سنگ تراشی کے جس نمونے کی تصویر دی گئی ہے، اس میں تین جیوتشی بھگوان بدھ کی ماتا مہارانی مایا کے خواب کی تعبیر بیان کر رہے ہیں۔ اور ان کے نیچے ایک کاتب بیٹھا ان کی تعبیر قلمبند کر رہا ہے۔ یہ شاید ہندوستان میں لکھنے کے فن کی قدیم ترین تصویری مثال ہے۔

(ناگارجن کونڈا، دوسری صدی عیسوی)
(بشکریہ نیشنل میوزیم، نئی دہلی)

جلوہ ہے مجھی سے لبِ دریائے سخن پر
صد رنگ مری موج ہے، میں طبعِ رواں ہوں

میرؔ

Intakhab-e-Kalam-e-Mir : A selection by Hamidi Kashmiri from Mir's poetry in Urdu. Sahitya Akademi, New Delhi (1992), Rs. 150.

پہلا ایڈیشن : ۱۹۹۲ء

ساہتیہ اکادمی

ہیڈ آفس :
رویندر بھون، ۳۵ فیروز شاہ روڈ، نئی دہلی ۱۱۰۰۰۱
سیلس آفس : سواتی بلڈنگ، مندر مارگ، نئی دہلی ۱۱۰۰۰۱

علاقائی دفاتر :
جیون تارا بلڈنگ، چوتھی منزل ۲۳ اے/۴۴ ایکس، ڈائمنڈ ہاربر روڈ، کلکتہ ۷۰۰۰۵۳
۱۷۲، ممبئی مراٹھی گرنتھ سنگھرالیہ مارگ، دادر، بمبئی ۴۰۰۰۱۴
گنا بلڈنگس، دوسری منزل ۳۰۴-۳۰۵، ۴۰۴ انا سلائی، تینام پیٹھ، مدراس ۶۰۰۰۱۸
۱۰۹، جے۔ سی۔ روڈ، بنگلور، ۵۶۰۰۰۲

ISBN 81-7201-365-5

قیمت 150 روپے

منجے پرنٹرس، دلی ۱۱۰۰۳۲

فہرست

مقدّمہ

غالبؔ نے یہ کہہ کر کہ "کہتے ہیں اگلے زمانے میں کوئی میرؔ بھی تھا" میرؔ کی اُستادی کا اعتراف تو کر لیا، لیکن اِس کی کوئی قابلِ قبول تحسینی یا تنقیدی اساس فراہم نہیں کی۔ "کہتے ہیں" اور "کوئی میر بھی تھا" سے ظاہر ہوتا ہے کہ وہ لوگوں یا دیگر اہلِ سخن کی بات کو دُہرا رہے ہیں اور میر کے ساتھ "کوئی میر" جوڑ کر میر سے اپنی شخصی شناسائی کی تردید کر رہے ہیں، ہوسکتا ہے کہ غالبؔ کا انداز ذکر تجاہلِ عارفانہ ہو اور وہ میرؔ کے قریبی مطالعے کے باوجود اُن سے اپنے بعد کا اظہار کر رہے ہوں اس کا سبب غالبؔ کے یہاں انا پرستی کا نفسیاتی مسئلہ بھی ہوسکتا ہے یعنی وہ اس شعر میں جان بوجھ کر میرؔ کی عظمت کا برملا اظہار کرنے سے گُریز کر رہے ہوں بہرکیف، غالبؔ کے مصرعِ ہذا سے تو یہی مترشح ہوتا ہے کہ انھوں نے میرؔ کی عظمت کا شہرہ تسلیم کرنے کے باوجود، میر شناسی سے اپنی لاتعلقی کا اظہار کیا ہے۔

تاہم میرؔ کے بارے میں غالبؔ کے متذکرہ بیان کو سو فی صد درست تسلیم کرنے میں بھی کوئی تامّل نہیں ہونا چاہیے، اِس لیے کہ میرؔ کی عظمت کی حقیقی شناخت کا مسئلہ نہ صرف اُن کے دَور میں، بلکہ اُن کے بعد آنے والے ادوار میں بھی جوں کا توں قایم رہا، یہاں تک کہ موجودہ صدی کے نصف اوّل تک یہ مسئلہ قایم رہا۔ یہ ضرور ہے کہ میرؔ کی قادر الکلامی کی مدح سرائیاں ہوتی رہیں،

ہم ہیں کیا چیز جو اس طرز پہ جائیں اکبر ناسخ و ذوق بھی جب چل نہ سکے میر کے ساتھ
(اکبر)

شعر میرے بھی ہیں پر درد ولیکن حسرت میر کا شیوۂ گفتار کہاں سے لاؤں
(حسرت)

لیکن یہ سارے تحسینی کلمات سراسر تحسینی نوعیت کے ہیں اور تنقیدی محاکمے سے دور کا بھی تعلق نہیں رکھتے، اِس پس منظر میں غالب کے میر کے بارے میں متذکرہ بالا بیان کو بھی زبانی تعریف ہی پر محمول کیا جا سکتا ہے۔

یہ واقعہ ہے کہ اردو کی کلاسیکی شاعری میں میر کو وہ مقام نہیں ملا جس کے وہ حقدار تھے، اور آج بھی میر کی تحسین شناسی کا عمل غیر تشفی بخش اور ادھورا ہے۔ اِس کے کیا اسباب ہیں؟

پہلا سبب تو یہ ہے کہ میر کا عہد اٹھارویں صدی کا زمانہ ہے۔ اِس زمانے میں سیاسی عدم استحکام اور بدنظمی کی بِنا پر علمی و ادبی مجالس درہم برہم ہو چکی تھیں، خاص کر دلّی، جس سے میر اپنا مستقبل وابستہ کر چکے تھے، کا حال ابتر تھا۔ میر لکھنؤ گئے تو لکھنؤ کا شعری اور عشرت پسند ماحول بھی راس نہ آیا، ایسے انتشار ساماں اور ہلاکت خیز دور میں کسی اعلیٰ پایے کے شاعر کی حقیقی عظمت کیونکر سامنے آسکتی تھی؟ اور پھر نشر و اشاعت کے جدید ذرائع کے فقدان نے بھی اُن کی شہرت کو پھیلنے نہ دیا، اُن کے پرستار اُن کی غزلیں پرچیوں پر لکھ لکھ کر بے جانے پر اکتفا کرتے رہے، غالب نے اپنے دور میں پھر بھی رسل و رسائل کے بعض جدید ذرائع سے استفادہ کیا، اور چھاپہ خانہ کی شکل تو دیکھی جس سے ان کا کلام فوری طور پر شہرت اور ترسیلیت کے مرحلے طے کرتا رہا، یہ بات میر کے نصیب میں کہاں تھی؟

دوسرے، میر کے عہد میں اردو زبان، جو اُن کا ذریعۂ اظہار (میڈیم) تھی ابتدائی تشکیلی دور سے گذر رہی تھی اور اُس کی ادبی زبان کی صورت متعیّن ہو رہی تھی، یہ کہنا زیادہ درست ہے کہ خود میر نے ایک گہرے لسانی شعور کے تحت تخلیقی زبان کی وسعت اور وقار عطا کرنے کی سعی کی، تاہم چونکہ یہ پہلی

تذکروں میں اُن کا نام عزت و تکریم سے مندرج رہا، مثلاً :-

"شہرہ آفاقست..... طبش بہ مضامین تازہ وغیر مبتذل معنی پرداز ست"
(سراج الدین علی خان آرزو)

"شمع انجمن عشق بازاں، فروغ محفل سخن پرد ازاں..."
(شیخ محمد قیام الدین قائم)

"سخن سنج بے نظیر..... طبش معنی ایجاد...."
(سید فتح علی حسینی گردیزی)

"شعرش چوں در خوش آب و انداز سخنش بے حساب..."
(میر حسن)

"شاعر پُر مغز و ہمہ داں، استاد ہم چشماں...."
(قدرت اللہ شوق)

"در فن شعر ریختہ مرد صاحب کمال است کہ مثل او خاک ہند دیگرے سر بر نیاوردہ" (شیخ غلام ہمدانی مصحفی)

علاوہ ازیں، اساتذہ نے مختلف ادوار میں اُن کی انفرادیت اور عظمت کا اعتراف کیا ہے، مثلاً :-

سودا تو اس غزل کو غزل در غزل ہی لکھ ہونا ہے تجھ کو میر سے استاد کی طرف
(سودا)

اے مصحفی تو اور کہاں شعر کا دعوےٰ بھپتا ہے یہ انداز سخن میر کے مونھہ پر
(مصحفی)

شبہ ناسخ نہیں کچھ میر کی استادی میں خود وہ بے بہرہ ہیں جو معتقد میر نہیں
(ناسخ)

نہ ہوا پر نہ ہوا میر کا انداز نصیب ؛ ذوق یاروں نے بہت زور غزل میں مارا (ذوق)
میر کے شعر کا احوال کہوں کیا غالب جس کا دیوان کم از گلشن کشمیر نہیں
(غالب)

تصانیف

۱۔ کلیات :۔ اِس میں غزلیات کے چھ دیوان، مثنویاں، تضمینیں قطعات رباعیات، ترکیب بند، ترجیع بند، واسوخت، قصاید، مراثی۔

۲۔ نکات الشعراء : (شعرائے اردو کا تذکرہ)

۳۔ ذکرِ میر : (خود نوشت سوانح عمری)

۴۔ کلیات فارسی : (غیر مطبوعہ)

۵۔ فیض میر : (پانچ فقیروں کی کہانیاں)

ایسا محسوس ہوتا ہے کہ میر نے زندگی کے ہر پل کو فکرِ سخن میں صَرف کیا ہے اور "خونِ جگر" کو "ودیعت مژگاں یار" کیا ہے۔ انھوں نے جو کچھ کہا ہے، اسے قلم بند کیا۔ یہاں تک کہ ایسے متعدد اشعار بھی لکھے جو صریحاً کلام منظوم کے ذیل میں آتے ہیں یا جو کسی فوری، وقتی یا یک رُخی ردِ عمل کا نتیجہ ہیں، یا جو حد درجہ متبذل، پوچ اور غیر شائستہ ہیں اور جہاں تک غیر غزلیہ شاعری کا تعلق ہے اُس کا بیشتر حصہ بھی محض کلام منظوم کی حیثیت رکھتا ہے یا تکراری نوعیت کا ہے۔ یہ واقعہ ہے کہ میر نے اپنے کلام بسیار کا انتخاب نہیں کیا ہے حالانکہ وہ انتخاب کی ضرورت سے واقف تھے۔ ؎

تذکرے سب کے پھر رہیں گے دھرے\
جب مرا انتخاب نکلے گا

ذوقِ سخن ہوا ہے اب تو بہت، ہمیں بھی\
لکھ لیں گے میر جی کے کچھ شعر چیدہ چیدہ

حالانکہ انھوں نے کئی جگہ انتخاب کی خواہش کا اظہار کیا ہے لیکن نامعلوم وجوہ کی بنا پر وہ ایسا نہ کر سکے، یہ کام کلاسیکی شعرا میں سوائے غالب کے اور کسی

کوشش تھی اِس لیے ہندی اور فارسی زبانوں کی آمیزش سے جو ادبی زبان اُبھرنے لگی وہ فارسیت کی آمیزش کے باوجود عوامی اور دیہی زبان کے عناصر سے گرانبار نظر آتی ہے۔

ع پر مجھے گفتگو عوام سے ہے

میرؔ کے بعد غالبؔ کے زمانے تک آتے آتے زبان شائستگی، بناوٹ، صفائی اور شہریت کے بڑھتے ہوئے میلان کو ظاہر کرنے لگی، غالبؔ کے یہاں زبان کی تطہیر و تقلیب کا عمل نقطۂ عروج کو چھوتا نظر آتا ہے اور اہل سخن کے نزدیک سند کا درجہ حاصل کرتا ہے، زبان کے اِس برتاؤ کو اعلیٰ شاعری کے مترادف قرار دیا گیا یہاں تک کہ لکھنوی شعراء مثلاً ناسخؔ کے یہاں زبان کی تہذیب ہی شاعری کا نعم البدل قرار پائی، میرؔ چونکہ پُرگو تھے اور عوامی زبان کے زیادہ قریب رہے اس لیئے "شرفا" کے لیے باعثِ کشش نہ رہے۔

تیسری بات یہ ہے کہ میرؔ کثیر الکلام شاعر تھے، اُن کی غزلیات کے چھ دیوان' اور غزل کے علاوہ دیگر اصناف مثلاً مثنوی، مرثیہ، قصیدہ، مخمس اور رباعی وغیرہ میں بھی طبع رواں رکھتے تھے اور ان اصناف میں متعدد منظومات پیش کر چکے ہیں۔ چنانچہ ان کی تفصیل یہ ہے :۔

مثنویاں (عشقیہ، سماجی، مدحیہ، ہجویہ)	۳۹
قصاید	۶
رباعیات	۱۰۹
مرثیے اور سلام	۴۱
مخمس	۹
مسدس	۴
واسوخت	۴
ترکیب بند	۱
ترجیع بند	۱
ہفت بند	۱

فاروقی، وارث علوی، فضیل جعفری اور مغنی تبسم نے میرؔ کی فن کارانہ شخصیت اور تخلیقی ذہن کے مختلف العباد کی نشاندہی کی ہے اور یہ عمل جاری ہے۔

تقسیم وطن کے فوراً بعد ناصر کاظمی اور خلیل الرحمان اعظمی نے کچھ تو طبعی مناسبت اور کچھ خارجی حالات کی ابتری اور انتشار کے زیر اثر میریت میں اپنی غیر معمولی دل چسپی کا اظہار کیا اور اسے ایک شعری رجحان کے طور پر فروغ دینے کی کوشش کی۔ ناصر کاظمی نے بالخصوص میرؔ کی شاعری اور اُن کے درون بینی کے رویے سے ذہنی موانست کا اظہار کیا۔ انھوں نے نہ صرف انتظار حسین اور شیخ صلاح الدین وغیرہ سے گفتگوؤں اور مکالموں کے ذریعے بلکہ "میرؔ، ہمارے عہد میں" جیسے اہم مضامین لکھ کر میرؔ کی عصر حاضر میں معنویت کی بنیادوں کو تلاش کیا بلکہ میرؔ کے کلام کا ایک جامع انتخاب بھی مرتب کیا جسے اُن کے فرزند باصر سلطان کاظمی نے ۱۹۸۹ء میں انتخاب میر کے نام سے شائع کیا۔ خلیل الرحمان اعظمی نے بھی میرؔ کے احیاء میں نمایاں رول ادا کیا۔ انھوں نے اس زمانے میں شعر گوئی کا آغاز کیا جب ترقی پسندی عروج پر تھی۔ چنانچہ وہ بھی ترقی پسندی کے اثر میں آگئے لیکن انھیں برابر محسوس ہوتا رہا کہ تخلیق شعر کا عمل منصوبہ بندی اور پروپیگنڈا سے کوئی مطابقت نہیں رکھتا۔ وہ نفسیاتی کشمکش کے شکار ہوگئے۔ انھیں بقول ان کے "ایک عجیب طرح کی نارسائی اور ناتمامی کا احساس دامن گیر رہا"۔ گومگو کی اسی ذہنی حالت میں انھوں نے کلیاتِ میر کا مطالعہ کیا، لکھتے ہیں

"انھیں دِنوں کلیات میر کے مطالعے کے دوران میں مجھے ایسا محسوس ہوا جیسے میری داخلی دنیا میں کچھ دریچے کھل گئے ہیں"۔

انھوں نے میرؔ سے شناسائی کے بعد ترقی پسندی کی خطابت اور برہنہ گفتاری سے اپنے دامن کو بچانے کی سعی کی، اور داخلیت پسندی اور حرف زیر لبی کی جانب رجوع کیا، ناصر کاظمی نے تو مروجہ اور روایتی شعری رجحانات سے یکسر کنارہ کشی کر کے داخلی تجربات کی پیکر تراشی ہی پر انحصار کیا اور اپنے دور کو ایک نئے شعری مزاج سے آشنا کیا، یہ شعری مزاج میرؔ کے آہنگ سے تاثر پزیری کی خبر دیتا ہے، اس طرح سے موجودہ صدی کے نصف آخر کے بعد

نے نہ کیا، اور انھوں نے خود اپنی شاعرانہ امیج کی درخشانی اور دوام کا سامان کیا، اس کے برعکس میر کی شاعرانہ حیثیت ناقدری کی دھند میں روپوش رہی، اس لیے کہ ان کا فنی تکمیلیت اور آب و تاب سے آراستہ کلام، اُن کے کلام منظوم کے انباروں میں دب کے رہ گیا، رہے وہ اکّا دکّا انتخابات، جو دوسروں نے کیے ہیں، اُن کی حیثیت میر کے اس قول "کچھ شعر چیدہ چیدہ" سے زیادہ نہیں۔

چوتھا سبب یہ ہے کہ اردو تنقید کی عمومی، یک سطحی، نظریاتی اور غیر ادبی روش نے میر کی صحیح قدر سنجی کو مشکل بنایا ہے۔ اس نوع کی تنقید سے میر کی شعری انفرادیت اور عظمت کے نقوش اُجاگر نہ ہو سکے۔ اوّل تو لوگوں کو میر کے کلام میں تذکراتی تنقید کے تحت ایک عرصے تک صرف بہتر نشتر ہی نظر آئے یا اگر زیادہ باریک بینی سے کام لیا گیا تو اُن کے عمدہ اشعار کی تعداد چند سو تک بڑھی، فراق کو اُن کے یہاں کُل ڈھائی تین سو اشعار ہی قدر اوّل کے ملے۔ دوم، ان "اشعار چیدہ چیدہ" میں ناقدین کو میر کے کلام میں صرف محزونی و مایوسی جسے "آہ" سے تعبیر کیا گیا، نظر آئی یا پھر دل اور دلّی کے مرثیوں کی بات کی گئی۔ ظاہر ہے یہ رویہ کائناتِ میر کی گوناگوں وسعتوں سے لاعلمی کو ظاہر کرتا ہے اور اس سے میر شناسی کا عمل منجمد ہو کے رہ گیا۔

موجودہ صدی میں البتہ میر شناسی کا انجماد ٹوٹنے لگا اور میر شناسی کا رجحان تقویت پانے لگا ہے، ایک تو میر کے کئی نئے انتخابات شائع ہوئے۔ دوسرے میر کی حیات، عہد اور شاعری پر کئی تحقیقی و تنقیدی کتابیں منظر عام پر آئیں، نیز میر کے فن کارانہ ذہن کے تجزیے و تحلیل کی جانب بھی توجہ کی گئی چنانچہ عبدالحق نے انتخاب کلام میر شائع کر کے میر کی قدر شناسی کی جانب طلبہ، اساتذہ اور نقادوں کی توجہ مبذول کرائی۔ پھر اثر لکھنوی کی مزامیر، سردار جعفری کی انتخاب میر اور راقم کی انتخاب غزلیاتِ میر، کے علاوہ چند اور انتخابات بھی منظر عام پر آئے۔ نقادوں میں عبدالحق، قاضی عبدالودود، اثر لکھنوی، خواجہ احمد فاروقی، آل احمد سرور، نثار احمد فاروقی، نظیر صدیقی، سردار جعفری، شبیہ الحسن، سید عبداللہ، مجنوں گورکھپوری، حسن عسکری، اور فراق کے بعد جمیل جالبی، گوپی چند نارنگ، شمس الرحمٰن

کے مذکورہ سیمینار نے ایک اہم تاریخی رول ادا کیا، اس کے بعد میر کی مقبولیت کا ایک بارور دَور کا آغاز ہوا، نقّادوں نے میر کے ہمہ جہت مطالعے کی جانب توجہ کی اور میر کی ایک نئی دریافت ہونے لگی، اِس کا ثبوت اِس بات سے ملتا ہے کہ اِس سیمینار کے فوراً بعد میر پر کئی اہم کتابیں شائع ہوئیں، اور ادبی رسائل میں میر سنجی کے ضمن میں مقالات شائع ہوتے رہے۔

موجودہ دَور میں میر کی شعری حیثیت کو متعین کرنے اور ان کی مقبولیت کو عام کرنے میں محمد طفیل نے "نقوش" کے دو ضخیم اور یادگار نمبر شائع کر کے اہم رول ادا کیا۔ "نقوش" کے اکتوبر ۱۹۸۰ء کا شمارہ دیوانِ میر (نسخۂ محمود آباد) مرتبہ اکبر حیدری اور انتخابِ غزلیاتِ میر پر مشتمل ہے، دوسرا نمبر (نومبر ۱۹۸۰ء) اُن منتخبہ مطبوعہ مضامین پر مشتمل ہے جو میر کی شخصیت اور فن پر لکھے گئے ہیں، لکھنے والوں میں قاضی عبدالودود، سید محی الدین قادری زورؔ، مسعود حسن رضوی، نادم سیتاپوری، مالک رام، آل احمد سرور، سید عبداللہ، مجنوں گورکھپوری، احتشام حسین، فراق گورکھپوری، شبیہہ الحسن، نثار احمد فاروقی، کلیم الدین احمد، محمد حسن عسکری، ڈاکٹر صفدر آہ، ابو محمد سحر، گیان چند جین، سلامت اللہ خاں، میرزا ادیب، ناصر کاظمی، وحید الدین سلیم، ابواللیث صدیقی اور جمیل جالبی وغیرہ۔

میر کو اردو شاعری میں اُن کا صحیح اور اصلی مقام دلوانے میں جو اسباب مانع رہے اُن کا پچھلے صفحات میں مذکور ہوا، اِن میں کلامِ میر کے کسی جامع و مانع انتخاب کی عدم موجودگی بالخصوص میر اور میریت کی یافت و استحکام میں حائل رہی، جو بھی انتخابات شائع ہوئے، خواہ وہ عبدالحق کا انتخاب ہو، آثر لکھنوی کا ہو یا سردار جعفری کا، وہ بالعموم ذاتی پسند ناپسند یا انفرادی جھکاؤ یا عجلت پسندی کے تحت ہوئے ہیں، عام طور پر ایسے اشعار کو شاملِ انتخاب کیا گیا ہے جو سہل کے ذیل میں آتے ہوں یا جن میں میر نے ذاتی یا اجتماعی زندگی کے دکھ درد کا اظہار کیا ہے، خواہ ایسے اشعار کا فنی رچاؤ مشتبہ ہی کیوں نہ ہو۔

پس یہ ضرورت اپنی جگہ قایم رہی کہ میر کے کلام کا خالص ادبی اصولوں

میریت کے فروغ کے لیے فضا سازگار ہونے لگی۔

۱۹۷۸ء میں پروفیسر گوپی چند نارنگ نے جامعہ ملّیہ کے زیر اہتمام میرؔ پر ایک ہندو پاک سیمنار کا انعقاد کیا۔ اِس سیمنار میں میرؔ کی شخصیت اور فن پر متعدد مقالے پڑھے گئے:۔

میر تقی میر	محمد ہدایت اللہ
میر اور غالب	مالک رام
میر، میری نظر میں	آل احمد سرور
میر تقی میر — جدید ہندستان کے قومی شاعر	جمیل جالبی
اسلوبیات، میر کے بعض پہلو	گوپی چند نارنگ
میر کی جنج تنتر	انتظار حسین
شہر میر	خواجہ احمد فاروقی
غالب اور میر، مطالعے کے چند پہلو	شمس الرحمان فاروقی
میر اور جدید ذہن	وارث علوی
میر کلچر	ظ۔ انصاری
میر کا تصوّر انسان	عبدالمغنی
میر کی شاعری کا اسم اعظم	محمود ہاشمی
میر کی شاعری کا نثری اظہار	نیّر مسعود
میر کی شاعری کا پہلو	حامدی کاشمیری
میر کے لہجے کے صوتی میلانات	مغنی تبسم
میر اور لکھنؤ	کاظم علی خاں
میر اور بندشِ الفاظ	حنیف کیفی

میرا خیال ہے کہ جدید دور میں میرؔ کی احیائے نو میں پروفیسر گوپی چند نارنگ

کے ساتھ ساتھ ان کی دیگر اصناف کا ایک جامع انتخاب بھی کیا جائے۔ چنانچہ راقم نے یہ کام اپنے ہاتھ میں لے لیا اور اب بفضلہ اس کی تکمیل ہو گئی ہے۔

جن مطبوعہ کلیات و دواوین سے انتخاب کنندگان نے بالعموم استفادہ کیا ہے وہ یہ ہیں :-

۱۔ کلیات میر (نسخہ کلکتہ) ۱۸۱۱ء
یہ نسخہ نایاب ہے، اس کی ایک جلد دارالعلوم ندوہ لکھنؤ کے کتب خانے کی زینت ہے۔

۲۔ کلیات میر (نسخہ نولکشوری) ۱۸۶۸ء

۳۔ کلیات میر (نسخہ آسی)، مرتبہ مولوی عبدالباری آسی ۱۹۴۱ء

۴۔ کلیات میر (نسخہ عباسی) مرتبہ ظل عبّاس عبّاسی ۱۹۶۸ء
یہ دواوین کا کلیات ہے۔

۵۔ دیوانِ میر (نسخہ حیدری) مرتبہ اکبر حیدری ۱۹۷۲ء

اور انتخابات کی تفصیل یہ ہے :-

۱۔	انتخاب دیوانِ میر	حسرت موہانی مشمولہ انتخاب سخن، جلد چہارم سلسلہ مظہر جانِ جاناں ۱۹۸۳ء
۲۔	انتخاب کلام میر	مولوی عبدالحق
۳۔	دیوانِ میر	علی سردار جعفری
۴۔	انتخاب میر	ناصر کاظمی
۵۔	انتخاب میر	ناصر کاظمی سویرا ۱۹، ۲۰، ۲۱
۶۔	مزامیر	اثر لکھنؤی
۷۔	انتخاب غزلیات میر	حبیب اشعر دہلوی، محمد طفیل ادارۂ نقوش
۸۔	انتخاب میر	نثار احمد فاروقی
۹۔	انتخاب غزلیاتِ میر	حامدی کاشمیری

مطالعۂ میر کے دوران میں مجھے بار بار یہ استعجاب انگیز احساس ہوا ہے کہ اُن کے یہاں متعدد ایسے اشعار ہیں جو بظاہر سیدھے سادے، سہل الفہم،

کے تحت ایک جامع اور مستند انتخاب کیا جائے تاکہ اُن کی انفرادیت، معنویت اور عظمت کے نقوش روشن ہوں، اِس ضرورت کے پیش نظر راقم نے میر کی غزلیات کا انتخاب کیا جو ترقی اردو بیورو، نئی دہلی سے ۱۹۸۸ء میں شائع ہوا، اس انتخاب کے مقدمے میں راقم نے لکھا ہے:۔

"بہرحال میر کے شعری سحر میں آکر میں نے گزشتہ پانچ برسوں میں اُن کے اشعار کو مرکز توجہ بنایا، اور جو شعر شعری وصف سے آراستہ نظر آیا اُس پر نشان لگایا، ابتدائی مطالعے کے دوران میں نے دو ہزار اشعار پر نشانات لگائے، لیکن میری تشفی نہ ہوئی۔ میں نے مطالعہ برابر جاری رکھا، اور میری محنت رائیگاں نہ گئی، میرا دامنِ شوق کلیاتِ میر کے مزید جواہر پاروں سے بھرتا گیا، میرے نزدیک اس وقت تک کلامِ میر کا یہ سب سے ضخیم، جامع اور نمائندہ انتخاب ہے۔ اِس سے جہاں قدیم تذکرہ نویسی کے دَور کی تکذیب ہوتی ہے کہ میر کے یہاں بہتر نشتر ملتے ہیں وہاں جدید دَور میں اس خیال کی تردید بھی ہوتی ہے کہ اُن کے عمدہ اشعار کی تعداد چند سو تک پہنچتی ہے۔"

"انتخاب غزلیات میر" کی اشاعت (۸۹-۱۹۸۸ء) کی اشاعت کے بعد سردیوں کی تعطیل کے دوران ایک نامعلوم جذب و کشش کے تحت میں نے پھر کلیاتِ میر ہاتھ میں اٹھایا، اور اس کے مطالعے کی طرف راغب ہوا۔ مجھے یہ دیکھ کر حیرت ہوئی کہ جن اشعار پر میں نے نشانات نہیں لگائے تھے ان میں سے اکثر اشعار جو بظاہر سادہ رو تھے، بہ باطن "پیچیدہ بیان" تھے، میں ایسے اشعار پر غور و فکر کرتا رہا، مجھے ان میں سے کوئی نہ کوئی ایسا خفتہ یا بیدار فنی نکتہ نظر آیا جو شعر کو تخلیقی حسن سے ہمکنار کرتا ہے۔ چنانچہ میں ایسے اشعار پر نشانات لگاتا گیا۔ حسنِ اتفاق سے ۱۹۸۹ء میں ساہتیہ اکاڈمی نے کلامِ میر کے ایک جدید، جامع اور مستند انتخاب کی ضرورت کا احساس کیا اور یہ کام راقم کو تفویض کیا۔ اِس نئے انتخاب کی ضرورت اور جواز یہ بھی تھا کہ میر کی غزلیات

مرتبین نے صرف غزلیات کے انتخاب کیے ہیں، راقم نے پیش نظر انتخاب میر میں جملہ اصناف کا انتخاب پیش کیا ہے اِن میں مثنویات، مخمسات، رباعیات، اور فردیات وغیرہ شامل ہیں جہاں تک اِن اصناف کے طریق انتخاب کا تعلق ہے. یہ عرض کرنا مناسب ہوگا کہ اِن کے ایسے اشعار ہی کو منتخب کیا گیا ہے جو لسانی اور معنوی خوبیوں کے حامل ہیں اور جو کسی صنف مثلاً مثنوی کے معنوی ربط و ارتقا کے ضامن ہیں، اِس کا مطلب یہ ہے کہ جو اشعار کسی خیال کی محض توضیح یا تکرار کرتے ہیں، اُن کو خارج کیا گیا ہے، تکرار و توضیح کا غیر پسندیدہ انداز کم و بیش تمام اصناف میں موجود ہے، انتخاب میں اِس سے دامن بچانے کی کوشش کی گئی ہے، ہوسکتا ہے کہ اشعار اور بندوں پر نشان لگاتے ہوئے بعض عمدہ چیزیں نظر انداز ہوگئی ہوں تاہم جو اشعار و اصناف شامل انتخاب کی گئی ہیں وہ میر کے ایک بھرپور نمائندہ اور جامع انتخاب پر دلالت کرتی ہیں۔

کلامِ میر کا انتخاب کرتے ہوئے راقم نے غزلیات میں سے اُن اشعار کا انتخاب کیا ہے جو تخلیقی عمل کے تقاضوں کو پورا کرتے ہیں یعنی جو میر کی داخلی شخصیت کا رمزیہ اظہار ہیں، ایسے اشعار زبان و بیان کے تخلیقی برتاؤ کے نتیجے میں تخئیلی صورت حال کو جنم دیتے ہیں، جو متعدد معنوی امکانات کے لیے راہ ہموار کرتی ہے پس جو شعر لفظ و پیکر کی کسی خوبی یا حسن کی بنا پر اپنے پورے لسانی وجود کو جمالیاتی بناتا ہے اور تجربے کو تحرک، تنوع اور رخشندگی سے آشنا کرتا ہے وہ شاملِ انتخاب کیا گیا ہے کوئی شعر، جو موضوع کے لحاظ سے کتنا ہی وقیع کیوں نہ ہو، اگر شعری تجربے میں منتقل نہیں ہو پاتا، نظر انداز کیا گیا ہے، ایسے اشعار کلام منظوم کی پست سطح سے اوپر نہیں اُٹھتے، جہاں تک دیگر اصناف کے طریقۂ انتخاب کا تعلق ہے اُس کی رُو سے مثنوی، مسدس مخمس وغیرہ میں اُن ہی اشعار اور بندوں کو لیا گیا ہے جو :-

۱۔ زبان کے محاسن سے آراستہ ہیں.

۲۔ انداز بیان کی کسی خوبی کے حامل ہیں اور

اور یک رخی نظر آتے ہیں لیکن جن پر تھوڑی سی توجہ کرنے سے اُن کی پہلو داری دکھنے لگتی ہے، یہاں تک "رقصِ دود و شرر" کا طلسمی منظر نامہ وجود میں آنے لگتا ہے اس کا مطلب یہ ہے کہ میرؔ کسی نہ کسی فنی معجزہ کاری، مثلاً شعری کردار کے عمل، ردِّ عمل یا لہجے کے اُتار چڑھاؤ یا تخاطب، خود کلامی، مکالمہ، ہمکلامی، طنز، استہزا، احتجاج، استفہام یا لسانی جدت کاری، پیکریت یا علامت نگاری وغیرہ سے کام لے کر شعر کو نثری سطح سے بلند کر کے اس کی لسانی ساخت میں نمود کرنے والے نادیدہ تخئیلی تجربے کے لیے راستہ ہموار کرتا ہے۔ چنانچہ جہاں تک غزلیات کا تعلق ہے، پیشِ نظر انتخاب میں سینکڑوں نئے اشعار شامل کیے گئے ہیں جو میرؔ کی تخلیقی شخصیت کی کثیر الجہتی کو آشکار کرتے ہیں۔ جمیل جالبی نے درست لکھا ہے "میرؔ کو جب پڑھیے وہ ایک نئی شان سے ہمارے سامنے آتا ہے اور شاید اسی "ہر آن نئی شان" کی وجہ سے اُنھیں خدائے سخن کہا جاتا ہے۔"

میرؔ کی شاعری لامحدود امکانات سے معمور ہے۔ تازہ مطالعے کے دوران مجھے بار بار احساس ہوا کہ میرؔ کی تخئیلی کائنات رنگا رنگ جلوؤں سے آباد ہے جس طرح کوہ سبز، جو وادیٔ کشمیر کے مشرق میں واقع ہے اور جس کی آغوش میں میرا گھر ہے، سے کوہساروں سے گھری وادی، جو جھیل کے کناروں پر آباد ہے، صبح و شام، شب و روز، موسم بہ موسم، لمحہ بہ لمحہ بدلتے رنگوں کے نت نئے جادوئی منظر ناموں کو ترتیب دیتی ہے۔ اسی طرح میرؔ کے اشعار پل پل بدلتے رنگوں، روشنیوں اور سایوں کے انوکھے مناظر کی تخلیق کرتے ہیں، بالکل کیلیاڈسکوپ کی طرح، جو متنوع عکسی صورتیں دیکھنے کا آلہ ہے، ایک ایسا آلہ جو متغیر اور متناسب صورتوں کو رنگین شیشوں کے ٹکڑوں سے تخلیق کرتا ہے میرؔ کی شاعری بھی کیلیاڈسکوپی ہے یہ بار بار متغیر ہونے والے مناظر کو پیش کرتی ہے۔

جہاں تک دیگر اصنافِ سخن کے انتخاب کا تعلق ہے، یہ ضرور ہے کہ عبدالحق اور ناصر کاظمی نے ان کا انتخاب پیش کیا ہے تاہم عام طور پر دوسرے

اپنی آنکھوں دیکھے اور دیکھے ہی نہیں، ان کے تجربے سہے۔"

ظاہر ہے وہ پورے عہد کے آشوب کا سامنا کرتے رہے اور یہ آشوب اُن کی شخصیت کی عمیق گہرائیوں میں پیوست ہوگیا، چنانچہ ان کی شاعری اپنے دور کا آشوب نامہ بن گئی لیکن یہ غدر کے واقعات پر لکھے گئے شہر آشوبوں سے قطعی مختلف ہے، غدر کے شہر آشوب فوری نوعیت کے شخصی ردعمل کے اظہارات ہیں جبکہ میر کی شاعری دہلی کی ہمہ گیر تباہی کی شخصی بازیافت ہے۔

دراصل میر نے اپنی زندگی اور عہد کے انتشار ساماں اور بحرانی حالات وواقعات کے اثرات کو شعوری طور پر قبول کرکے ایک فوری نوعیت کے شخصی ردعمل کا اظہار نہ کیا، اگر وہ ایسا کرتے تو ان کی شاعری اپنے عصر کے حصاروں میں قید ہوجاتی اور تاریخ کا ایک حصہ بن کر رہ جاتی، میر نے ایسا نہ کیا، جن اشعار یا اصناف میں انھوں نے ایسا کیا ہے وہ ان کی شاعری کے کمزور حصّے ہیں، میر نے فوری نوعیت کے شعوری اثرات کے راست اظہار سے انحراف کیا، ان کی اعلیٰ پائے کی شاعری ذات کی سطح سے بلند ہوکر، زمان ومکاں کے حدود کو پھلانگ کر آفاقی ہوجاتی ہے، ان کی شاعری کی آفاقیت کا راز ان کے تخلیقی عمل میں مضمر ہے، وہ تخلیق شعر کے دوران اپنی شخصیت کے باطنی سرچشموں تک رسائی حاصل کرتے ہیں یعنی وہ محض ذہن وفکر پر شعوری ارتسامات ہی پر تکیہ نہیں کرتے بلکہ لاشعوری اور اجتماعی تجربوں، جو نسل بعد نسل منتقل ہوتے ہیں، تک رسائی حاصل کرتے ہیں اس طرح سے وہ شعوری اور لاشعوری تجربات کے مکمل انضمام سے اپنے شعری تجربوں کی تشکیل کرتے ہیں، یہ تجربے ان کی شخصی اور اجتماعی زندگی کے اندوہ ونشاط کے تجربوں پر بھی حاوی ہوجاتے ہیں اور انسان کے ازلی تجربوں سے بھی منسلک ہوتے ہیں اور آفاقی کردار حاصل کرتے ہیں۔ ؎

جانے کا نہیں شور سخن کا مرے ہرگز
تاحشر جہاں میں مرا دیوان رہے گا — میر

حامدی کاشمیری

کوہ سبز، شالیمار
سری نگر

جو پلٹا تو واقعات کو کہیں سے کہیں لے پہنچا، صفدر جنگ کا انتقال ہوا......"

میرا بھی پارہ پارہ شخصیت کے ساتھ جب آصف الدولہ کی خواہش پر لکھنؤ پہنچے تو وہاں کی نمائشی تہذیب کی چمک دمک اُن کی آنکھوں کو خیرہ نہ کر سکی۔

میر کا عہد آشوب و انتشار کا عہد تھا، اس عہد میں لوگوں کو ملکی اور سیاسی سطحوں پر جن کٹھنائیوں، مصائب اور تباہیوں کا سامنا تھا، میر اُن سے چشم پوشی نہیں کر سکتے تھے، یہ صحیح ہے کہ وہ عہد طفولیت ہی سے متصوفانہ ماحول میں پلے بڑھے تھے اور قلندری، توکل، خودشناسی اور غم پسندی اُن کی فطرت ثانیہ بن چکی تھی تاہم وہ داخلیت پسندی کے اس حاوی رجحان کے باوجود خارجی حالات کے تغیرات سے بیگانہ نہیں رہ سکتے تھے۔ مولوی عبدالحق لکھتے ہیں:-

"اس وقت کی دلّی، تاریخ میں خاص حیثیت رکھتی ہے، وہ ہندستان کی جان اور سلطنت مغلیہ کی راجدھانی تھی، مگر ہر طرف سے آفات کا نشانہ تھی، اس کی حالت اس عورت کی سی تھی جو بیوہ تو تھی پر بیواؤں سے کہیں زیادہ دکھیاری تھی، اوالعزم تیمور بابر کی اولاد اُن کے مشہور آفاق تخت پر بے جان تصویر کی طرح دھری تھی، اقبال جواب دے چکا تھا، ادبار و انحطاط کے ساماں ہو چکے تھے اور سیاہ روز زوال گرد و پیش منڈلا رہا تھا، بادشاہ دست نگر اور امیر الامرا مضمحل و پریشان تھے، سب سے اول نادر شاہ کا حملہ ہوا حملہ کیا تھا خدا کا قہر تھا، نادر کی بے پناہ تلوار اور اس کے سپاہیوں کی ہوسناک غارتگری نے دلّی کو نوچ کھسوٹ کے ویران و برباد کر دیا، ابھی یہ کچھ سنبھلنے نہ پائی تھی کہ چند سال بعد احمد شاہ درانی کی چڑھائی ہوئی پھر مرہٹوں، جاٹوں، روہیلوں نے وہ اودھم مچائی کہ رہی سہی بات بھی جاتی رہی۔ غرض ہر طرف خود غرضی، خانہ جنگی، طوائف الملوکی اور ابتری کا منظر نظر آتا ہے۔ یہ حالات میر نے

غزلیات

بِسۡمِ اللّٰهِ الرَّحۡمٰنِ الرَّحِيۡمِ

دیوان اوّل

۱

تھا مستعار حسن سے اس کے جو نور تھا — خورشید میں بھی اُس ہی کا ذرّہ ظہور تھا
ہنگامہ گرم کن جو دل ناصبور تھا — پیدا ہر ایک نالے سے شور نشور تھا
پہنچا جو آپ کو تو میں پہنچا خدا کے تئیں — معلوم اب ہوا کہ بہت میں بھی دور تھا
آتش بلند دل کی نہ تھی ورنہ اے کلیم — یک شعلہ برقِ خرمنِ صد کوہِ طور تھا
مجلس میں رات ایک ترے پرتوے بغیر — کیا شمع کیا پتنگ ہر اک بے حضور تھا
منعم کے پاس قاقم و سنجاب تھا تو کیا — اُس رِند کی بھی رات کٹی جو کہ طور تھا
ہم خاک میں ملے تو ملے لیکن اے سپہر — اُس شوخ کو بھی راہ پر لانا ضرور تھا
کل پاؤں ایک کاسۂ سر پر جو آگیا — ق — یک سر وہ استخوانِ شکستوں سے چور تھا
کہنے لگا کہ دیکھ کے چل راہ بے خبر — میں بھی کبھو کسو کا سرِ پُر غرور تھا

تھا وہ تو رشکِ حُورِ بہشتی ہمیں میں میر
سمجھے نہ ہم تو فہم کا اپنی قصور تھا

۴

جامۂ مستیٔ عشق اپنا مگر کم گھیر تھا
دامنِ ترکا مرے دریا ہی کا سا پھیر تھا

بلبلوں نے کیا گل افشاں میرؔ کا مرقد کیا
دور سے آیا نظر تو پھولوں کا اک ڈھیر تھا

۵

اس عہد میں الٰہی محبت کو کیا ہوا
چھوڑا وفا کو ان نے مروّت کو کیا ہوا

اُمّیدوارِ وعدۂ دیدار مر چلے
آتے ہی آتے یارو قیامت کو کیا ہوا

کب تک تظلّم آہ بھلا مرگ کے تئیں
کچھ پیش آیا واقعۂ رحمت کو کیا ہوا

اس کے گئے پر ایسے گئے دل سے ہم نشیں
معلوم بھی نہ ہوا کہ طاقت کو کیا ہوا

بخشش نے مجھ کو ابرِ کرم کی کیا خجل
اے چشمِ جوشِ اشکِ ندامت کو کیا ہوا

جاتا ہے یار تیغ بکف غیر کی طرف
اے کشتۂ ستم تری غیرت کو کیا ہوا

تھی صعب عاشقی کی بدایت ہی میرؔ پر
کیا جانیے کہ حالِ نہایت کو کیا ہوا

۶

شب ہجر میں کم تظلّم کیا
کہ ہمسائیگاں پر ترحّم کیا

کہا میں نے کتنا ہے گل کا ثبات؟
کلی نے یہ سن کر تبسّم کیا

زمانے نے مجھ جرعہ کش کو ندان
کیا خاک وحشت سرِ خم کیا

جگر ہی میں یک قطرہ خوں ہے سرشک
پلک تک گیا تو تلاطم کیا

کسو وقت پاتے نہیں گھر اسے
بہت میرؔ نے آپ کو گم کیا

۷

اُلٹی ہو گئیں سب تدبیریں کچھ نہ دوا نے کام کیا
دیکھا اِس بیماریٔ دل نے آخر کام تمام کیا

۲

کیا میں بھی پریشانئ خاطر سے قریں تھا
آنکھیں تو کہیں تھیں دلِ غم دیدہ کہیں تھا

کس رات نظر کی ہے سوئے چشمکِ انجم
آنکھوں کے تلے اپنے تو وہ ماہِ جبیں تھا

آیا تو سہی وہ کوئی دم کے لیے لیکن
ہونٹھوں پہ مرے جب نفسِ بازپسیں تھا

اب کوفت سے ہجراں کی جہاں تن پہ رکھا ہاتھ
جو درد و الم تھا، سو کہے تو، کہ وہیں تھا

جانا نہیں کچھ، جز غزل آکر کے جہاں میں
کل میرے تصرّف میں یہی قطعہ زمیں تھا

نام آج کوئی یاں نہیں لیتا ہے انھوں کا
جن لوگوں کے کل ملک یہ سب زیرِ نگیں تھا

مسجد میں امام آج ہوا آکے وہاں سے
کل تک تو یہی میر خرابات نشیں تھا

۳

نکلے ہے چشمہ جو کوئی جوش زناں پانی کا
یاد دِہ ہے وہ کسو چشم کی گریانی کا

لطف اگر یہ ہے بتاں صندلِ پیشانی کا
حسن کیا ہے صبح کے پھر چہرۂ نورانی کا

کفر کچھ چاہیے اسلام کی رونق کے لیے
حسن زنّار ہے تسبیح سلیمانی کا

درہمی حال کی ہے سارے مرے دیوان میں
سیر کر تو بھی یہ مجموعہ پریشانی کا

جان گھبراتی ہے اندوہ سے تن میں کیا کیا
تنگ احوال ہے اس یوسف زندانی کا

کھیل لڑکوں کا سمجھتے تھے محبت کے تئیں
ہے بڑا حیف ہمیں اپنی بھی نادانی کا

وہ بھی جانے کہ لہو رو کے لکھا ہے مکتوب
ہم نے سرنامہ کیا کاغذِ افشانی کا

اُس کا منہ دیکھ رہا ہوں سو وہی دیکھوں ہوں
نقش کا سا ہے سماں میری بھی حیرانی کا

بُت پرستی کو تو اسلام نہیں کہتے ہیں
معتقد کون ہے میر ایسی مسلمانی کا

۸

چمن میں گُل نے کل جو دعویٔ جمال کیا — جمالِ یار نے منھ اس کا خوب لال کیا
فلک نے آہ تری رہ میں ہم کو پیدا کر — برنگِ سبزۂ نورستہ پائمال کیا
رہی تھی دم کی کشاکش گلے میں کچھ باقی — سو اس کی تیغ نے جھگڑا ہی انفصال کیا
مری اب آنکھیں نہیں کھلتیں ضعف سے ہمدم — نہ کہہ کہ نیند میں ہے تو یہ کیا خیال کیا
بہارِ رفتہ پھر آئی ترے تماشے کو — چمن کو یُمنِ قدم نے ترے نہال کیا

جواب نامہ سیاہی کا اپنی ہے وہ زلف
کسو نے حشر کو ہم سے اگر سوال کیا

۹

دیکھے گا جو تجھ رُو کو سو حیران رہے گا — وابستہ ترے مو کا پریشان رہے گا
وعدہ تو کیا اس سے دمِ صبح کا لیکن — اُس دم تئیں مجھ میں بھی اگر جان رہے گا
منعم نے بنا ظلم کی رکھ گھر تو بنایا — پر آپ کوئی رات ہی مہمان رہے گا
چھوٹوں کہیں ایذا سے، لگا ایک ہی جلّاد — تا حشر مرے سر پہ یہ احسان رہے گا
چلتے رہیں گے دشتِ محبّت میں سرِ تیغ — محشر تئیں خالی نہ یہ میدان رہے گا
جانے کا نہیں شورِ سخن کا مرے ہرگز — تا حشر جہاں میں مرا دیوان رہے گا

دل دینے کی ایسی حرکت ان نے نہیں کی
جب تک جیے گا میر پشیمان رہے گا

۱۰

تا گور کے اوپر وہ گُلِ اندام نہ آیا — ہم خاک کے آسودوں کو آرام نہ آیا
بے ہوشِ مئے عشق ہوں کیا میرا بھروسا — آیا جو بخود صبح تو میں شام نہ آیا
کس دل سے ترا تیرِ نگہ پار نہ گزرا — کس جان کو یہ مرگ کا پیغام نہ آیا

عہدِ جوانی رو رو کاٹا پیری میں لیں آنکھیں موند
یعنی رات بہت تھے جاگے صبح ہوئی آرام کیا

حرف نہیں جاں بخشی میں اس کی خوبی اپنی قسمت کی
ہم سے جو پہلے کہہ بھیجا سو مرنے کا پیغام کیا

ناحق ہم مجبوروں پر یہ تہمت ہے مختاری کی
چاہتے ہیں سو آپ کریں ہیں ہم کو عبث بدنام کیا

سرزد ہم سے بے ادبی تو وحشت میں بھی کم ہی ہوئی
کوسوں اُس کی اور گئے پر سجدہ ہر ہر گام کیا

کس کا کعبہ، کیسا قبلہ، کون حرم ہے، کیا احرام
کوچے کے اُس کے باشندوں نے سب کو یہیں سے سلام کیا

شیخ جو ہے مسجد میں ننگا، رات کو تھا میخانے میں
جُبّہ، خرقہ، کُرتا، ٹوپی، مستی میں انعام کیا

کاش اب بُرقع منہ سے اُٹھا دے، ورنہ پھر کیا حاصل ہے
آنکھ مُندے پر اُن نے گو دیدار کو اپنے عام کیا

یاں کے سپید و سیہ میں ہم کو دخل جو ہے سو اتنا ہے
رات کو رو رو صبح کیا، یا دن کو جوں توں شام کیا

صبح چمن میں اس کو کہیں تکلیفِ ہوا لے آئی تھی
رُخ سے گُل کو مول لیا، قامت سے سرو غلام کیا

ساعدِ سیمیں دونوں اس کے ہاتھ میں لا کر چھوڑ دیے
بھولے اس کے قول و قسم پر ہائے خیالِ خام کیا

ایسے آہوے رم خوردہ کی وحشت کھونی مشکل تھی
سحر کیا، اعجاز کیا، جن لوگوں نے تجھ کو رام کیا

میرؔ کے دین و مذہب کو اب پوچھتے کیا ہو اُن نے تو
قشقہ کھینچا، دَیر میں بیٹھا، کب کا ترک اسلام کیا

تاب کس کو جو حالِ میر سنے
حال ہی اور کچھ ہے مجلس کا

۱۳

وہ اک روش سے کھولے ہوئے بال ہو گیا سنبل چمن کا مفت میں پامال ہو گیا
کیا امتدادِ مدتِ ہجراں بیاں کروں ساعت ہوئی قیامت و مہ سال ہو گیا
دعویٰ کیا تھا گل نے ترے رخ سے باغ میں سیلی لگی صبا کی سو منہ لال ہو گیا
قامت خمیدہ، رنگ شکستہ، بدن نزار
تیرا تو میر غم میں عجب حال ہو گیا

۱۴

پودا ستم کا جس نے اِس باغ میں لگایا اپنے کیے کا ثمرہ ان نے شتاب دیکھا
دل کا نہیں ٹھکانا بابت جگر کی کم ہے تیرے بلاکشوں کا ہم نے حساب دیکھا
آباد جس میں تجھ کو دیکھا تھا ایک مدت اس دل کی مملکت کو اب ہم خراب دیکھا
لیتے ہی نام اس کا سوتے سے چونک اُٹھے ہو
ہے خیر میر صاحب کچھ تم نے خواب دیکھا

۱۵

دل بہم پہنچا بدن میں تب سے سارا تن جلا
آ پڑی یہ ایسی چنگاری کہ پیراہن جلا
سرکشی ہی ہے جو دکھلاتی ہے اس مجلس میں داغ
ہو سکے تو شمع ساں دیجے رگِ گردن جلا
بدرساں اب آخر آخر چھا گئی مجھ پر یہ آگ
بیٹھے بیٹھے در پہ تیرے تو مرا آسن جلا

دیکھا نہ اُسے دُور سے بھی منتظروں نے — وہ رشکِ مہِ عید لبِ بام نہ آیا

اب کے جو ترے کوچے سے جاؤں گا تو سنیو
پھر جیتے جی اس راہ وہ بدنام نہ آیا

۱۱

جس سر کو غرور آج ہے یاں تاج وری کا — کل اس پہ یہیں شور ہے پھر نوحہ گری کا
آفاق کی منزل سے گیا کون سلامت — اسباب لٹا راہ میں یاں ہر سفری کا
زنداں میں بھی شورش نہ گئی اپنے جنوں کی — اب سنگ مداوا ہے اس آشفتہ سری کا
ہر زخمِ جگر داورِ محشر سے ہمارا — انصاف طلب ہے تری بیدادگری کا
اپنی تو جہاں آنکھ لڑی پھر وہیں دیکھو — آئینے کو لپکا ہے پریشاں نظری کا
صد موسمِ گل ہم کو تہِ بال ہی گزرے — مقدور نہ دیکھا کبھو بے بال و پری کا
اس رنگ سے جھمکے ہے پلک پر کہ کہے تو — ٹکڑا ہے مرا اشک عقیقِ جگری کا
کل سیر کیا ہم نے سمندر کو بھی جا کر — تھا دستِ نگر پنجۂ مژگاں کی تری کا
لے سانس بھی آہستہ کہ نازک ہے بہت کام — آفاق کی اس کارگہِ شیشہ گری کا

ٹک میرِ جگر سوختہ کی جلد خبر لے
کیا یار بھروسا ہے چراغِ سحری کا

۱۲

منہ تکا ہی کرے ہے جس تس کا — حیرتی ہے یہ آئینہ کس کا
شام سے کچھ بجھا سا رہتا ہے — دل ہوا ہے چراغ مفلس کا
تھے بُرے مغبچوں کے تیور لیک — شیخ مے خانے سے بھلا کھسکا
داغ آنکھوں سے کھل رہے ہیں سب — ہاتھ دستہ ہوا ہے نرگس کا
فیض اے ابر چشمِ تر سے اٹھا — آج دامن وسیع ہے اس کا
بحر کم ظرف ہے بسانِ حباب — کاسہ لیس اب ہوا ہے تو جس کا

شہر میں جو نظر پڑا اس کا
کشتۂ نازیا تغافل تھا

اب تو دل کو نہ تاب ہے نہ قرار
یادِ ایّام جب تحمّل تھا

یوں گئی قد کے خم ہوئے جیسے
عمر اک رہروِ سرِ پل تھا

خوب دریافت جو کیا ہم نے
وقتِ خوش میرؔ نکہتِ گل تھا

۱۸

آگے جمالِ یار کے معذور ہو گیا
گُل اک چمن میں دیدۂ بے نور ہو گیا

اک چشم منتظر ہے کہ دیکھے ہے کب سے راہ
جوں زخم تیری دوری میں ناسور ہو گیا

دیکھا یہ ناؤ نوش کہ نیشِ فراق سے
سینہ تمام خانۂ زنبور ہو گیا

اس ماہِ چاردہ کا چھپے عشق کیوں کہ آہ
اب تو تمام شہر میں مشہور ہو گیا

۱۹

فرہاد ہاتھ تیشے پہ ٹک رہ کے ڈالتا
پتّھر تلے کا ہاتھ ہی اپنا نکالتا

چھاتی ایک بار لگاتا جو وہ تو میرؔ
برسوں یہ زخم سینے کا ہم کو نہ سالتا

۲۰

گُل شرم سے بہہ جائے گا گلشن میں ہو کر آب سا
بُرقع سے گر نکلا کہیں چہرہ ترا مہتاب سا

گُل برگ کا یہ رنگ ہے مرجاں کا ایسا ڈھنگ ہے
دیکھو نہ جھمکے ہے پڑا وہ ہونٹھ لعلِ ناب سا

دل تاب ہی لایا نہ ٹک، تا یاد رہتا ہم نشیں
اب عیش روزِ وصل کا ہے جی میں بھولا خواب سا

سناہٹے میں جان کے ہوش و حواس و دم نہ تھا
اسباب سارا لے گیا آیا تھا اک سیلاب سا

تھی عشق کی وہ ابتدا جو موج سی اٹھی کبھو
اب دیدۂ تر کو جو تم دیکھو تو ہے گرداب سا

کب تلک دھونی لگائے جوگیوں کی سی رہوں
ورنہ پہلے تھا مرا جوں ماہِ نو دامن جلا
گرمی اس آتش کے پرکالے سے رکھے چشم تب
جب کوئی میری طرح سے دیوے سب تن من جلا
ہو جو منّت سے تو کیا وہ شب نشینی باغ کی
کاٹ اپنی رات کو خار و خس گلخن جلا
سوکھتے ہی آنسوؤں کے نورِ آنکھوں کا گیا
بجھ ہی جاتے ہیں دیے جس وقت سب روغن جلا
شعلہ افشانی نہیں یہ کچھ نئی اس آہ سے
دوں لگی ہے ایسی ایسی بھی کہ سارا بن جلا
آگ سی اک دل میں سلگے ہے کبھو بھڑکی تو میرؔ
دے گی میری ہڈیوں کا ڈھیر جوں ایندھن جلا

۱۶

حال دل میرؔ کا رو رو کے سب اے ماہ سنا
شب کو القصہ عجب قصۂ جاں کاہ سنا
نابلد ہو کے رہِ عشق میں پہنچوں تو کہیں
ہمرہ خضر کو یاں کہتے ہیں گمراہ سنا
کوئی ان طوروں سے گزرے ہے ترے غم میں مری
گاہ تو نے نہ سنا حال مرا گاہ سنا
خوابِ غفلت میں ہیں یاں سب تو عبث جاگا میرؔ
بے خبر دیکھا انھیں میں جنھیں آگاہ سنا

۱۷

جب جنوں سے ہمیں توسّل تھا
اپنی زنجیرِ پا ہی کا غل تھا
بسترا تھا چمن میں جوں بلبل
نالہ، سرمایہ توکّل تھا
یک نگہ کو وفا نہ کی گویا
موسمِ گل سفیرِ بلبل تھا
اُن نے پہچان کر ہمیں مارا
منھ نہ کرنا اِدھر تجاہل تھا

۲۴

اُس گل زمیں سے اب تک اُگتے ہیں سرو جس جا
مستی میں جھکتے جس پر تیرا پڑا ہے سایا

یکساں ہے قتل گہہ اور اس کی گلی تو مجھ کو
واں خاک میں میں لوٹا یاں لوہو میں نہایا

پوجے سے اور پتھر ہوتے ہیں یہ صنم تو
اب کس طرح اطاعت اُن کی کروں خدایا

آخر کو مر گئے ہیں اس کی ہی جستجو میں
جی کے تئیں بھی کھویا لیکن اسے نہ پایا

ہونا تھا مجلس آرا گر غیر کا تجھے تو
مانندِ شمع مجھ کو کاہے کے تئیں جلایا

۲۵

شکوہ کروں میں کب تک اُس اپنے مہرباں کا
القصّہ رفتہ رفتہ دشمن ہوا ہے جاں کا

ہر صبح میرے سر پر اک حادثہ نیا ہے
پیوند ہو زمیں کا، شیوہ اس آسماں کا

گریے پہ رنگ آیا قیدِ قفس سے شاید
خوں ہو گیا جگر میں اب داغ گلستاں کا

جس دن کہ اس کے منہ سے برقع اٹھے گا سنیو
اُس روز سے جہاں میں خورشید پھر نہ جھانکا

دی آگ رنگِ گل نے واں اے صبا چمن کو
یاں ہم جلے قفس میں سن حال آشیاں کا

۲۶

ہمارے آگے ترا جب کسو نے نام لیا
دلِ ستم زدہ کو ہم نے تھام تھام لیا

خراب رہتے تھے مسجد کے آگے میخانے
نگاہِ مست نے ساقی کی انتقام لیا

مزا دکھا دیں گے بے رحمی کا تری صیاد
گر اضطرابِ اسیری نے زیرِ دام لیا

مرے سلیقے سے میری نبھی محبت میں
تمام عمر میں ناکامیوں سے کام لیا

اگرچہ گوشہ گزیں ہوں میں شاعروں میں میر
یہ میرے شور نے روئے زمیں تمام لیا

۲۱

مر رہتے جو یہ گل بن تو سارا یہ خلل جاتا — نکلا ہی نہ جی ورنہ کانٹا سا نکل جاتا
پیدا ہے کہ پنہاں تھی آتش نفسی میری — میں ضبط نہ کرتا تو سب شہر یہ جل جاتا
میں گریۂ خونیں کو روکے ہی رہا ورنہ — اک دم میں زمانے کا یاں رنگ بدل جاتا
بن پوچھے کرم سے وہ جو بخش نہ دیتا تو — پرسش میں ہماری ہی دن حشر کا ڈھل جاتا
وہ سیر کا وادی کے مائل نہ ہوا ورنہ — آنکھوں کو غزالوں کی پاؤں تلے مل جاتا
بے تاب و تواں یوں میں کاہے کو تلف ہوتا — یاقوتی ترے لب کی، ملتی تو سنبھل جاتا
اس سیم بدن کو تھی کب تابِ تعب اتنی
وہ چاندنی میں شب کی ہوتا تو پگھل جاتا

۲۲

سنیو جب وہ کبھو سوار ہوا — تا بہ روح الامیں شکار ہوا
اُس فریبندہ کو نہ سمجھے آہ — ہم نے جانا کہ ہم سے یار ہوا
نالہ ہم خاکساروں کا آخر — خاطرِ عرش کا غبار ہوا
مر چلے بے قرار ہو کر ہم — اب تو تیرے تئیں قرار ہوا
وہ جو خنجر بکف نظر آیا
میرؔ سو جان سے نثار ہوا

۲۳

مانند شمعِ مجلس شب اشکبار پایا — القصہ میرؔ کو ہم بے اختیار پایا
احوال خوش انھوں کا ہم بزم ہیں جو تیرے — افسوس ہے کہ ہم نے وہاں کا نہ بار پایا
شہر دل ایک مدت اُجڑا بسا غموں میں — آخر اُجاڑ دینا اس کا قرار پایا
آہوں کے شعلے جس جا اُٹھتے تھے میرؔ سے شب
وہاں جا کے صبح دیکھا مشتِ غبار پایا

کون سے یہ بحرِ خوبی کی پریشاں زلف ہے
آتی ہے آنکھوں میں میرے موجِ دریا آشنا

۳۱

گُل کو محبوب ہم قیاس کیا ۔۔۔ فرق نکلا بہت جو باس کیا
دل نے ہم کو مثالِ آئینہ ۔۔۔ ایک عالم کا روشناس کیا
کچھ نہیں سوجھتا ہمیں اُس بن ۔۔۔ شوق نے ہم کو بے حواس کیا
عشق میں ہم ہوئے نہ دیوانے ۔۔۔ قیس کی آبرو کا پاس کیا
صبح تک شمع سر کو دُھنتی رہی ۔۔۔ کیا پتنگے نے التماس کیا

ایسے وحشی کہاں ہیں اے خوباں
میرؔ کو تم عبث اداس کیا

۳۲

مفت آبروئے زاہدِ علّامہ لے گیا ۔۔۔ اک مُغ بچہ اُتار کے عمّامہ لے گیا
داغِ فراق و حسرتِ وصل آرزوئے شوق ۔۔۔ میں ساتھ زیرِ خاک بھی ہنگامہ لے گیا

۳۳

اے تو کہ یاں سے عاقبت کار جائے گا ۔۔۔ غافل نہ رہ کہ قافلہ اک بار جائے گا
چھوٹا جو میں قفس سے تو سب نے مجھے کہا ۔۔۔ بے چارہ کیوں کہ تا سرِ دیوار جائے گا
تدبیر میرے عشق کی کیا فائدہ طبیب ۔۔۔ اب جان ہی کے ساتھ یہ آزار جائے گا

آئے بن اس کے حال ہوا جائے ہے تغیّر
کیا حال ہوگا پاس سے جب یار جائے گا

۳۴

کیا کہوں کیسا ستم غفلت سے مجھ پر ہوگیا ۔۔۔ قافلہ جاتا رہا مجھ صبح ہوتے سوگیا

۲۷

سب کھلا باغِ جہاں الّا یہ حیران و خفا — جس کو دل سمجھے تھے ہم سو غنچہ تھا تصویر کا
بوئے خوں سے جی رکا جاتا ہے اے بادِ بہار — ہو گیا ہے چاک دل، شاید کسو دل گیر کا
رہ گزر سیلِ حوادث کا ہے بے بنیادِ دہر
اس خرابے میں نہ کرنا قصد تم تعمیر کا

۲۸

شب درد و غم سے عرصہ مرے جی پہ تنگ تھا — آیا شبِ فراق تھی یا روزِ جنگ تھا
دیکھا ہے صید گہ میں ترے صید کا جگر — باآنکہ چھن رہا تھا یہ ذوقِ خدنگ تھا
دل سے مرے لگا نہ ترا دل ہزار حیف
یہ شیشہ ایک عمر سے مشتاقِ سنگ تھا

۲۹

دل میں بھرا ز بسکہ خیالِ شراب تھا — مانند آئینے کے مرے گھر میں آب تھا
اُگتے تھے دستِ بلبل و دامانِ گل بہم — صحنِ چمن نمونۂ یوم الحساب تھا
ٹک دیکھ آنکھیں کھول کے اس دم کی حسرتیں — جس دم یہ سوجھے گی کہ یہ عالم بھی خواب تھا
دل جو نہ تھا تو رات ز خود رفتگی میں میرؔ
گہ انتظار و گاہ مجھے اضطراب تھا

۳۰

کیا طرح ہے آشنا گاہے، گہے نا آشنا — یا تو بیگانے ہی رہیے ہو جیے یا آشنا
پائمالِ صد جفا ناحق نہ ہو اے عندلیب — سبزۂ بیگانہ بھی تھا اس چمن کا آشنا
وہ گل و لالہ کہاں، سنبل سمن ہم نسترن — خاک سے یکساں ہوئے ہیں ہائے کیا کیا آشنا

آگے اے نالہ ہے خدا کا نانو بس تو ُنہ آسمان سے نکلا
چشم و دل سے جو نکلا ہجراں میں نہ کبھو بحر و کان سے نکلا
مر گیا جو اسیر قیدِ حیات تنگنائے جہان سے نکلا
نامرادی کی رسم میرؔ سے ہے
طور یہ اس جوان سے نکلا

۳۹

گرمی سے میں تو آتش غم کی پگھل گیا راتوں کو روتے روتے ہی جوں شمع گل گیا
ہم خستہ دل ہیں تجھ سے بھی نازک مزاج تر تیوری چڑھائی تونے کریاں جی نکل گیا
گرمیِٔ عشق معنیِٔ نشو ونما ہوئی میں وہ نہال تھا کہ اُگا اور جل گیا
مستی میں چھوڑ دیر کو کعبے چلا تھا میں لغزش بڑی ہوئی تھی ولیکن سنبھل گیا
ہر ذرہ خاک تیری گلی کی ہے بے قرار
یاں کون سا ستم زدہ ماٹی میں رَل گیا

۴۰

ہزار رنگ کھِلے گل چمن کے ہیں شاہد کہ روزگار کے سر خون ہے ہزاروں کا.
مِلا ہے خاک میں کس کس طرح کا عالم یاں نکل کے شہر سے ٹک سیر کو مزاروں کا
عرق فشانی سے اُس زلف کی ہراساں ہوں بھلا نہیں ہے بہت ٹوٹنا بھی تاروں کا
علاج کرتے ہیں سودائے عشق کا میرے خلل پذیر ہوا ہے دماغ یاروں کا
تڑپ کے خرمنِ گل پر کبھی گرانے بجلی جلانا کیا ہے مرے آشیاں کے خاروں کا
تمہیں تو زہد و ورع پر بہت ہے اپنے غرور خدا ہے شیخ جی، ہم بھی گناہ گاروں کا
اُٹھے ہے گرد کی جا نالہ گور سے اس کی
غبارِ میرؔ بھی عاشق ہے نے سواروں کا

بے بسی موت تلک برسا کی اپنی گور پر — جو ہماری خاک پر سے ہو کے گزرا رو گیا
کچھ خطرناکی طریق عشق میں پنہاں نہیں — کھپ گیا وہ راہرو اس راہ ہو کر جو گیا
مدعا جو ہے سو وہ پایا نہیں جاتا کہیں — ایک عالم جستجو میں جی کو اپنے کھو گیا
میرؔ ہر اک موج میں ہے زلف ہی کا سا دماغ
جب سے وہ دریا پہ آکر بال اپنے دھو گیا

۳۵

جو سنا ہشیار اُس میخانے میں تھا بے خبر — شوق ہی باقی رہا ہم کو دلِ آگاہ کا
شہر میں کس منھ سے آوے سامنے تیرے کہ شوخ — جھائیوں سے بھر رہا ہے سارا چہرہ ماہ کا

۳۶

آزار رنہ دے اپنے کانوں کے تئیں اے گل — آغاز مرے غم کا انجام نہیں رکھتا
یوں تو رہ و رسم اس کو اس شہر میں سب سے ہے — اک میرؔ ہی سے خط و پیغام نہیں رکھتا

۳۷

خوبی کا اس کی بس کہ طلب گار ہو گیا — گل باغ میں گلے کا مرے ہار ہو گیا
میں تو رمیدہ بال چمن زاد طیر تھا — پر گھر سے اٹھ چلا سو گرفتار ہو گیا
تو وہ متاع ہے کہ پڑی جس کی تجھ پہ آنکھ — وہ جی کو بیچ کر بھی خریدار ہو گیا
ہے اس کے حرف زیر لبی میں سبھوں کا ذکر — کیا بات تھی کہ جس کا یہ بستار ہو گیا
کب رو ہے اس سے بات کے کرنے کا مجھ کو میرؔ
ناکردہ جرم، میں تو گنہ گار ہو گیا

۳۸

نکلی تھی تیغ بے دریغ اس کی — میں ہی اک امتحاں سے نکلا
گو کٹے سر، کہ سوز دل جوں شمع — اب تو میری زباں سے نکلا

آبلے کا بھی ہونا دامن گیر تیرے کوچے کے خار میں دیکھا

جن بلاؤں کو میر سنتے تھے
اُن کو اس روزگار میں دیکھا

۴۵

کئی دن سلوک وداع کا، مرے درپئے دلِ زار تھا
کبھو درد تھا، کبھو داغ تھا، کبھو زخم تھا، کبھو وار تھا

دمِ صبح بزمِ خوشِ جہاں، شب غم سے کم نہ تھی مہرباں
کہ چراغ تھا سو تو دود تھا، جو پتنگ تھا سو غبار تھا

دلِ خستہ جو لہو ہو گیا، تو بھلا ہوا کہ کہاں تلک
کبھو سوز سینہ سے داغ تھا، کبھو درد و غم سے فگار تھا

دلِ مضطرب سے گزر گئی، شب وصل اپنی ہی فکر میں
نہ دماغ تھا نہ فراغ تھا، نہ شکیب تھا نہ قرار تھا

یہ تمہاری ان دنوں دوستاں، مژہ جس کے غم میں ہے خونچکاں
وہی آفتِ دلِ عاشقاں، کسو وقت ہم سے بھی یار تھا

کبھو جائے گی جو اُدھر صبا، تو یہ کہیو اُس سے کہ بے وفا
مگر ایک میرِ شکستہ پا، ترے باغِ تازہ میں خار تھا

۴۶

مہر کی تجھ سے توقع تھی ستم گر نکلا موم سمجھے تھے ترے دل کو سو پتھر نکلا

داغ ہوں رشکِ محبت سے کہ اتنا بیتاب کس کی تسکین کے لیے گھر سے تو باہر نکلا

دل کی آبادی کی اس حد ہے خرابی کہ نہ پوچھ جانا جاتا ہے کہ اس راہ سے لشکر نکلا

اشکِ تر، قطرۂ خوں، لختِ جگر، پارۂ دل ایک سے ایک عدو آنکھ سے بہہ کر نکلا

کنج کاوی جو کی سینے کی غمِ ہجراں نے اس دفینے میں سے اقسام جواہر نکلا

ہم نے جانا تھا لکھے گا تو کوئی حرف اے میر
پر ترا نامہ تو اک شوق کا دفتر نکلا

۴۱

آنکھیں کنک سے اس کی لگا کر خاک برابر ہم بھی ہوئے
مہندی کے رنگ ان پاؤں نے تو بہتوں کو پامال کیا

یوں نکلے ہے فلک اِدھر سے ناز کناں جو جاتے تو
خاک سے سبزہ میری اُگا کر اُن نے مجھ کو نہال کیا

۴۲

صد خانماں خراب ہیں ہر ہر قدم پہ دفن
کشتہ ہوں یار میں تو ترے گھر کی راہ کا

یک قطرہ خون ہو کے پلک سے ٹپک پڑا
قصہ یہ کچھ ہوا دلِ غفران پناہ کا

ظالم زمیں سے لوٹتا دامن اُٹھا کے چل
ہوگا کمیں میں ہاتھ کسو، دادخواہ کا

اے تاج شہ نہ سر کو فرو لاؤں تیرے پاس
ہے معتقد فقیر نمد کی کلاہ کا

۴۳

دل سے شوقِ رخِ نکو نہ گیا
جھانکنا تاکنا کبھو، نہ گیا

ہر قدم پر تھی اس کی منزل لیک
سر سے سودائے جستجو، نہ گیا

سب گئے ہوش و صبر و تاب و تواں
لیکن اے داغ دل سے تو نہ گیا

دل میں کتنے مسودے تھے ولے
ایک پیش اس کے روبرو نہ گیا

سبحہ گرداں ہی میرؔ ہم تو رہے
دستِ کوتاہ تا سبو نہ گیا

۴۴

گل و بلبل بہار میں دیکھا
ایک تجھ کو ہزار میں دیکھا

جل گیا دل سفید ہیں آنکھیں
یہ تو کچھ انتظار میں دیکھا

تیرہ عالم ہوا یہ روزِ سیاہ
اپنے دل کے غبار میں دیکھا

۵۰

وہ فکر کر کہ چاک جگر پاوے التیام   ناصح جو تو نے جامہ سلایا تو کیا ہوا
جیتے تو میر اُن نے مجھے داغ ہی رکھا   پھر گور پر چراغ جلایا تو کیا ہوا

۵۱

طائرِ رنگِ حنا کی سی طرح   دل نہ اس کے ہاتھ سے چھوٹا گیا
میں نہ کہتا تھا کہ منہ کر دل کی اور   اب کہاں وہ آئینہ ٹوٹا گیا
دل کی ویرانی کا کیا مذکور ہے   یہ نگر سو مرتبہ لوٹا گیا

میر کس کو اب دماغِ گفتگو
عمر گذری ریختہ چھوٹا گیا

۵۲

اتنی گذری جو ترے ہجر میں سو اس کے سبب   صبر مرحوم عجب مونسِ تنہائی تھا
ترے جلوے کا مگر رو تھا سحر گلشن میں   نرگس اک دیدۂ حیرانِ تماشائی تھا

۵۳

اے دوست کوئی مجھ سا رسوا نہ ہوا ہوگا   دشمن کے بھی دشمن پر ایسا نہ ہوا ہوگا
ٹک گورِ غریباں کی کر سیر کہ دنیا میں   ان ظلم رسیدوں پر کیا کیا نہ ہوا ہوگا
ہے قاعدۂ کلی یہ کوئے محبت میں   دل گم جو ہوا ہوگا پیدا نہ ہوا ہوگا
اس کہنہ خرابے میں آبادی نہ کر منعم   یک شہر نہیں یاں جو صحرا نہ ہوا ہوگا
آنکھوں سے تری ہم کو ہے چشم کہ اب ہووے   جو فتنہ کہ دنیا میں برپا نہ ہوا ہوگا

جُز مرتبۂ کل کو حاصل کرے ہے آخر
یک قطرہ نہ دیکھا جو دریا نہ ہوا ہوگا

۵۴

غیروں ہی کے ہاتھوں میں رہے دستِ نگاریں   کب ہم نے ترے ہاتھ سے آزار نہ پایا
جاتی ہے نظر خس پہ گہ چشم پریدن   یاں ہم نے پرِ کاہ بھی بے کار نہ پایا
تصویر کے مانند لگے در ہی سے گذری   مجلس میں تری ہم نے کبھو بار نہ پایا

۴۷

رہے خیال تنک ہم بھی روسیاہوں کا لگے ہو خون بہت کرنے بے گناہوں کا
نہیں ستارے یہ سوراخ پڑ گئے ہیں تمام فلک حریف ہوا تھا ہماری آہوں کا
تری جو آنکھیں ہیں تلوار کے تلے بھی ادھر
فریب خوردہ ہے تو میرؔ کن نگاہوں کا

۴۸

اس کا خرام دیکھ کے جایا نہ جائے گا اے کبک پھر بحال بھی آیا نہ جائے گا
ہم کشتگانِ عشق ہیں ابرو و چشم یار سر سے ہمارے تیغ کا سایا نہ جائے گا
ہم رہروانِ راہِ فنا ہیں برنگِ عمر جاویں گے ایسے کھوج بھی پایا نہ جائے گا
اب دیکھ لے کہ سینہ بھی تازہ ہوا ہے چاک پھر ہم سے اپنا حال دکھایا نہ جائے گا
ہم بے خودانِ محفل تصویر اب گئے آئندہ ہم سے آپ میں آیا نہ جائے گا
گو بیستوں کو ٹال دے آگے سے کوہکن سنگ گران عشق اُٹھایا نہ جائے گا
یاد اس کی اتنی خوب نہیں میرؔ باز آ
نادان پھر وہ جی سے بھلایا نہ جائے گا

۴۹

ایسا ترا رہ گزر نہ ہوگا ہر گام پہ جس میں سر نہ ہوگا
کیا اُن نے نشے میں مجھ کو مارا اِتنا بھی تو بے خبر نہ ہوگا
دھوکا ہے تمام بحر دنیا دیکھے گا کہ ہونٹ تر نہ ہوگا
دشمنوں سے کسی کا اتنا ظالم ٹکڑے ٹکڑے جگر نہ ہوگا
ہواس سے جہاں سیاہ تر بھی نالے میں مرے اثر نہ ہوگا
پھر نوحہ گری کہاں جہاں میں
ماتم زدہ میرؔ اگر نہ ہوگا

۵۹

ان صحبتوں میں آخر جانیں ہی جاتیاں ہیں
نے عشق کو ہے صرفہ نے حسن کو محابا

ہر چند ناتواں ہیں، پر آ گیا جو جی میں
دیں گے ملا زمیں سے تیرا فلک قلابا

وے دن گئے کہ آنکھیں دریا سی بہتیاں تھیں
سوکھا پڑا ہے اب تو مدت سے یہ دوآبا

اب شہر ہر طرف سے میدان ہو گیا ہے
پھیلا تھا اس طرح کا کاہے کو یاں خرابا

دل تفتگی کی اپنی، ہجراں میں شرح کیا دوں
چھاتی تو میر میری جل کر ہوئی ہے تابا

۶۰

دکھ اب فراق کا ہم سے سہا نہیں جاتا
پھر اس پہ ظلم یہ ہے کچھ کہا نہیں جاتا

ہوئی ہے اتنی ترے عکسِ زلف کی حیراں
کہ موجِ بحر سے مطلق بہا نہیں جاتا

نہیں گزرتی گھڑی کوئی مجھ خراب پہ آہ
کہ جس میں غم سے ترے جی ڈھا نہیں جاتا

ستم کچھ آج گلی میں تری نہیں مجھ پر
کب آ کے خون میں، میں یاں نہا نہیں جاتا

۶۱

تجھ بن شراب پی کے موئے سب ترے خراب
ساقی بغیر تیرے انھیں جام سم ہوا

آئے برنگِ ابرِ عرق ناک تم ادھر
حیران ہوں کہ آج کدھر کو کرم ہوا

تلوار کس کے خون میں سر ڈوب ہے تری
یہ کس اجل رسیدہ کے گھر پر ستم ہوا

آئی نظر جو گورِ سلیمان کی ایک روز
ق
کوچے پر اس مزار کے تھا یہ رقم ہوا

کاے سرکشانِ جہان میں کھینچا تھا میں بھی سر
پایانِ کار مور کی خاکِ قدم ہوا

اہلِ جہاں ہیں سارے ترے جیتے جی تلک
پوچھیں گے بھی نہ بات جہاں تو عدم ہوا

کیا کیا عزیز دوست ملے میر خاک میں
ناداں یاں کسو کا کسو کو بھی غم ہوا

سوراخ ہے سینے میں ہر ایک شخص کے تجھ سے　　کس دل کے ترا تیرِ نگہ پار نہ پایا

وہ کھینچ کے شمشیرِ ستم رہ گیا جو میرؔ
خوں ریزی کا یاں کوئی سزاوار نہ پایا

۵۵

لے گیا صبح کے نزدیک مجھے خواب اڑائے　　آنکھ اُس وقت کُھلی قافلہ جب دور گیا
گور سے نالے نہیں اٹھتے تو نے اگتی ہے　　جی گیا پر نہ ہمارا سرِ پُر شور گیا
چشم خوں بستہ سے کل رات لہو پھر ٹپکا　　ہم نے جانا تھا کہ بس اب تو یہ ناسور گیا
لے کہیں منھ پہ نقاب اپنے کہ اے غیرتِ صبح　　شمع کے چہرۂ رخشاں سے تو اب نور گیا

نالۂ میرؔ نہیں رات سے سنتے ہم لوگ
کیا ترے کوچے سے اے شوخ وہ رنجور گیا

۵۶

اپنے ہی دل کو نہ ہو واشد تو کیا حاصل نسیم
گو چمن میں غنچۂ پژمردہ تجھ سے کھل گیا

۵۷

تا بہ مقدور انتظار کیا　　دل نے اب زور بے قرار کیا
یہ تو ہم کا کارخانہ ہے　　یاں وہی ہے جو اعتبار کیا
ایک ناوک نے اس کی مژگاں کے　　طائرِ سدرہ تک شکار کیا

ہم فقیروں سے بے ادائی کیا
آن بیٹھے جو تم نے پیار کیا

۵۸

شب تھا نالاں عزیز کوئی تھا　　مرغِ خوش خواں عزیز کوئی تھا
تھی تمہارے ستم کی تاب اس تک　　صبر، جویاں عزیز کوئی تھا

شب کو اس کا خیال تھا دل میں
گھر میں مہماں عزیز کوئی تھا

دل میں رہ دل میں، کہ معمارِ قضا سے اب تک ایسا مطبوع مکاں کوئی بنایا نہ گیا
کبھو عاشق کا ترے، جیبہ سے ناخن کا خراش خطِ تقدیر کے مانند مٹایا نہ گیا
کیا تنک حوصلہ تھے دیدہ و دل اپنے آہ ایک دم رازِ محبّت کا چھپایا نہ گیا
شہرِ دل آہ عجب جائے تھی پر اس کے گئے
ایسا اُجڑا کہ کسی طرح بسایا نہ گیا

۶۶

گل میں اس کی سی جو بو آئی تو آیا نہ گیا ہم کو بن دوش ہوا باغ سے لایا نہ گیا
خوفِ آشوب سے غوغائے قیامت کے لیے خونِ خوابیدۂ عشاق جگایا نہ گیا
آہ جو نکلی مرے منہ سے تو افلاک کے پاس
اس کے آشوب کے عہدے سے بر آیا نہ گیا

۶۷

ادھر آ کر شکار افگن ہمارا مشبّک کر گیا ہے تن ہمارا
گئے جوں شمع اس مجلس میں جتنے سبھوں پر حال ہے روشن ہمارا
ہوا رونے سے رازِ دوستی فاش ہمارا گریہ تھا دشمن ہمارا
چمن میں ہم بھی زنجیری رہے ہیں سُنا ہوگا کبھو شیون ہمارا
کیا تھا ریختہ پردہ سخن کا
سو ٹھہرا ہے یہی اب فن ہمارا

۶۸

گلیوں میں اب تلک تو مذکور ہے ہمارا افسانۂ محبت مشہور ہے ہمارا
مقصود کو تو دیکھیں کب تک پہنچتے ہیں ہم بالفعل اب ارادہ تاگور ہے ہمارا
کیا آرزو تھی جس سے سب چشم ہو گئے ہیں ہر زخم تن جگر سے ناسور ہے ہمارا
تا چند پشتِ پا پر شرم و حیا سے آنکھیں
احوال کچھ بھی تم کو منظور ہے ہمارا

۶۲

اگرچہ عمر کے دس دن پہ لب رہے خاموش — سخن رہے گا سدا میری کم زبانی کا
ہزار جان سے قربان بے پری کے ہیں — خیال بھی کبھو گذرا نہ پرفشانی کا

نمود کر کے وہیں بحرِ غم میں بیٹھ گیا
کہے تو میرؔ بھی اک بُلبُلا تھا پانی کا

۶۳

موا میں سجدے میں پر نقش میرا بار رہا — اُس آستاں پہ مری خاک سے غبار رہا
بشر ہے وہ یہ کھلا جب سے اس کا دام زلف — سرِ رہ اس کے فرشتے ہی کا شکار رہا
کبھو نہ آنکھوں میں آیا وہ شوخ خواب کی طرح — تمام عمر ہمیں اس کا انتظار رہا
بتاں کے عشق نے بے اختیار کر ڈالا — وہ دل کہ جس کا خدائی میں اختیار رہا
بہا تو خون ہو آنکھوں کی راہ بہہ نکلا — رہا جو سینۂ سوزاں میں داغ دار رہا
سو اس کو ہم سے فراموش کاریوں لے گئے — کہ اس سے قطرۂ خوں بھی نہ یادگار رہا

گلی میں اس کی گیا، سو گیا، نہ بولا پھر
میں میرؔ میرؔ کر اس کو بہت پکار کیا

۶۴

جیتے جی کوچۂ دلدار سے جایا نہ گیا — اس کی دیوار کا سر سے مرے سایا نہ گیا
وہ تو کل دیر تلک دیکھتا ایدھر کو رہا — ہم سے ہی حال بتاں اپنا دکھایا نہ گیا
گرم رو راہِ فنا کا نہیں ہو سکتا پتنگ — اس سے تو شمع نمط سر بھی کٹایا نہ گیا
خاک تک کوچۂ دلدار کی چھانی ہم نے — جستجو کی پہ دل گم شدہ پایا نہ گیا
مہ نے آ سامنے شب یاد دلایا تھا اسے — پھر وہ تا صبح مرے جی سے بھلایا نہ گیا

زیرِ شمشیرِ ستم میرؔ تڑپنا کیسا
سر بھی تسلیم محبت میں ہلایا نہ گیا

۶۵

دل کے تئیں آتشِ ہجراں سے بچایا نہ گیا — گھر جلا سامنے پر ہم سے بجھایا نہ گیا

٧٢

بے کسانہ جی گرفتاری سے شیون میں رہا
اک دل غم خوار رکھتے تھے جو گلشن میں رہا

پنجۂ گل کی طرح دیوانگی میں ہاتھ کو
گر نکالا میں گریباں سے تو دامن میں رہا

شمع ساں جلتے رہے لیکن نہ توڑا یار سے
رشتۂ الفت تمامی عمر گردن میں رہا

ڈر سے اس شمشیر زن کے جوہر آئینہ ساں
سر سے لے کر پاؤں تک میں غرق آہن میں رہا

ہم نہ کہتے تھے کہ مت دیر و حرم کی راہ چل
اب یہ دعویٰ حشر تک شیخ و برہمن میں رہا

آہ کس انداز سے گزرا بیاباں سے کہ میرؔ
جی ہر اک نخچیر کا اُس صید افگن میں رہا

٧٣

رنگ اُڑ چلا چمن میں گلوں کا تو کیا نسیم
ہم کو تو روزگار نے بے بال و پر کیا

کیا جانوں بزمِ عیش، کہ ساقی کی چشم دیکھ
میں صحبتِ شراب سے آگے سفر کیا

جس دم کہ تیغِ عشق کھنچی بوالہوس کہاں
سُن لیجیو کہ ہم ہی نے سینہ سپر کیا

دل زخمی ہو کے تجھ تئیں پہنچا تو کم نہیں
اس نیم کشتہ نے بھی قیامت جگر کیا

کچھ کم نہیں ہے شعبدہ بازوں سے میگسار
دارو پلا کے شیخ کو آدم سے خر کیا

ہے کون آپ میں جو ملے تجھ سے مستِ ناز
ذوقِ خبر ہی نے تو ہمیں بے خبر کیا

وہ دشت خوفناک رہا ہے مرا وطن
سُن کر جسے خضر نے سفر سے حذر کیا

ہیں چاروں طرف خیمے کھڑے گردباد کے
کیا جانیے جنوں نے ارادہ کدھر کیا

لکنت تری زبان کی ہے سحر جس سے شوخ
یک حرف نیم گفتہ نے دل پر اثر کیا

٧٤

کچھ نہ دیکھا پھر بجز یک شعلۂ پُر پیچ و تاب
شمع تک تو ہم نے دیکھا تھا کہ پروانا گیا

ایک ہی چشمک تھی فرصتِ صحبتِ احباب کیا
دیدۂ تر ساتھ لے مجلس سے پیمانا گیا

گل کھلے صد رنگ تو کیا بے پری سے اے نسیم
مُدتیں گذریں کہ وہ گلزار کا جانا گیا

۶۹

سحر گہ عید میں دورِ سبو تھا
پر اپنے جام میں تجھ بن لہو تھا

غلط تھا آپ سے غافل گزرنا
نہ سمجھے ہم کہ اس قالب میں تو تھا

چمن کی وضع نے ہم کو کیا داغ
کیا ہر غنچہ دل پُر آرزو تھا

گل و آئینہ کیا خورشید و مہ کیا
جدھر دیکھا تدھر تیرا ہی رو تھا

جہاں پُر ہے فسانے سے ہمارے
دماغِ عشق ہم کو بھی کبھو تھا

کہیں کیا بال تیرے کھل گئے تھے
کہ جھونکا باؤ کا کچھ مشک بو تھا

مگر دیوانہ تھا گل بھی کسو کا
کہ پیراہن میں سو جا گہ رفو تھا

نہ دیکھا میرِ آوارہ کو لیکن
غبار اک ناتواں سا کو بکو تھا

۷۰

راہِ دورِ عشق میں روتا ہے کیا
آگے آگے دیکھیے ہوتا ہے کیا

قافلے میں صبح کے اک شور ہے
یعنی غافل ہم چلے سوتا ہے کیا

سبز ہوتی ہی نہیں یہ سرزمیں
تخمِ خواہش دل میں تو بوتا ہے کیا

یہ نشانِ عشق ہیں جاتے نہیں
داغ چھاتی کے عبث دھوتا ہے کیا

غیرتِ یوسف ہے یہ وقتِ عزیز
میر اس کو رائیگاں کھوتا ہے کیا

۷۱

آنکھوں نے راز داری محبت کی خوب کی
آنسو جو آتے آتے رہے تو لہو بہا

آئے تھے اک اُمید پہ تیری گلی میں ہم
سو آہ اس طرح سے چلے لوہو میں نہا

کس کس طرح سے میر نے کاٹا ہے عمر کو
اب آخر آخر اُن نے یہ ریختہ کہا

نہ ہوگا وہ دیکھا جسے کبک تونے   وہ اک باغ کا سروِ اندام ہوگا
ہزاروں کی یاں لگ گئیں چھت سے آنکھیں
تو اے ماہ کس شب لبِ بام ہوگا

۸۰

رہ نہانے لگا تو سایۂ زلف   بحر میں تو کہے کہ جال پڑا
میں نے تو سر دیا پر اے جلّاد   کس کی گردن پہ یہ وبال پڑا
خوبرو اب نہیں ہیں گندم گوں
میرؔ ہندوستان میں کال پڑا

۸۱

رہ طلب میں گرے ہوتے سر کے بل ہم بھی
شکستہ پائی نے اپنی ہمیں سنبھال لیا

۸۲

نقاش دیکھ تو میں کیا نقشِ یار کھینچا   اس شوخ کم نما کا نت انتظار کھینچا
رسمِ قلمروِ عشق مت پوچھ کچھ کہ ناحق   ایکوں کی کھال کھینچی، ایکوں کو دار کھینچا
تھا شب کسے کسائے تیغ کشیدہ کف میں
پر میں نے بھی بغل میں بے اختیار کھینچا

۸۳

نہ وے زنجیر کے غل ہیں نہ وے جرگے غزالوں کے
مرے دیوان پن تک ہی رہا معمور ویرانا
مرا سر نزع میں زانو پہ رکھ کر یوں لگا کہنے
کہ اے بیمار میرے تجھ پہ جلد آساں ہو مرجانا
نہ ہو کیوں ریختہ بے شورش و کیفیت و معنی
گیا ہو میرؔ دیوانہ، رہا سوداؔ سو مستانا

۸۴

قدر رکھتی نہ تھی متاعِ دل   سارے عالم میں میں دکھا لایا

۷۵

ہاتھ سے تیرے اگر میں ناتواں مارا گیا — سب کہیں گے یہ کہ کیا اک نیم جاں مارا گیا
وصل و ہجراں یہ جو دو منزل ہیں راہ عشق کی — دل غریب ان میں خدا جانے کہاں مارا گیا

۷۶

نہ خالی رہے گی میری جاگہ گر میں — نہ ہوں گا تو اندوہ بسیار ہوگا
زمیں گیر ہو عجز سے تو کہ اک دن — یہ دیوار کا سایہ دیوار ہوگا

تو پوچھ اپنی مجلس میں ہے میرؔ بھی ہاں
جو ہوگا تو جیسے گنہگار ہوگا

۷۷

اشک آنکھوں میں کب نہیں آتا — لہو آتا ہے جب نہیں آتا
ہوش جاتا نہیں رہا لیکن — جب وہ آتا ہے تب نہیں آتا
صبر تھا ایک مونس ہجراں — سو وہ مدت سے اب نہیں آتا
دل سے رخصت ہوئی کوئی خواہش — گریہ کچھ بے سبب نہیں آتا
جی میں کیا کیا ہے اپنے اے ہمدم — ہر سخن تا بلب نہیں آتا

دور بیٹھا غبار میرؔ اس سے
عشق بن یہ ادب نہیں آتا

۷۸

تو برسوں میں ملے ہے یاں فکر یہ رہے ہے — جی جائے گا ہمارا اک دم کو یا رہے گا
غافل نہ رہیو ہرگز نادان داغ دل سے — بھڑکے گا جب یہ شعلہ تب گھر جلا رہے گا

برقع اٹھے پہ اس کے ہوگا جہان روشن
خورشید کا نکلنا کیونکر چھپا رہے گا

۷۹

جو یہ دل ہے تو کیا سرانجام ہوگا — تہ خاک بھی خاک آرام ہوگا
میرا جی تو آنکھوں میں آیا یہ سنتے — کہ دیدار بھی ایک دن عام ہوگا

٨٧

برقع اٹھے پہ اس کے ہوگا جہان روشن — خورشید کا نکلنا کیوں کر چھپا رہے گا
اک وہم سی رہی ہے اپنی نمود تن میں — آتے ہو اب تو آؤ پھر ہم میں کیا رہے گا
اُس گل بغیر جیسے ابرِ بہار عاشق — نالاں جدا رہے گا، روتا جدا رہے گا

وابستہ ہے تغافل غم کہنا اس سے حاصل
تم دردِ دل کہو گے وہ سر جھکا رہے گا

٨٨

بھلا ہوگا کچھ اک احوال اس سے یا بُرا ہوگا — مآل اپنا ترے غم میں خدا جانے کہ کیا ہوگا
تفحص فائدہ ناصح تدارک تجھ سے کیا ہوگا — وہی پاوے گا میرا دردِ دل جس کا لگا ہوگا
خیال اُس بے وفا کا ہم نشیں اتنا نہیں اچھا — گماں رکھتے تھے ہم بھی یہ کہ ہم سے آشنا ہوگا
قیامت کر کے اب تعبیر جس کو کرتی ہے خلقت — وہ اس کوچے میں اک آشوب سا شاید ہوا ہوگا
نہ ہو کیوں غیرت گلزار وہ کوچہ خدا جانے — لہو اُس خاک پہ کن کن عزیزوں کا گرا ہوگا
بہت ہمسائے اس گلشن کے زنجیری رہا ہوں میں — کبھی تم نے بھی میرا شور نالوں کا سنا ہوگا
نہیں جُز عرش جا گہ راہ میں لینے کو دم اُس کے — قفس سے تن کے مرغِ روح میرا جب رہا ہوگا

کہیں ہیں میر کو مارا گیا شب اُس کے کوچے میں
کہیں وحشت میں شاید بیٹھے بیٹھے اُٹھ گیا ہوگا

٨٩

یاں نام یار کس کا وردِ زباں نہ پایا — پر مطلقاً کہیں ہم اس کا نشاں نہ پایا
پایا نہ یوں کہ کریے اُس کی طرف اشارت — یوں تو جہاں میں ہم نے اُس کو کہاں نہ پایا

محرومِ سجدہ آخر جانا پڑا جہاں سے
جوشِ جباہ سے ہم وہ آستاں نہ پایا

٩٠

پھر شب نہ لطف تھا نہ وہ مجلس میں نور تھا — اُس روئے دل فروز ہی کا سب میں ظہور تھا
کیا کیا عزیز خلعِ بدن ہائے کر گئے — تشریف تم کو یاں تئیں لانا ضرور تھا

دل کہ یک قطرہ خوں نہیں ہے بیش ایک عالم کے سر بلا لایا
سب پہ جس بار نے گرانی کی اس کو یہ ناتواں اٹھا لایا
دل مجھے اس گلی میں لے جا کر اور بھی خاک میں ملا لایا
ابتدا ہی میں مر گئے سب یار عشق کی کون انتہا لایا
اب تو جاتے ہیں بت کدے سے میرؔ
پھر ملیں گے اگر خدا لایا

۸۵

کیا عجب پل میں اگر ترک ہو اس سے جاں کا
ہو جو زخمی کسو برہم زدن مژگاں کا
اٹھتے پلکوں کے گرے پڑتے ہیں لاکھوں آنسو
ڈول ڈالا ہے مری آنکھوں نے اب طوفاں کا
جلوۂ ماہ تہِ ابرِ تنک بھول گیا
اُن نے سوتے سے دوپٹے سے جو منھ کو ڈھانکا
لہو لگتا ہے ٹپکنے جو پلک ماروں ہوں
اب تو یہ رنگ ہے اس دیدۂ اشک افشاں کا
ساکن کوُ کو ترے کب ہے تماشے کا دماغ
آئی فردوس بھی چل کر نہ اِدھر کو جھانکا
اُٹھ گیا ایک تو اک مرنے کو آ بیٹھے ہے
قاعدہ ہے یہی مدّت سے ہمارے ہاں کا

۸۶

سبزانِ تازہ رو کی جہاں جلوہ گاہ تھی اب دیکھیے تو واں نہیں سایہ درخت کا
جوں برگ ہائے لالہ پریشان ہو گیا مذکور کیا ہے اب جگرِ لخت لخت کا
دِتّی میں آج بھیک بھی ملتی نہیں اُنھیں تھا کل تلک دماغ جنھیں تاج و تخت کا
خاکِ سیہ سے میں جو برابر ہوا ہوں میرؔ سایہ پڑا ہے مجھ پہ کسو تیرہ بخت کا

یا دِ ایامے کہ اپنے روز و شب کی جائے باش — یا درِ باز بیاباں یا درِ مےخانہ تھا
جس کو دیکھا ہم نے اس وحشت کدے میں دہر کے — یا سڑی یا خبطی یا مجنون یا دیوانہ تھا
غیر کے کہنے سے مارا اُن نے ہم کو بے گناہ — یہ نہ سمجھا وہ کہ واقع میں بھی کچھ تھا یا نہ تھا
صبح ہوتے وہ بناگوش آج یاد آیا مجھے — جو گرا دامن پہ آنسو گوہرِ یک دانہ تھا
شب فروغِ بزم کا باعث ہوا تھا حسنِ دوست — شمع کا جلوہ غبارِ دیدۂ پروانہ تھا

رات اس کی چشمِ میگوں خواب میں دیکھی تھی میں
صبح ہوتے سے اٹھا تو سامنے پیمانہ تھا

۹۵

پیغامِ غم جگر کا گلزار تک نہ پہنچا — نالہ مرا چمن کی دیوار تک نہ پہنچا
اس آئینے کے مانند زنگار جس کو کھاوے — کام اپنا اس کے غم میں دیدار تک نہ پہنچا
جوں نقشِ پا ہے غربت حیران کار اُس کی — آوارہ ہو وطن سے جو یار تک نہ پہنچا

لبریز شکوہ تھے ہم لیکن حضور تیرے
کارِ شکایت اپنا گفتار تک نہ پہنچا

۹۶

کن نیندوں اب تو سوتی ہے اے چشمِ گریہ ناک — مژگاں تو کھول شہر کو سیلاب لے گیا
نے دل رہا بجا ہے نہ صبر و حواس و ہوش — آیا جو سیلِ عشق سب اسباب لے گیا
میرے حضور شمع نے گریہ جو سر کیا — رویا میں اس قدر کہ مجھے آب لے گیا

منہ کی جھلک سے یار کے بے ہوش ہو گئے
شب ہم کو میرؔ پر تو مہتاب لے گیا

۹۷

کب تلک یہ ستم اُٹھائیے گا — ایک دن یوں ہی جی سے جائیے گا
شکل تصویر، بے خودی کب تک — کسو دن آپ میں بھی آئیے گا
سب سے مل چل، کہ حادثے سے پھر — کہیں ڈھونڈا بھی تو نہ پائیے گا
کہیے گا اُس سے قصۂ مجنوں — یعنی پردے میں غم سنائیے گا
اُس کے پابوس کی توقع پر — اپنے تئیں خاک میں ملائیے گا

کیوں کر تو میری آنکھ سے ہو دل تلک گیا | یہ بحرِ موجِ خیز تو عسرالعبور تھا

شاید نشے میں اُس سے یہ سفاکیاں ہوئیں
زخمی جو اس کے ہاتھ کا نکلا سو چور تھا

۹۱

شاید کہ مُند گئی ہے قمری کی چشم گریاں | کچھ ٹوٹ سا چلا ہے پانی چمن کی جُو کا
یہ عیش گہ نہیں ہے یاں رنگ اور کچھ ہے | ہر گل ہے اس چمن میں ساغر بھرا لہو کا
بلبل غزل سرائی آگے ہمارے مت کر | سب ہم سے سیکھتے ہیں انداز گفتگو کا
گلیاں بھری پڑی ہیں اے یار زخمیوں سے | مت کھول پیچ ظالم اس زلفِ مشکبو کا

وے پہلی التفاتیں ساری فریب نکلیں
دینا نہ تھا دل اس کو میں میر آہ چو کا

۹۲

میں بھی دنیا میں ہوں اک نالہ پریشاں یک جا | دل کے سو ٹکڑے مرے، پر سبھی نالاں یک جا
سر سے باندھا ہے کفن عشق میں تیرے یعنی | جمع ہم نے بھی کیا ہے سر و ساماں یک جا
کیونکے پڑتے ہیں ترے پاؤں نسیم سحری | اُس کے کوچے میں ہے صد گنجِ شہیداں یک جا
تو بھی رونے کو ملا، دل ہے ہمارا بھی بھرا | ہو جیے اے ابر، بیابان میں گریاں یک جا

بیٹھ کر میر جہاں خوب نہ رویا ہووے
ایسی کوچے میں نہیں ہے ترے جاناں یک جا

۹۳

ہمارے ضعف کی حالت سے دل قوی رکھیو | کہیں خیال نہیں یاں بحال آنے کا
تری ہی راہ میں مارے گئے سبھی آخر | سفر تو ہم کو ہے درپیش جی سے جانے کا

بسانِ شمع جو مجلس سے ہم گئے تو گئے
سراغ کیجیو نہ پھر تو نشان پانے کا

۹۴

کل شب ہجراں تھی لب پر نالہ بیمارانہ تھا | شام سے تا صبح دم بالیں پہ سر یکجا نہ تھا
اک نگاہِ آشنا کو بھی وفا کرتا نہیں | وا ہوئیں مژگاں کہ سبزہ سبزۂ بیگانہ تھا

نشو و نما ہے اپنی جوں گرد باد انوکھی بالیدہ خاکِ رہ سے ہے یہ شجر ہمارا

اس کارواں سرا میں کیا میر بار کھولیں
یاں کوچ لگ رہا ہے شام و سحر ہمارا

۱۰۱

غم رہا جب تک کہ دم میں دم رہا دل کے جانے کا نہایت غم رہا
دل نہ پہنچا گوشۂ داماں تلک قطرۂ خوں تھا مژہ پر جم گیا
سنتے ہیں لیلےٰ کے خیمے کو سیاہ اُس میں مجنوں کا مگر ماتم رہا
اُس کے لب سے تلخ ہم سنتے رہے اپنے حق میں آبِ حیواں سم رہا
میرے رونے کی حقیقت جس میں تھی ایک مدت تک وہ کاغذ نم رہا

جامۂ احرام زاہد پر نہ جا
تھا حرم میں لیک نا محرم رہا

۱۰۲

چوری میں دل کی وہ ہنر کر گیا دیکھتے ہی آنکھوں میں گھر کر گیا
دہر میں میں خاک بسر ہی رہا عمر کو اس طور بسر کر گیا
دل نہیں ہے منزلِ سینہ میں اب یاں سے وہ بیچارہ سفر کر گیا
حیف جو وہ نسخۂ دل کے اوپر سرسری سی ایک نظر کر گیا
کس کو مرے حال سے تھی آگہی نالۂ شب سب کو خبر کر گیا

مجلسِ آفاق میں پروانہ ساں
میر بھی شام اپنی سحر کر گیا

۱۰۳

آیا جو واقعے میں درپیش عالمِ مرگ یہ جاگنا ہمارا دیکھا تو خواب نکلا
دیکھا جو اوس پڑتے گلشن میں ہم تو آخر گل کا وہ روئے خنداں چشمِ پُر آب نکلا
پردے ہی میں چلا جا خورشید تو ہے بہتر اک حشر ہے جو گھر سے وہ بے حجاب نکلا

ہر حرفِ غم نے میرے مجلس کے تئیں رُلایا
گویا غبارِ دل کا پڑھتا کتاب نکلا

اس کے پاؤں کو جا لگی ہے حنا　　خوب سے ہاتھ اسے لگائیے گا
اس ڈیڑھ اینٹ کی جدی مسجد　　کسی ویرانے میں بنائیے گا
شرکت شیخ و برہمن سے میرؔ
کعبہ و دیر سے بھی جائیے گا

٩٨

جس گھر میں ترے جلوے سے ہو چاندنی کا فرش　　وہاں چادر مہتاب ہے مکڑی کا سا جالا
گزرے ہے لہو واں سر ہر خار سے اب تک　　جس دشت میں پھوٹا ہے مرے پاؤں کا چھالا
دیکھے ہے مجھے دیدۂ پر خشم سے وہ میرؔ
میرے ہی نصیبوں میں تھا یہ زہر کا پیالا

٩٩

پل میں جہاں کو دیکھتے میرے ڈبو چکا　　اک وقت میں یہ دیدہ بھی طوفان رو چکا
لگتی نہیں پلک سے پلک انتظار میں　　آنکھیں اگر یہی ہیں تو بھر نیند سو چکا
یک چشمک پیالہ ہے ساقی بہار عمر　　جھپکی لگی کہ دور یہ آخر ہی ہو چکا
ممکن نہیں کہ گل کرے ویسی شگفتگی　　اس سرزمیں میں تخم محبت میں بو چکا
ہر صبح حادثے سے یہ کہتا ہے آسماں
دے جام خون میرؔ کو گر منہ وہ دھو چکا

١٠٠

دیر و حرم سے گزرے اب دل ہے گھر ہمارا　　ہے ختم اس آبلے پر سیر و سفر ہمارا
دنیا و دیں کی جانب میلان ہو تو کہیے　　کیا جانیے کہ اس بن دل ہے کدھر ہمارا
ہیں تیرے آئینے کی تمثال ہم نہ پوچھو　　اس دشت میں نہیں ہے پیدا اثر ہمارا
جوں صبح اب کہاں ہے طول سخن کی فرصت　　قصہ ہی کوئی دم کو ہے مختصر ہمارا
کوچے میں اس کے جاکر بنتا نہیں پھر آنا　　خوں ایک دن گرے گا اس خاک پر ہمارا
سیلاب ہر طرف سے آئیں گے بادیے میں　　جوں ابر روئے ہوگا جس دم گذر ہمارا
یوں دور سے کھڑے ہو کیا معتبر ہے رونا　　دامن سے باندھ دامن اے ابر تر ہمارا

تھی یہ سب کائنات زیرنگیں — ساتھ مور و ملخ سا لشکر تھا
لعل و یاقوت ہم زر و گوہر — چاہیے جس قدر میسر تھا
آخرِ کار جب جہاں سے گیا
ہاتھ خالی کفن سے باہر تھا

۱۰۷

تیرا رخ مخطط قرآن ہے ہمارا — بوسہ بھی لیں تو کیا ہے، ایمان ہے ہمارا
ادریس و خضر و عیسیٰ قاتل سے ہم چھڑائے — ان خوں گرفتگاں پر احسان ہے ہمارا
ہیں اس خراب دل سے مشہورِ شہر خوباں — اس ساری بستی میں گھر ویران ہے ہمارا
کرتے ہیں باتیں کس کس ہنگامے کی یہ زاہد — دیوانِ حشر گویا دیوان ہے ہمارا
مشکل بہت ہے ہم سا پھر کوئی ہاتھ آنا — یوں مارنا تو پیارے آسان ہے ہمارا
ماہیّت دو عالم کھاتے پھرے ہے غوطے — یک قطرۂ خوں یہ دل طوفان ہے ہمارا
کرتا ہے کام وہ دل جو عقل میں نہ آوے — گھر کا مشیر کتنا نادان ہے ہمارا
کیا خاندان کا اپنے تجھ سے کہیں تقدس — روح القدس اک ادنیٰ دربان ہے ہمارا
بنجر زمین دل کی ہے میر ملک اپنی
پُر داغ سینہ، قہر فرمان ہے ہمارا

۱۰۸

آدم خاکی سے عالم کو جلا ہے ورنہ — آئینہ تھا یہ ولے قابل دیدار نہ تھا
دھوپ میں جلتی ہیں غربت وطنوں کی لاشیں — تیرے کوچے میں مگر سایۂ دیوار نہ تھا
صد گلستاں تہہ یک بال تھے اس کے جب تک — طائرِ جانِ قفس تن کا گرفتار نہ تھا
رات حیران ہوں کچھ چپ ہی مجھے لگ گئی میر
درد پنہاں تھے بہت پر لبِ اظہار نہ تھا

۱۰۹

جی اپنا میں نے تیرے لیے خوار ہو، دیا — آخر کو جستجو نے تیری مجھ کو کھو، دیا
اے ابر اس چمن میں نہ ہوگا گل امید
یاں تخم یاسِ اشک کو میں بھر کے بو دیا

۱۰۴

دامان کوہ میں جو، میں ڈاڑھ مار رویا   اک ابر واں سے اٹھ کر بے اختیار رویا
تھی مصلحت کہ رک کر ہجراں میں جان دیجے   دل کھول کر نہ غم میں میں ایک بار رویا
پڑتا نہ تھا بھروسہ عہد وفائے گل پر
مرغ چمن نہ سمجھا میں تو ہزار رویا

۱۰۵

اُس چہرے کی خوبی سے عبث گل کو جتایا   یہ کون شگوفہ سا چمن زار میں لایا
کچھ ماہ میں اس میں نہ تفاوت ہوا ظاہر   سو بار نکالا اسے اور اُس کو چھپایا
اک عمر مجھے خاک میں ملتی ہوئی گذری   کوچے میں ترے آن کے لوہو میں نہایا
یہ باغ رہا ہم سے و لے جا نہ سکے ہم   بے بال و پری نے بھی ہمیں خوب اڑایا
میں صید رمیدہ ہوں بیابانِ جنوں کا   رہتا ہے مرا موجبِ وحشت مرا سایا
یا قافلہ در قافلہ ان رستوں میں تھے لوگ
یا ایسے گئے یاں سے کہ پھر کھوج نہ پایا

۱۰۶

دل جو زیر غبار اکثر تھا   کچھ مزاج ان دنوں مکدر تھا
اس پہ تکیہ کیا تو تھا لیکن   رات دن ہم تھے اور بستر تھا
سرسری تم جہان سے گذرے   ورنہ ہر جا جہانِ دیگر تھا
دل کی کچھ قدر کرتے رہیو تم   یہ ہمارا بھی ناز پرور تھا
بعد یک عمر جو ہوا معلوم   دل اس آئینہ رو کا پتھر تھا
بارے سجدہ ادا کیا تہ تیغ   کب سے یہ بوجھ میرے سر پر تھا
کیوں نہ ابر سیہ سفید ہوا   جب تلک عہد دیدۂ تر تھا
اب خرابا ہوا جہان آباد   ورنہ ہر اک قدم پہ یاں گھر تھا
بے زری کا نہ کر گلہ غافل   ق   رہ تسلی کہ یوں مقدر تھا
اتنے منعم جہان میں گذرے   وقت رحلت کے کس کنے زر تھا
صاحب جاہ و شوکت و اقبال   اک ازاں جملہ اب سکندر تھا

۱۱۴

کیا دن تھے وے کہ یاں بھی دلِ آرمیدہ تھا — رُو آشیانِ طائرِ رنگِ پریدہ تھا
قاصد جو واں سے آیا تو شرمندہ میں ہوا — بیچارہ گریہ ناک گریباں دریدہ تھا
اک وقت ہم کو تھا سرِ گریہ کہ دشت میں — جو خارِ خشک تھا سو وہ طوفاں رسیدہ تھا
جس صیدگاہ عشق میں یاروں کا جی گیا — مرگ اس شکارگہ کا شکارِ رمیدہ تھا
مت پوچھ کس طرح سے کٹی رات ہجر کی — ہر نالہ میری جان کو تیغ کشیدہ تھا
حاصل نہ پوچھ گلشنِ مشہد کا بوالہوس — یاں پھل ہر اک درخت کا حلقِ بریدہ تھا

دل بے قرارِ گریۂ خونیں تھا رات میرؔ
آیا نظر تو بسملِ در خوں طپیدہ تھا

۱۱۵

کثرتِ داغ سے دل رشکِ گلستاں نہ ہوا — میرا دل خواہ جو کچھ تھا وہ کبھو یاں نہ ہوا
آہ میں کب کی کہ سرمایۂ دوزخ نہ ہوئی — کون سا اشک مرا منبعِ طوفاں نہ ہوا

برق مت خوشے کی اور اپنی بیاں کر صحبت
شکر کر یہ کہ مرا واں دلِ سوزاں نہ ہوا

۱۱۶

سنگ مجھے بجاں قبول اس کے عوض ہزار بار — تا بہ کجا یہ اضطراب دل نہ ہوا ستم ہوا
کس کی ہوا کہاں کا گل، ہم تو قفس میں ہیں اسیر — سیرِ چمن کی روز و شب تجھ کو مبارک اے صبا
کن نے بدی ہے اتنی دیر موسمِ گل ہیں ساقیا — دے بھی مے دو آتشہ زور ہی سرد ہے ہوا

بوئے کبابِ سوختہ آتی ہے کچھ دماغ میں
ہووے نہ ہووے اے نسیم رات کسی کا دل جلا

۱۱۷

قا بو خزاں سے ضعف کا گلشن میں بن گیا — دوشِ ہوا پہ رنگِ گل و یاسمن گیا
یادش بخیر دشت میں مانندِ عنکبوت — دامن کے اپنے تار جو خاروں پہ تن گیا
مارا تھا کس لباس میں عریانی نے مجھے — جس سے تہِ زمین بھی میں بے کفن گیا
آئی اگر بہار تو اب ہم کو کیا صبا — ہم سے تو آشیاں بھی گیا اور چمن گیا

۱۱۰

پائے پر آبلہ سے میں گمشدہ گیا ہوں — ہر خار بادیے کا میرا نشان دے گا
نالہ ہمارا ہر شب گزرے ہے آسماں سے — فریاد پر ہماری کس دن تو کان دے گا
گھر چشم کا ڈبو مت دل کے گئے پہ رو رو
کیا میر ہاتھ سے تو یہ بھی مکان دے گا

۱۱۱

ہوتا ہے یاں جہاں میں ہر روز و شب تماشا — دیکھا جو خوب تو ہے دنیا عجب تماشا
ہر چند شورِ محشر اب بھی ہے در پہ لیکن — نکلے گا یار گھر سے ہووے گا جب تماشا
بھڑکے ہے آتشِ غم منظور ہے جو تجھ کو — جلنے کا عاشقوں کے آ دیکھ اب تماشا
طالع جو میر خواری محبوب کو خوش آئی
پر غم یہ ہے مخالف دیکھیں گے سب تماشا

۱۱۲

کل چمن میں گل و سمن دیکھا — آج دیکھا تو باغ، بن دیکھا
کیا ہے گلشن میں جو قفس میں نہیں — عاشقوں کا جلا وطن دیکھا
ذوق پیکاں تیر میں تیرے — مدتوں تک جگر نے چھن دیکھا
گھر کے گھر جلتے تھے پڑے تیرے — داغ دل دیکھ بس چمن دیکھا
ایک چشمک، دو صد سنانِ مژہ — اس نکیلے کا بانکپن دیکھا
حسرت اس کی جگہ تھی خوابیدہ
میر کا کھول کر کفن دیکھا

۱۱۳

جہاں کو فتنے سے خالی کبھو نہیں پایا — ہمارے وقت میں تو آفت زمانہ ہوا
خلش نہیں کسو خواہش کی رات سے شاید — سرشکِ یاس کے پردے میں دل روانہ ہوا
کھلا نشے میں جو پگڑی کا پیچ اس کی میر
سمندِ ناز پہ ایک اور تازیانہ ہوا

جہاں جلوے سے اس محبوب کے یکسر لبالب ہے
نظر پیدا کر اوّل پھر تماشا دیکھ قدرت کا
نگاہ یاس بھی اس صید افگن پر غنیمت ہے
نہایت تنگ ہے اے صید بسمل وقت فرصت کا
خرابی دل کی اس حد ہے کہ یہ سمجھا نہیں جاتا
کہ آبادی بھی یاں تھی یا کہ ویرانہ تھا مدت کا
نگاہِ مست نے اُس کی لُٹائی خانقہ ساری
پڑا ہے برہم اب تک کارخانہ زہد و طاعت کا
قدم ٹک دیکھ کر میر سر دل سے نکالے گا
پلک سے شوخ تر کانٹا ہے صحرائے محبت کا

۱۲۲

جو اِس شور سے میر روتا رہے گا
تو ہمسایہ کاہے کو سوتا رہے گا
میں وہ رونے والا جہاں سے چلا ہوں
جسے ابر ہر سال روتا رہے گا
مجھے کام رونے سے اکثر ہے ناصح
تو کب تک مرے منھ کو دھوتا رہے گا
بس اے گریہ آنکھیں تری کیا نہیں ہیں
کہاں تک جہاں کو ڈبوتا رہے گا
مرے دل نے وہ نالہ پیدا کیا ہے
جرس کے بھی جو ہوش کھوتا رہے گا
بس اے میر مژگاں سے پونچھ آنسوؤں کو
تو کب تک یہ موتی پروتا رہے گا

۱۲۳

نئی طرزوں سے مے خانے میں رنگِ مے جھلکتا تھا
گلابی روتی تھی واں جام ہنس ہنس کر جھلکتا تھا
ترے اس خاک اُڑانے کی دھمک سے اے مری وحشت
کلیجا ریگِ صحرا کا بھی دس دس گز تھلکتا تھا
گئی تسبیح اس کی نزع میں کب میر کے دل سے
اسی کے نام کی سمرن تھی جب منکا ڈھلکتا ہے

۱۲۴

تجھ سے ہر آن مرے پاس کا آنا ہی گیا
کیا گلہ کیجیے غرض اب وہ زمانہ ہی گیا
ہم اسیروں کو بھلا کیا جو بہار آئی نسیم
عمر گذری کہ وہ گلزار کا جانا ہی گیا

۱۱۸

دامن میں آج دیکھا پھر لخت میں نے آیا — ٹکڑا کوئی جگر کا پلکوں میں رہ گیا تھا
اُس قیدِ جیب سے میں چھوٹا جنوں کی دولت — ورنہ گلا یہ میرا جوں طوق میں پھنسا تھا
مشتِ نمک کی خاطر اِس واسطے ہوں حیراں — کل زخم وہ نہایت دل کو مرے لگا تھا
اے گرد باد مت دے ہر آن عرضِ وحشت — میں بھی کسو زمانے اس کام میں بلا تھا
بِن کچھ کہے سنا ہے عالم سے میں نے کیا کیا — پر تونے یوں نہ جانا اے بے وفا کہ کیا تھا
روتی ہے شمع اتنا ہر شب کہ کچھ نہ پوچھو — میں سوزِ دل کو اپنے مجلس میں کیوں کہا تھا
سر مار کر ہوا تھا میں خاک اُس گلی میں — ق سینے پہ مجھ کو اس کا مذکور نقشِ پا تھا

سو بخت تیرہ سے ہوں پامالِ صبا میں
اس دن کے واسطے میں کیا خاک میں ملا تھا

۱۱۹

کہاں آئے میسّر تجھ سے مجھ کو خود نما اتنے
ہوا یوں اتفاق آئینہ میرے روبرو ٹوٹا

۱۲۰

آنکھوں میں جی مرا ہے اِدھر یار دیکھنا — عاشق کا اپنے آخری دیدار دیکھنا
کیسا چمن کہ ہم سے اسیروں کو منع ہے — چاکِ قفس سے باغ کی دیوار دیکھنا
آنکھیں چرائیو نہ ٹک اَبرِ بہار سے — میری طرف بھی دیدۂ خوں بار دیکھنا
اے ہمسفر نہ آبلے کو پہنچے چشمِ تر — لاگا ہے میرے پاؤں میں آ، خار دیکھنا
صیاد دل ہے داغ جدائی سے رشکِ باغ — تجھ کو بھی ہو نصیب یہ گلزار دیکھنا
ہونا نہ چار چشم دل اس ظلم پیشہ سے — ہوشیار زینہار خبردار دیکھنا
گر زمزمہ یہی ہے کوئی دن تو ہم صفیر — اس فصل ہی میں ہم کو گرفتار دیکھنا

بلبل ہمارے گل پہ نہ گستاخ کر نظر
ہو جائے گا گلے کا کہیں ہار دیکھنا

۱۲۱

غلط ہے عشق میں اے بوالہوس اندیشہ راحت کا — رواج اس ملک میں درد و داغ و رنج و کلفت کا

۱۳۰

کام پل میں مرا تمام کیا — غرض اس شوخ نے بھی کام کیا
سرو شمشاد خاک میں مل گئے — تو نے گلشن میں کیوں خرام کیا

۱۳۱

رات پیاسا تھا میرے لوہو کا — ہوں دوانہ ترے سگِ کو کا
شعلۂ آہ جوں توں اب مجھ کو — فکر ہے اپنے بر بُنِ مو کا
ہے مرے یار کے مَسوں کا شک — کشتہ ہوں سبزۂ لب جو کا
عطر آگیں ہے باد صبح، مگر — کھل گیا پیچ زلفِ خوشبو کا

ایک دو ہوں تو سحرِ چشم کہوں
کارخانہ ہے واں تو جادو کا

۱۳۲

آیا تھا خانقہ میں وہ نورِ دیدگان کا — تہ کر گیا مصلّٰے غزلت گزیدگان کا
آخر کو خاک ہونا درپیش ہے سبھوں کا — ٹک دیکھ منہ کدھر ہے قامت خمیدگان کا

جو خار دشت میں ہے سو چشم آبلہ سے
دیکھا ہوا ہے تیرے محنت کشیدگان کا

۱۳۳

طالع جو خوب تھے نہ ہوا جاہ کچھ نصیب — سر پر مرے کروڑ برس تک ہما پھرا

آنکھیں برنگ نقش قدم ہوگئیں سفید
نامے کے انتظار میں، قاصد بھلا پھرا

۱۳۴

کس شام سے اٹھا تھا مرے دل میں درد سا — سو ہو چلا ہوں پیش تر از صبح سرد سا
بیٹھا ہوں جوں غبار ضعیف اب وگرنہ میں — پھرتا رہا ہوں گلیوں میں آوارہ گرد سا
قصد طریقِ عشق کیا سب نے بعدِ قیس — لیکن ہوا نہ ایک بھی اس رہ نورد سا

کیا میر ہے یہی جو ترے در پہ تھا کھڑا
نمناک چشم و خشک لب و رنگ زرد سا

۱۲۵

دل عشق کا ہمیشہ حریف نبرد تھا
اب جس جگہ کہ داغ ہے یاں آگے درد تھا

اک گرد راہ تھا پئے محمل تمام راہ
کس کا غبار تھا کہ یہ دنبالہ گرد تھا

دل کی شکستگی نے ڈرائے رکھا ہمیں
واں چیں جبیں پہ آئی کہ یاں رنگ زرد تھا

مانند حرف صفحۂ ہستی سے اُٹھ گیا
دل بھی مرا جریدۂ عالم میں فرد تھا

تھا پُشتہ ریگ باد اک وقت کارواں
یہ گردِ باد کوئی بیاباں نورد تھا

عاشق ہیں ہم تو میرؔ کے بھی ضبط عشق کے
دل جل گیا تھا اور نفس لب پہ سرد تھا

۱۲۶

کفِ جاناں سے کیا امکانِ رہائی میرؔ کوئی ہو
اچنبا ہے جو اس کے ہاتھ سے رنگِ حنا چھوٹا

۱۲۷

بُرقع اٹھا تھا رخ سے میرے بدگمان کا
دیکھا تو اور رنگ ہے سارے جہان کا

خوبی کو اس کے چہرہ کی کیا پہنچے آفتاب
ق ہے اِس میں اُس میں فرق زمیں آسمان کا

یاں بلبل اور گل پہ تو عبرت سے آنکھ کھول
گلگشت سرسری نہیں اس گلستان کا

گل یادگار چہرۂ خوباں ہے بے خبر
مُرغِ چمن نشاں ہے کسو خوش زبان کا

۱۲۸

مغاں مجھ مست بن پھر خندۂ ساغر نہ ہووے گا
مے گلگوں کا شیشہ ہچکیاں لے لے کے رووے گا

۱۲۹

نقش بیٹھے ہے کہاں خواہشِ آزادی کا
ننگ ہے نام رہائی تری صیّادی کا

داد دے ورنہ ابھی جان پہ کھیلوں ہوں میں
دل جلانا نہیں دیکھا کسی فریادی کا

ریختہ مرتبے کو پہنچایا ہوا اس کا ہے
معتقد کون نہیں میرؔ کی اُستادی کا

۱۳۹

کام میرا بھی ترے غم میں کہوں ہو جائے گا — جب یہ کہتا ہوں تو کہتا ہے ہوں، ہو جائے گا
خون کم کر اب کہ کشتوں کے تو پشتے لگ گئے — قتل کرتے کرتے تیرے تئیں جنوں ہو جائے گا
اس شکار انداز خونیں کا نہیں آیا مزاج — ورنہ آہوئے حرم، صیدِ زبوں، ہو جائے گا
بزمِ عشرت میں ملامت ہم نگوں بختوں کے تئیں
جوں حبابِ بادہ ساغر سرنگوں ہو جائے گا

۱۴۰

سب گئے ہوش و صبر و تاب و تواں — دل سے اک داغ ہی جدا نہ ہوا
ظلم و جور و جفا ستم بیداد — عشق میں تیرے ہم پہ کیا نہ ہوا

۱۴۱

یار عجب طرح نگہ کر گیا — دیکھنا وہ دل میں جگہ کر گیا
تنگ قبائی کا سماں یار کی — پیرہن غنچہ کو تہ کر گیا
جانا ہے اس بزم سے آیا تو کیا — کوئی گھڑی گو کہ توقف کر گیا
وصفِ خط و خال میں خوباں کے میر
نامۂ اعمال سیہ کر گیا

۱۴۲

آہِ سحر نے سوزشِ دل کو مٹا دیا — اس باد نے ہمیں تو دیا سا بجھا دیا
سمجھی نہ باد صبح کہ آکر اٹھا دیا — اس فتنۂ زمانہ کو ناحق جگا دیا
اس موج خیز دہر میں ہم کو قضا نے آہ — پانی کے بلبلے کی طرح سے مٹا دیا
تھی لاگ اس کی تیغ کو ہم سے سو عشق نے — دونوں کو معرکے میں گلے سے لگا دیا
سب شور ما و من کو لیے سر میں مر گئے — یاروں کو اس فساد نے آخر سلا دیا
آوارگانِ عشق کا پوچھا جو میں نشاں — مشتِ غبار لے کے صبا نے اڑا دیا
اجزا بدن کے جتنے تھے، پانی ہو بہہ گئے — آخر گداز عشق نے ہم کو بہا دیا
مدت رہے گی یاد ترے چہرے کی جھلک — جلوے کو جس نے ماہ کے جی سے بھلا دیا

۱۳۵

خزاں التفات اس پہ کرتی بجا تھی
یہ غنچہ چمن میں ابھی وا ہوا تھا

کہاں تھا تو اس طور آنے سے میرے
گلی میں تری کل تماشا ہوا تھا

گریباں سے تب ہاتھ اٹھایا تھا میں نے
مری اور دامانِ صحرا ہوا تھا

زہے طالع اے میر اُن نے یہ پوچھا
کہاں تھا تو اب تک تجھے کیا ہوا تھا

۱۳۶

آہ کے تئیں دلِ حیران و خفا کو سونپا
میں نے یہ غنچۂ تصویر صبا کو سونپا

۱۳۷

گِلہ نہیں ہے ہمیں اپنی جاں گدازی کا
جگر پہ زخم ہے اُس کی زباں درازی کا

سمندِ ناز نے اس کے جہاں کیا پامال
وہی ہے اب بھی اسے شوق ترک تازی کا

کسو کی بات نے آگے مرے نہ پایا رنگ
دلوں میں نقش ہے میری سخن طرازی کا

خدا کو کام تو سونپے ہیں میں نے سب لیکن
رہے ہے خوف مجھے واں کی بے نیازی کا

بسانِ خاک ہو پامال راہِ خلق اے میر
رکھے ہے دل میں اگر قصد سرفرازی کا

۱۳۸

کیا کہیے کہ خوباں نے اب ہم میں ہے کیا رکھا
ان چشم سیاہوں نے بہتوں کو سُلا رکھا

جلوہ ہے اسی کا سب گلشن میں زمانے کے
گل پھول کو ہے اُن نے پردہ سا بنا رکھا

جوں برگِ خزاں دیدہ سب زرد ہوئے تھے ہم تو
گرمی نے ہمیں دل کی آخر کو جلا رکھا

تھی مسلکِ الفت کی مشہور خطرناکی
میں دیدہ و دانستہ کس راہ میں پا رکھا

خورشید و قمر پیارے رہتے ہیں چھپے کوئی
رخساروں کو گو تو نے برقع سے چھپا رکھا

قطعی ہے دلیل اے میر اس تیغ کی بے آبی
رحم اُن نے مرے حق میں مطلق نہ روا رکھا

۱۴۶

اس پر لہو کے پیاسے ہیں تیرے لبوں کے رشک — اک نام کو رہی ہے عقیق یمن میں آب
دریا ہیں قطرہ قطرہ ہے آبِ گُہر کہیں — ہے میر موجزن ترے ہر یک سخن میں آب

۱۴۷

کس کی مسجد، کیسے میخانے، کہاں کے شیخ و شاب
ایک گردش میں تری چشم سیہ کے سب خراب

تو کہاں، اس کی کمر کدھر، نہ کریو اضطراب
اے رگِ گُل دیکھیو کھاتی ہے جو تو پیچ و تاب

موند رکھنا چشم کا ہستی میں عینِ دید ہے
کچھ نہیں آتا نظر جب آنکھ کھولے ہے حباب

مت ڈھلک مژگاں سے اب تو اے سرشکِ آبدار
مفت میں جاتی رہے گی تیری موتی کی سی آب

کچھ نہیں بحرِ جہاں کی موج پر مت بھول میر
دور سے دریا نظر آتا ہے لیکن ہے سراب

۱۴۸

دیکھ خورشید تجھ کو اے محبوب — عرق شرم میں گیا ہے ڈوب
آئی کنعاں سے بادِ مصر ولے — نہ گئی تا بہ کلبۂ یعقوب

میر شاعر بھی زور کوئی تھا
دیکھتے ہو نہ بات کا اسلوب

ت

۱۴۹

وحشت ہے بہت میر کو مل آئیے چل کر
کیا جانیے پھر یاں سے گئے کب ہو ملاقات

ہم نے تو سادگی سے کیا جی کا بھی زیاں دل جو دیا تھا سو تو دیا سر جدا دیا
ان نے تو تیغ کھینچی تھی پر جی چلا کے تیر
ہم نے بھی ایک دم میں تماشا دکھا دیا

ب
۱۴۳

رکھتا ہے ہم سے وعدہ ملنے کا یار ہر شب سو جاتے ہیں ولیکن بخت کنار ہر شب
مدت ہوئی کہ اب تو ہم سے جدا رکھے ہے اُس آفتاب رو کو یہ روزگار ہر شب
دیکھیں ہیں راہ کس کی یارب کہ اختروں کی رہتی ہیں باز آنکھیں چندیں ہزار ہر شب
دھوکے ترے کسو دن میں جان دے رہونگا کرتا ہے ماہ میرے گھر گزار ہر شب
دل کی کدورت اپنی یک شب بیاں ہوئی تھی رہتا ہے آسماں پر تب سے غبار ہر شب
مجلس میں میں نے اپنا سوزِ جگر کہا تھا
روتی ہے شمع تب سے بے اختیار ہر شب

۱۴۴

اب وہ نہیں کہ آنکھیں تھیں پُر آب روز و شب ٹپکا کرے ہے آنکھوں سے خونِ ناب روز و شب
اس کے لیے نہ پھرتے تھے ہم خاک چھانتے رہتا تھا پاس وہ دُرِ نایاب روز و شب
اب رسم ربط اٹھ ہی گئی ورنہ پیش ازیں
بیٹھے ہی رہتے تھے بہم احباب روز و شب

۱۴۵

رویا کیے ہیں غم سے ترے ہم تمام شب پڑتی رہی ہے زور سے شبنم تمام شب
شکوہ عبث ہے میر کہ کڑھتے ہیں سارے دن ق یا دل کا حال رہتا ہے درہم تمام شب
گذرا کے جہاں میں خوشی سے تمام روز
کس کی کٹی زمانے میں بے غم تمام شب

۱۵۳

اب تو چپ لگ گئی ہے حیرت سے — پھر کھلے گی زبان جب کی بات
نکتہ دانانِ رفتہ کی نہ کہو — بات وہ ہے جو ہووے اب کی بات
کس کا روئے سخن نہیں ہے اُدھر — ہے نظر میں ہماری سب کی بات
ظلم ہے، قہر ہے، قیامت ہے — غصّے میں اس کے زیر لب کی بات

گو کہ آتشِ زباں تھے آگے میرؔ
اب کی کہیے، گئی وہ تب کی بات

ج
۱۵۴

جینے میں اختیار نہیں ورنہ ہم نشین — ہم چاہتے ہیں موت تو اپنی خدا سے آج
ساقی ٹک ایک موسمِ گل کی طرف بھی دیکھ — ٹپکا پڑے ہے رنگ چمن میں ہوا سے آج

تھا جی میں اس سے ملیے تو کیا کیا نہ کہیے میرؔ
پر کچھ کہا گیا نہ غمِ دل حیا سے آج

چ
۱۵۵

جی سدا ان ابروؤں ہی میں رہا — کی بسر ہم عمر تلواروں کے بیچ
چشم ہو تو آئینہ خانہ ہے دہر — منہ نظر آتا ہے دیواروں کے بیچ
ہیں عناصر کی یہ صورت بازیاں — شعبدے کیا کیا ہیں ان چاروں کے بیچ
جب سے لے نکلا ہے تو یہ جنسِ حسن — پڑ گئی ہے دھوم بازاروں کے بیچ
جو سرشک اس ماہ بن جھمکے ہے شب — وہ چمک کاہے کو ہے تاروں کے بیچ
اُس کے آتش ناک رخساروں بغیر — لوٹیے یوں کب تک انگاروں کے بیچ

یاروِ مت اس کا فریبِ مہر کھاؤ
میرؔ بھی تھے اس کے ہی یاروں کے بیچ

۱۵۰

سب ہوئے نادم پئے تدبیر ہو جاناں سمیت — تیر تو نکلا مرے سینے سے لیکن جاں سمیت
تنگ ہو جاوے گا عرصہ خفتگانِ خاک پر — گر ہمیں زیر زمیں سونپا دل نالاں سمیت

باغ کر دکھلائیں گے دامانِ دشتِ حشر کو
ہم بھی واں آئے اگر مژگانِ خوں افشاں سمیت

۱۵۱

پلکوں پہ تھے پارۂ جگر رات — ہم آنکھوں میں لے گئے بسر رات
اک دن تو وفا بھی کرتے وعدہ — گزری ہے امیدوار ہر رات
مکھڑے سے اٹھائیں ان نے زلفیں — جانا بھی نہ ہم گئی کدھر رات
تو پاس نہیں ہوا تو روتے — رہ رہ گئی ہے! سر بسر رات
صحبت یہ رہی کہ شمع روتی — لے شام سے تا دم سحر رات
دن وصل کا یوں کٹا کہے تو — کاٹے ہے جدائی کی مگر رات
کل تھی شبِ وصل، اک ادا پر — ق — اس کی، گئے ہوتے ہم تو مر رات
جاگے تھے ہمارے بختِ خفتہ — پہنچا تھا بہم وہ اپنے گھر رات
کرنے لگا پشت چشمِ نازک — سوتے سے اٹھا جو چونک کر رات
تھی صبح جو منہ کو کھول دیتا — ہر چند کہ تب تھی اک پہر رات

پر زلفوں میں منہ چھپا کے پوچھا
اب ہووے گی میرؔ کس قدر رات

۱۵۲

جی میں ہے یادِ رخ و زلفِ سیہ فام بہت — رونا آتا ہے مجھے ہر سحر و شام بہت
دستِ صیاد تلک بھی نہ میں پہنچا جیتا — بے قراری نے لیا مجھ کو تہِ دام بہت
ایک دو چشمک ادھر گردشِ ساغر کہ مدام — سر چڑھی رہتی ہے یہ گردشِ ایام بہت
دل خراشی و جگر چاکی و خون افشانی — ہوں تو ناکام یہ رہتے ہیں مجھے کام بہت

پھر نہ آئے جو ہوئے خاک میں جا آسودہ
غالباً زیر زمیں میرؔ ہے آرام بہت

د

۱۶۱

کیا ہے یہ جو گاہے آجاتی ہے آندھی کوئی زرد — یا بگولا جو کوئی سر کھینچے ہے صحرا نورد
وجہِ دم سردی نہیں میں جانتا رونے کے بعد — مینھ برسا ہے کہیں شاید، ہوا آتی ہے سرد

۱۶۲

آوے گی میری قبر سے آواز میرے بعد — ابھریں گے عشقِ دل سے ترے راز میرے بعد
شمعِ مزار اور یہ سوزِ جگر مرا — ہر شب کریں گے زندگی ناساز میرے بعد
کرتا ہوں میں جو نالے سرانجام باغ میں — منھ دیکھو پھر کریں گے ہم آواز میرے بعد
حسرت ہے اس کے دیکھنے کی دل میں بے قیاس — اغلب کہ میری آنکھیں رہیں باز میرے بعد
بن گل موا ہی میں تو پہ تُو جا کے لوٹیو — صحنِ چمن میں اے پرِ پرواز میرے بعد

بیٹھا ہوں میرؔ مرنے کو اپنے میں مستعد
پیدا نہ ہوں گے مجھ سے بھی جاں باز میرے بعد

۱۶۳

نہ پڑھا خط کو یا پڑھا قاصد — آخرِ کار کیا کہا قاصد
اب غرض خامشی ہی بہتر ہے — کیا کہوں تجھ سے ماجرا قاصد

ہے طلسمات اس کا کوچہ تو
جو گیا سو وہیں رہا قاصد

۱۶۴

ہوں رہگذر میں تیرے ہر نقشِ پا ہے شاہد — اُڑتی ہے خاک میری بادِ صبا ہے شاہد
شرمندۂ اثر کچھ باطن مرا نہیں ہے — وقتِ سحر ہے شاہد، دستِ دعا ہے شاہد

نالے میں اپنے پنہاں میں بھی ہوں ساتھ تیرے
شاہد ہے گردِ محمل، شورِ درا ہے شاہد

۱۶۵

اے گُل نو دمیدہ کی مانند — ہے تُو کس آفریدہ کی مانند
ہم امیدِ وفا پہ تیرے ہوئے — غنچۂ دیر چیدہ کی مانند

۱۵۶

چشم بد دور کہ کچھ رنگ ہے اب گریہ پر خون جھمکے ہے پڑا دیدۂ گریاں کے بیچ
حال گلزارِ زمانہ کا ہے جیسے کہ شفق رنگ کچھ اور ہی ہو جائے ہے اک آن کے بیچ

۱۵۷

حرف زن مت ہو کسی سے تو کہ اے آفت شہر
جاتے رہتے ہیں ہزاروں کے سر اک بات کے بیچ
میری طاعت کو قبول، آہ کہاں تک ہوگا
سبحہ اک ہاتھ میں ہے جام ہے اک ہات کے بیچ
ق
تاب و طاقت کو تو رخصت ہوئے مدت گذری
پند گو، یوں ہی نہ کر اب خلل اوقات کے بیچ
زندگی کس کے بھروسے پہ محبت میں کریں
ایک دل غم زدہ ہے سو بھی ہے آفات کے بیچ

۱۵۸

ساتھ ہو اک بے کسی کے عالم ہستی کے بیچ
باز خواہِ خوں ہے میرا گو اسی بستی کے بیچ

ح

۱۵۹

فتنہ اٹھے گا ورنہ نکل گھر سے تو شتاب بیٹھے ہیں آ کے طالب دیدار بے طرح
لوہو میں شور بور ہے دامان و جیب میر بپھرا ہے آج دیدۂ خوں بار بے طرح

۱۶۰

سب طرح جیس اس کی اپنی نظر میں تھیں کیا اور کہیں پر ہم بھی ہو گئے ہیں گرفتار ایک طرح
گر گل ہے گاہ رنگ گہے باغ کی ہے بو ق آتا نہیں نظر وہ طرح دار ایک طرح
نیرنگ حسن دوست سے کر آنکھیں آشنا
ممکن نہیں وگرنہ ہو دیدار ایک طرح

آتی ہی پوچھیو تو بلا اپنے سر صبا — وے مشک فام زلفیں پریشاں ہوئیں اگر
کیا جانوں کس کے تئیں بخنداں کہے ہے خلق — میں نے جو آنکھیں کھول کے دیکھیں سو چشم تر
اے سیل ٹک سنبھل کے قدم بادیے میں رکھ — ہر سمت کو ہے تشنہ لبی کو مری نظر

کرتا ہے کون منع کہ سج اپنی تو نہ دیکھ
لیکن کبھی تو میر کے کر حال پر نظر

۱۶۹

نہ ہو ہرزہ درا اتنا، خموشی اے جرس بہتر — نہیں اس قافلے میں اہل دل ضبطِ نفس بہتر
سدا ہو خار خارِ باغباں گل کا جہاں مانع — سمجھ اے عندلیب اس باغ سے کنجِ قفس بہتر

۱۷۰

دیکھوں میں اپنی آنکھوں سے آوے مجھے قرار — اے انتظار تجھ کو کسی کا ہو انتظار
کیا زمزمہ کروں ہوں خوشی تجھ سے ہم صفیر — آیا جو میں چمن میں تو جاتی رہی بہار
کس ڈھب سے راہِ عشق چلوں ہے یہ ڈر مجھے — پھوٹیں کہیں نہ آبلے ٹوٹیں کہیں نہ خار

کوچے کی اس کے راہ نہ بتلائی بعد مرگ
دل میں صبا رکھے تھی مری خاک سے غبار

۱۷۱

سفر ہستی کا مت کر سرسری جوں بادا اے رہرو
یہ سب خاک آدمی تھے ہر قدم پر ٹک تامل کر

نہ وعدہ تیرے آنے کا نہ کچھ امید طالع سے
دلِ بے تاب کو کس منھ سے کہیے ٹک تحمّل کر

تجلی جلوہ ہیں کچھ بام و درِ غم خانے کے میرے
وہ رشکِ ماہ آیا ہم نشیں بس اب دیا گُل کر

تری خاموشی سے قمری ہوا شور جنوں رسوا
ہلا ٹک طوق گردن کو بھی ظالم باغ میں غل کر

گداز عاشقی کا میر کے شب ذکر آیا تھا
جو دیکھا شمع مجلس کو تو پانی ہو گئی گھل کر

خاک کو میری کر کے سیر پھرا　　وہ غزال رمیدہ کی مانند
سر اٹھاتے ہی ہو گئے پامال　　سبزۂ نودمیدہ کی مانند
نہ کٹے رات ہجر کی جو نہ ہو　　نالہ تیغ کشیدہ کی مانند
ہم گرفتار حال ہیں اپنے　　طائر پر بریدہ کی مانند
دل تڑپتا ہے اشک خونیں میں　　صید در خوں تپیدہ کی مانند
میر صاحب بھی اس کے ہاں تھے لیک
بندۂ زر خریدہ کی مانند

۱۶۶

قفس تو یاں سے گئے پر مُدام ہے صیاد　　چمن کی صبح کوئی دم کو شام ہے صیاد
بہت ہیں ہاتھ ہی تیرے نہ کر قفس کی فکر　　مرا تو کام انھیں میں تمام ہے صیاد
چمن میں میں نہیں ایسا پھنسا کہ یوں چھوٹوں　　مجھے تو ہر رگ گل تار دام ہے صیاد
یہی گلوں کو تنک دیکھوں اتنی مہلت ہو
چمن میں اور تو کیا مجھ کو کام ہے صیاد

۱۶۷

میرے سنگ مزار پر صیاد　　رکھ کے تیشہ کہے ہے یا اُستاد
موند آنکھیں سفر عدم کا کر　　بس ہے دیکھا نہ عالم ایجاد
خاک بھی سر پہ ڈالنے کو نہیں　　کس خرابے میں ہم ہوئے آباد
سنتے ہو ٹک سنو کہ پھر مجھ بعد　　نہ سنو گے یہ نالہ و فریاد
لگتی ہے کچھ سموم سی تو نسیم　　خاک کس دل جلے کی کی برباد
ہر طرف ہیں اسیر ہم آواز　　باغ ہے گھر ترا تو اے صیاد
نہیں صورت پذیر نقش اس کا
یوں ہی تصدیع کھینچے ہے بہزاد

ر

۱۶۸

ہم تو اسیر کنج قفس ہو کے مر چلے　　اے اشتیاقِ سیرِ چمن تیری کیا خبر

حاصل دو جہان ہے یک حرف ہو مری جان آ گئے تم مختار
میر صاحب زمانہ نازک ہے
دونوں ہاتھوں سے تھامئے دستار۔

۱۷۵

لبوں پر ہے ہر لحظہ آہِ شرربار جَلا ہی پڑا ہے ہمارا تو گھربار
ہوئیں کس ستم دیدہ کے پاس یکجا نگاہیں شرر ریز پلکیں جگربار
کہو کوئی دیکھے اسے سیر کیونکر کہ ہے اس تنِ نازک او پر بار
مرے نخل ماتم پہ ہے سنگ باری نہایت کو لایا عجب یہ شجر بار
یہ آنکھیں گئیں ایسی ہو کر دُرافشاں
کہ دیکھے سے آیا ترا ابرِ گہربار۔

۱۷۶

غصّے سے اٹھ چلے ہو تو دامن کو جھاڑ کر جاتے رہیں گے ہم بھی گریبان پھاڑ کر
دل وہ نگر نہیں کہ پھر آباد ہو سکے پچھتاؤ گے سنو ہو یہ بستی اُجاڑ کر
یارب رہِ طلب میں کوئی کب تلک پھرے
تسکین دے کہ بیٹھ رہوں پاؤں گاڑ کر

۱۷۷

افسوس وے کہ منتظر اک عمر تک رہے پھر مر گئے ترے تئیں یک بار دیکھ کر
دیکھیں جدھر وہ رشکِ پری پیشِ چشم ہے حیران رہ گئے ہیں یہ اسرار دیکھ کر
جاتا ہے آسماں لیے کوچے سے یار کے آتا ہے جی بھرا درودیوار دیکھ کر
جی میں تھا اس سے ملیے تو کیا کیا نہ کہیے میر
پر جب ملے تو رہ گئے ناچار دیکھ کر

۱۷۸

دیکھو نہ چشمِ کم سے معمورۂ جہاں کو بنتا ہے ایک گھریاں صورتیں بگڑ کر
اس پشتِ لب کے او پر دانے عرق کے یوں ہیں یاقوت سے رکھے ہیں جوں موتیوں کو جڑ کر

۱۷۲

کر رحم ٹک کب تک ستم مجھ پر جفا کار اس قدر
یک سینہ خنجر سیکڑوں یک جان و آزار اس قدر ۔

منزل پہنچنا یک طرف، نے صبر ہے نے ہے سکوں
یکسر قدم میں آبلے پھر راہ پُر خار اس قدر ۔

۱۷۳

قیامت تھا سماں اس خشمگیں پر — کہ تلواریں چلیں ابرو کی چیں پر
نہ دیکھا آخر اس آئینہ رو کو — نظر سے بھی نگاہِ واپسیں پر
گئے دن عجز و نالہ کے کہ اب ہے — دماغ نالہ چرخِ ہفتمیں پر
ہوا ہے ہاتھ گل دستہ ہمارا — کہ داغ خوں بہت ہے آستیں پر
خدا جانے کہ کیا خواہش ہے جی کو ق — نظر اپنی نہیں ہے مہر و کیں پر
پرافشانی قفس ہی کی بہت ہے — کہ پرواز چمن قابل نہیں پر
جگر میں اپنے باقی روتے روتے ق — اگرچہ کچھ نہیں اے ہمنشیں پر
کبھو جو آنکھ سے چلتے ہیں آنسو — تو بھر جاتا ہے پانی سب زمیں پر

قدم دشت محبت میں نہ رکھ میرؔ
کہ سر جاتا ہے گامِ اولیں پر

۱۷۴

کیوں نہ ہو ضعف غالب اعضا پر — مر گئے ہیں قشون کے سردار
سینکڑوں حرف ہیں گرہ دل میں — پر کہاں پایئے لب اظہار
سیر کر دشت عشق کا گلشن — غنچے ہو ہو رہے ہیں سو سو خار
روز محشر ہے رات ہجراں کی — ایسی ہم زندگی سے ہیں بیزار
شکر کر داغِ دل کا اے غافل — کس کو دیتے ہیں دیدۂ بیدار
آ زیارت کو قبرِ عاشق پر ق — اک طرح کا ہے یاں بھی جوش بہار
نکلے ہے میری خاک سے نرگس — یعنی اب تک ہے حسرتِ دیدار
جی میں آوے سو کیجیو پیارے — لیک ہو جیو نہ درپے آزار

مشت خاک اپنی جو پامال ہے یاں اس پہ نہ جا — سر کو کھینچے گا فلک تک یہ غبار آخر کار

چشم وا دیکھ کے اس باغ میں کیجو نرگس
آنکھوں سے جاتی رہے گی یہ بہار آخر کار

۱۸۴

دل سے میرے شکستیں اچھی ہیں — سنگ باراں ہے آبگینے پر
جور دلبر سے کیا ہوں آزردہ — میر اس چار دن کے جینے پر

۱۸۵

دشت کش نالہ پیش رو گریہ — آہ چلتی ہے یاں علم لے کر
مرگ اک ماندگی کا وقفہ ہے — یعنی آگے چلیں گے دم لے کر
بارہا صید گہ سے اس کی گئے — داغ یاس آہوے حرم لے کر

ضعف یاں تک کھنچا کہ صورت گر
رہ گئے ہاتھ میں قلم لے کر

۱۸۶

ڈوبے اچھلے ہے آفتاب ہنوز — کہیں دیکھا تھا تجھ کو دریا پر
گر وے ہوں آوٗ شیخ شہر — ابر جھوما ہی جا ہے صحرا پر
یاں جہاں میں کہ شہر کوراں ہے — سات پردے ہیں چشم بینا پر
طارمِ تاک سے لہو ٹپکا — سنگ باراں ہوا مینا پر

میر کیا بات اس کے ہونٹوں کی
جینا دو بھر ہوا مسیحا پر

۱۸۷

وے لوگ تم نے ایک ہی شوخی میں کھو دیے — پیدا کیے تھے چرخ نے جو خاک چھان کر
جھلکے دکھا کے باعث ہنگامہ ہی رہے — پھر گھر سے در پہ آئے نہ تم بات مان کر
کہتے نہ تھے کہ جان سے جاتے رہیں گے ہم — اچھا نہیں ہے آ، نہ ہمیں امتحان کر

افسانے ما و من کے سنیں میر کب تلک
چل اب کہ سو رہیں منھ پہ دوپٹے کو تان کر

۱۷۹

وہ تنگ پوش اک دن دامن کشاں گیا تھا ۔ رکھی ہیں جانمازیں اہل ورع نے تہ کر
کیا قصرِ دل کی تم سے ویرانی نقل کریے ۔ ہو ہو گئے ہیں ٹیلے سارے مکان ڈھ کر
برسوں عذاب دیکھے قرنوں تعب اٹھائے ۔ یہ دل حزیں ہوا ہے کیا کیا جفائیں سہہ کر
ایکوں کی کھال کھینچی، ایکوں کو دار کھینچا
اسرار عاشقی کا پچھتائے یار کہہ کر

۱۸۰

وعدے برسوں کے کن نے دیکھے ہیں ۔ دم میں عاشق کا حال ہے کچھ اور
سہل مت بوجھ یہ طلسمِ جہاں ۔ ہر جگہ یاں خیال ہے کچھ اور
تو رگِ جاں سمجھتی ہوگی نسیم ۔ اس کے گیسو کا بال ہے کچھ اور
نہ ملیں گو کہ ہجر میں مر جائیں ۔ عاشقوں کا وصال ہے کچھ اور
میر تلوار چلتی ہے تو چلے
خوش خراموں کی چال ہے کچھ اور

۱۸۱

شکوۂ آبلہ ابھی سے میر
ہے پیارے ہنوز دلی دور

۱۸۲

اس روئے آتشیں سے برقع سرک گیا تھا ۔ گل بہہ گیا چمن میں خجلت سے آب ہو کر
کل رات مند گئی تھیں بہتوں کی آنکھیں غش سے ۔ دیکھا کیا نہ کر تو سرمست خواب ہو کر
پردہ رہے گا کیوں کر خورشید خاوری کا ۔ نکلے ہے صبح وہ بھی اب بے نقاب ہو کر
یک قطرہ آب میں نے اس دور میں پیا ہے
نکلا ہے چشم تر سے وہ خونِ ناب ہو کر

۱۸۳

رہنے کا پاس نہیں ایک بھی تار آخر کار ۔ ہاتھ سے جائے گا سر رشتۂ کار آخر کار

کوئی تو آبلہ پا دشت جنوں سے گزرا
ڈوبا ہی جائے ہے لہو میں سرِ خار ہنوز

منتظر قتل کے وعدے کا ہوں اپنے یعنی
جیتا مرنے کو رہا ہے یہ گنہ گار ہنوز

اڑ گئے خاک ہو کتنے ہی ترے کوچے سے
باز آتے نہیں پر تیرے ہوادار ہنوز

میر کو ضعف میں میں دیکھ کہا کچھ کہیے ق
ہے تجھے کوئی گھڑی قوت گفتار ہنوز

ابھی اک دم میں زباں چلنے سے رہ جاتی ہے
درد دل کیوں نہیں کرتا ہے تو اظہار ہنوز

آنسو بھر لا کے بہت حزن سے یہ کہنے لگا
کیا کہوں تجھ کو سمجھ اس پہ نہیں یار ہنوز

آنکھوں میں آن رہا جی جو نکلتا ہی نہیں
دل میں میرے ہے گرہ حسرت دیدار ہنوز

س

۱۹۲

اے ابر تر تو اور کسی سمت کو برس
اس ملک میں ہماری ہے یہ چشم تر ہی بس

حیراں تو دیکھ پھول بکھیرے تھی کل صبا
اک برگ گل گرا نہ جہاں تھا مرا قفس

مژگاں بھی بہہ گئیں مرے رونے سے چشم کی
سیلاب موج مارے تو ٹھہرے ہے کوئی خس

مجنوں کا دل ہوں محمل لیلیٰ سے ہوں جدا
تنہا پھروں ہوں دشت میں جوں نالۂ جرس

اے گریہ اس کے دل میں اثر خوب ہی کیا
روتا ہوں جب میں سامنے اس کے تو دے ہے ہنس

حیراں ہوں میر نزع میں اب کیا کروں بھلا
احوال دل بہت ہے مجھے فرصت اک نفس

۱۹۳

کیونکر نکلا جائے بحر غم سے مجھ بے دل کے پاس
آ کے ڈوبی جاتی ہے کشتی مری ساحل کے پاس

ہے پریشاں دشت میں کس کا غبار ناتواں
گرد کچھ گستاخ آتی ہے چلی محمل کے پاس

گرم ہو گا حشر کو ہنگامہ دعوے بہت
کاش کے مجھ کو نہ لے جاویں مرے قاتل کے پاس

بوے خوں آتی ہے باد صبح گاہی سے مجھے
نکلی ہے بے درد شاید ہو کسو گھائل کے پاس

۱۸۸

حاصل بجز کدورت اس خاک داں سے کیا ہے   خوش وہ کہ اٹھ گئے ہیں داماں جھٹک جھٹک کر
ٹک منھ سے اس کے دی شب برقع سرک گیا تھا   جاتی رہی نظر سے مہتاب سی چھٹک کر

منزل کی میرؔ اس کی کب راہ تجھ سے نکلے
یاں خضر سے ہزاروں مر مر گئے بھٹک کر

ز

۱۸۹

ہوتا نہیں ہے باب اجابت کا وا ہنوز   بسمل پڑی ہے چرخ پہ میری دعا ہنوز
غنچے چمن چمن کھلے اس باغ دہر میں   دل ہی مرا ہے جو نہیں ہوتا ہے وا ہنوز
احوال نامہ بر سے مرا سن کے کہہ اٹھا   جیتا ہے وہ ستم زدہ مہجور کیا ہنوز
غنچہ نہ بوجھ دل ہے کسی مجھ سے زار کا   کھلتا نہیں جو سعی سے تیری صبا ہنوز
توڑا تھا کس کا شیشۂ دل تو نے سنگدل   ہے دل خراش کوچے میں ترے صدا ہنوز
چلو میں اس کے میرا لہو تھا سو پی چکا   اڑتا نہیں ہے طائر رنگ حنا ہنوز

بے بال و پر اسیر ہوں کنج قفس میں میرؔ
جاتی نہیں ہے سر سے چمن کی ہوا ہنوز

۱۹۰

ضبط کرتا نہیں کنارہ ہنوز   ہے گریبان پارہ پارہ ہنوز
آتش دل نہیں بجھی شاید   قطرۂ عشق ہے شرارہ ہنوز
اشک جھمکا ہے جب نہ نکلا تھا   چرخ پر صبح کا ستارہ ہنوز

لب پہ آئی ہے جان کب کی ہے
اُس کی موقوفِ یک اشارہ ہنوز

۱۹۱

مر گیا میں پہ مرے باقی ہیں آثار ہنوز   تر ہیں سب سر کے لہو سے در و دیوار ہنوز
بارہا چل چکی تلوار تری چال پہ شوخ   تو نہیں چھوڑتا اس طرز کی رفتار ہنوز

ف

۱۹۸

ایک دن میں نے لکھا تھا اس کو اپنا دردِ دل
آج تک جاتا نہیں سینے سے خامے کے شگاف

۱۹۹

غالب ہے ترے عہد میں بے داد کی طرف	پر خوں گرفتہ جائیے ہے جلّاد کی طرف
ہم نے تو پر افشانی نہ جانی کہ ایک بار	پرواز کی چمن سے سو صیّاد کی طرف

۲۰۰

جو دیکھو مرے شعرِ تر کی طرف	تو مائل نہ ہو پھر گہر کی طرف
محبت نے شاید کہ دی دل کو آگ	دھواں سا ہے کچھ اس نگر کی طرف
لگی ہیں ہزاروں ہی آنکھیں ادھر	اک آشوب ہے اس کے گھر کی طرف
بہت رنگ ملتا ہے دیکھو کبھو
ہماری طرف سے سحر کی طرف

ق

۲۰۱

درد ہی خود ہے، خود دوا ہے عشق
شیخ کیا جانے تو کہ کیا ہے عشق

ک

۲۰۲

تنہا تو اپنی گور میں رہنے پہ بعد مرگ
مت اضطراب کریو کہ عالم ہے زیرِ خاک

۲۰۳

اب وہ نہیں کہ شورش رہتی تھی آسماں تک	آشوبِ نالہ اب تو پہنچا ہے لامکاں تک
تصویر کی سی شمعیں خاموش جلتے ہیں ہم	سوزِ دروں ہمارا آتا نہیں زباں تک

۱۹۴

رخصت سیرِ باغ تک نہ ہوئی
یوں ہی جاتی رہی بہار افسوس

ش

۱۹۵

ہر جزر و مد سے دست و بغل اٹھتے ہیں خروش — کس کا ہے رازِ بحر میں یارب کہ یہ ہیں جوش
ابرو سے کج ہے موج کوئی چشم ہے حباب — موتی کسی کی بات ہے سیپی کسی کا گوش
حیرت سے ہووے پرتوِ مہ نورِ آئینہ — تو چاندنی میں نکلے اگر ہو سفید پوش
کل ہم نے سیرِ باغ میں دل ہاتھ سے دیا — ق — اک سادہ گل فروش کا آ کر سبد بدوش
جاتا رہا نگاہ سے جوں موسمِ بہار — آج اس بغیر داغِ جگر ہیں سیاہ پوش
شب اس دل گرفتہ کو وا کر بزورِ مے — ق — بیٹھے تھے شیرہ خانے میں ہم کتنے ہرزہ کوش
آئی صدا کہ یاد کرو دورِ رفتہ کو — عبرت بھی ہے ضرور ٹک اے جمعِ تیز ہوش
جمشید جس نے وضع کیا جام، کیا ہوا — وے صحبتیں کہاں گئیں کیدھر وہ ناؤ نوش
جُز لالہ اُس کے نام سے پاتے نہیں نشاں — ہے کوکنار اس کی جگہ اب سبو بدوش

جھومے ہے بید جائے جوانانِ مے گسار
بالائے خم ہے خشتِ سرِ پیرِ مے فروش

ط

۱۹۶

سب سے آئینہ نمط رکھتے ہیں خوباں اختلاط
ہوتے ہیں یہ لوگ بھی کتنے پریشاں اختلاط

غ

۱۹۷

فروغ کچھ نہیں دعوے کو صبحِ صادق کے
شبِ فراق کو کب ہے سحر دروغ دروغ

دور پھرنے کا ہم سے وقت گیا — پوچھ کچھ حال بیٹھ کر نزدیک
مر بھی رہ میر شب بہت رویا
ہے مری جان اب سحر نزدیک

۲۰۸

کہیں پہنچو بھی مجھ بے پا و سر تک — کہ پہنچا شمع سا داغ اب جگر تک
کچھ اپنی آنکھ میں یاں کا نہ آیا — خزف سے لے کے دیکھا دُرِّ تر تک
جسے شب آگ سا دیکھا سُلگتے — اُسے پھر خاک ہی پایا سحر تک
ترا منہ چاند سا دیکھا ہے شاید — کہ انجم رہتے ہیں ہر شب ادھر تک
کھینچی کیا کیا خرابی زیرِ دیوار — ولے آیا نہ وہ ٹک گھر سے در تک
گلی تک تیری لایا تھا ہمیں شوق — کہاں طاقت کہ اب پھر جائیں گھر تک
کہاں پھر شور شیون جب گیا میر
یہ ہنگامہ ہے اُس ہی نوحہ گر تک

۲۰۹

کعبہ پہنچا تو کیا ہوا اے شیخ — سعی کر ٹک پہنچ کسی دل تک
در پئے محمل اس کے جیسے جرس — میں بھی نالاں ہوں ساتھ منزل تک
بجھ گئے ہم چراغ سے باہر — کہیو اے باد، شمع محفل تک
نہ گیا میر اپنی کشتی سے
ایک بھی تختہ پارہ ساحل تک

۲۱۰

جاتے ہیں بے خرابی کو سیل آسماں تلک — طوفاں ہے میرے اشکِ ندامت سے یاں تلک
شاید کہ دیوے رخصت گلشن ہوں بے قرار — میرے قفس کو لے تو چلو باغباں تلک
اتنا ہوں ناتواں کہ دردِ دل سے اب گلہ
آتا ہے ایک عمر میں میری زباں تلک

۲۱۱

کب دسترس ہے لعل کو تیرے سخن تلک — رسوائیاں گئی ہیں عقیق یمن تلک

روتے پھرے ہیں لو ہو، یک عمر اس گلی میں — باغ و بہار ہی ہے جاوے نظر جہاں تک
آنکھیں جو روتے روتے جاتی رہیں بجا ہے — انصاف کر کہ کوئی دیکھے ستم کہاں تک
بے لطف ترے کیونکر تجھ تک پہنچ سکیں ہم
ہیں سنگِ راہ اپنی کتنے یہاں سے واں تک

۲۰۴

ہے بعد مرے مرگ کے آثار سے اب تک — سوکھا نہیں لو ہو در و دیوار سے اب تک
رنگینیٔ عشق اس کی ملے پر ہوئی معلوم — صحبت نہ ہوئی تھی کسی خونخوار سے اب تک
مدت ہوئی گھٹ گھٹ کے ہمیں شہر میں مرتے — واقف نہ ہوا کوئی اس اسرار سے اب تک
برسوں ہوئے دل سوختہ بلبل کو موئے لیک — اک دُود سا اُٹھتا ہے چمن زار سے اب تک
کیا جانیے ہوتے ہیں سخن لطف کے کیسے — پوچھا نہیں ان نے تو ہمیں پیار سے اب تک
اس باغ میں اغلب ہے کہ سرزد نہ ہوا ہو
یوں نالہ کسو مرغِ گرفتار سے اب تک

۲۰۵

میرِ گم کردہ چمن زمزمہ پرواز ہے ایک — جس کی لے دام سے تا گوشِ گل آواز ہے ایک
کچھ ہوا اے مرغِ قفس لطف نہ جاوے اُس سے — نوحہ یا نالہ ہر اک بات کا انداز ہے ایک
ناتوانی سے نہیں بال فشانی کا دماغ — ورنہ تا باغ قفس سے مری پرواز ہے ایک
گوش کو ہوش ٹک کھول کے سن شورِ جہاں — سب کی آواز کے پردے میں سخن ساز ہے ایک
چاہے جس شکل سے تمثال صفت اُس میں درآ
عالم آئینے کے مانند درِ باز ہے ایک

۲۰۶

شب کوتہ اور قصّہ مری جان کا دراز
القصہ اب کہا کروں تجھ ہیں کب تلک

۲۰۷

ڈوبیں دریا و کوہ و شہر و دشت — تجھ سے سب کچھ ہے چشمِ تر نزدیک
دور اب بیٹھتے ہیں مجلس میں — ہم جو تم سے تھے بیش تر نزدیک

۲۱۵

کیسا چمن اسیری میں کس کو ادھر خیال — پرواز خواب ہو گئی ہے بال و پر خیال
مشکل ہے مٹ گئے ہوئے نقشوں کی پھر نمود — جو صورتیں بگڑ گئیں ان کا نہ کر خیال
رخسار پر ہمارے ڈھلکنے کو اشک کے — دیکھے ہے جو کوئی سو کرے ہے گہر خیال
کس کو دماغ شعر و سخن ضعف میں کہ میر
اپنا رہے ہے اب تو ہمیں بیش تر خیال

۲۱۶

سیر کر عندلیب کا احوال — ہیں پریشاں چمن میں کچھ پر و بال
سبزۂ نورستہ رہ گزار کا ہوں — سر اُٹھایا کہ ہو گیا پامال
کیوں نہ دیکھوں چمن کو حسرت سے — آشیاں تھا مرا بھی یاں پر سال
دیدۂ تر پہ شب رکھا تھا میر
لکۂ ابر ہے مرا رومال

۲۱۷

جانیں ہیں فرش رہ تری مت حال حال چل — اے رشکِ خور آدمیوں کی سی چال چل
اک آن میں بدلتی ہے صورت جہاں کی — جلد اس نگار خانے سے کر انتقال چل
سالک بہر طریق بدن ہے وبالِ جان
یہ بوجھ تیرے ساتھ جو ہے اس کو ڈال چل

۲۱۸

شرط یا بریں ہے کہ رو دیں گے کل — صبح گر اٹھتے ہی عالم کو ڈبو دیں گے کل
آج آوارہ ہوا ہے بال اسیرانِ قفس — یہ گل و باغ و خیابان نہ ہو دیں گے کل
وعدہ وصل رہا ہے شب آئندہ پہ میر
بخت خوابیدہ جو ٹک جاگتے سو دیں گے کل

۲۱۹

اس مہلت دو روزہ میں خطرے ہزار ہیں — اچھا ہے رہ سکو جو خبردار آج کل

آزادگی یہ چھوڑ قفس ہم نہ جا سکے
حسن سلوکِ ضعف سے صحن چمن تلک

گ

۲۱۲

بات ائل کی چل ہی جاتی ہے
ہے مگر عوج بن عنق کی ٹانگ

بن جو کچھ بن سکے جوانی میں
رات تو تھوڑی ہے بہت ہے سانگ

عشق کا شور کوئی چھپتا ہے
نالۂ عندلیب ہے گل بانگ

کس طرح کوئی ان سے گرم ملے
سیم تن پگھلے جاتے ہیں جوں رانگ

میں نے کیا اس غزل کو سہل کہا
قافیے ہی تھے اس کے اوٹ پٹانگ

ل

۲۱۳

فصل خزاں میں سیر جو کی ہم نے جائے گل
چھانی چمن کی خاک نہ تھا نقش پائے گل

اللہ رے عندلیب کی آواز دل خراش
جی ہی نکل گیا جو کہا اُن نے ہائے گل

آ عندلیب صلح کریں جنگ ہو چکی
لے اے زباں دراز تو سب کچھ سوائے گل

بارے سرشک سرخ کے داغوں سے رات کو
بستر پہ اپنے سوئے تھے ہم بھی بچھائے گل

۲۱۴

کر سیر جذب الفت گل چیں نے کل چمن میں
توڑا تھا شاخ گل کو نکلی صدائے بلبل

کھٹکے ہیں خار ہو کر ہر شب دلِ چمن میں
اتنے لب و دہن پر یہ نالہائے بلبل

آئی بہار و گلشن گل سے بھرا ہے لیکن
ہر گوشۂ چمن میں خالی ہے جائے بلبل

تعارف کیا رہا اہلِ چمن سے ہوئے اک عمر کے پیچھے رہا ہم
موا جس کے لیے اس کو نہ دیکھا
نہ سمجھے میر کا کچھ مدعا ہم

۲۲

اگر راہ میں اس کی رکھا ہے گام گئے گزرے خضر علیہ السلام
مجھے دیکھ منہ پر پریشاں کی زلف غرض یہ کہ جا تو ہوئی اب تو شام
سرِ شام سے رہتی ہیں کاہشیں ہمیں شوق اس ماہ کا ہے تمام
جہاں میر زیر و زبر ہو گیا
خراماں ہوا تھا وہ محشر خرام

۲۲۶

گرچہ آوارہ جوں صبا ہیں ہم لیک لگ چلنے میں بلا ہیں ہم
کام کیا آتے ہیں گے معلومات یہ تو سمجھے ہی نہ کہ کیا ہیں ہم
اے بتاں! اس قدر جفا ہم پر عاقبت بندۂ خدا ہیں، ہم
سرمہ آلودہ مت رکھا کر چشم دیکھ اس وضع سے خفا ہیں، ہم
کوئی خواہاں نہیں ہمارا میر
گوئیا جنس نارواہیں ہم

۲۲۷

حذر کہ آہِ جگر تفتگاں بلا ہے گرم ہمیشہ آگ ہی برسے ہے یاں ہوا ہے گرم
کہاں ہے تیغ و سپر آفتاب کے بالے وہ سرد مہر ہمارا بھی اب ہوا ہے گرم
گیا جہان سے خورشید ساں اگرچہ میر
ولیک مجلسِ دنیا میں اس کی جا ہے گرم

۲۲۸

کرتے ہیں گفتگو، سحر اٹھ کر صبا سے ہم لڑنے لگے ہیں، ہجر میں اس کے ہوا سے ہم
غافل نہ اپنی دیدہ درائی سے ہم کو جان سب دیکھتے ہیں پر نہیں کہتے حیا سے ہم

گل زار ہو رہے ہے مرے دم سے کوئے یار　　اک رنگ پر ہے دیدۂ خوں بار آج کل

حیران ہیں ہی حال کی تدبیر میں نہیں
ہر اک کو شہر میں ہے یہ آزار آج کل

م

۲۲۰

جرم کیا غیروں کا طالع چشم پوشی کرتے ہیں
دیکھ کر احوال میرا موندلے ہے یار چشم

۲۲۱

جیتے ہیں تو دکھاویں گے دعوائے عندلیب　　گل بن خزاں میں اب کے وہ رہتی ہے یا کہ ہم
اس جستجو میں اور خرابی تو کیا کہیں　　اتنی نہیں ہوئی ہے صبا دربدر کہ ہم

۲۲۲

ہے پیچ دار از بس راہ وصال و ہجراں　　ان ہی دو منزلوں میں برسوں سفر کرو تم
روئے سخن کہاں تک غیروں کی اور آخر　　ہم بھی تو آدمی ہیں ٹک منھ ادھر کرو تم

۲۲۳

آہستہ اے نسیم کہ اطراف باغ کے　　مشتاقِ پرفشانی ہیں اک مشتِ خاک ہم
جوں برق تیرے کوچے سے ہنستے نہیں گئے　　مانند ابر جب اٹھے تب گریہ ناک ہم

مدت ہوئی کہ چاک قفس ہی سے اب تو میرؔ
دکھلا رہے ہیں گل کو دلِ چاک چاک ہم

۲۲۴

نہ پھر رکھیں گے تیری رہ میں پا ہم　　گئے گزرے ہیں آخر ایسے کیا ہم
کھنچے گی کب وہ تیغ باز یا رب　　رہے ہیں دیر سے سر کو جھکا ہم
کہیں پیوند ہوں یا رب زمیں کے　　پھریں گے اُس سے یوں کب تک جدا ہم
کسو آگے کوئی مرتا تھا کسی پر　　جہاں میں کر گئے رسم وفا ہم

ہوئی عید سب نے پہنے طرب و خوشی کے جامے — نہ ہوا کہ ہم بھی بدلیں یہ لباس سوگواراں
خطرِ عظیم میں ہیں مری آہ و اشک سے سب — کہ جہان رہ چکا پھر جو یہی باد و باراں
رکھے تاجِ زر کو سر پر چمنِ زمانہ میں گل — نہ شگفتہ ہو تو اتنا کہ خزاں ہے یہ بہاراں

نہیں تجھ کو چشمِ عبرت یہ نمود میں ہے ورنہ
کہ گئے ہیں خاک میں مل کئی تجھ سے تاجداراں

۲۳۵

متصل روتے ہی رہیے تو بجھے آتشِ دل — ایک دو آنسو تو اور آگ لگا جاتے ہیں
وقت خوش ان کا جو ہم بزم ہیں تیرے ہم تو — در و دیوار کو احوال سنا جاتے ہیں

۲۳۶

اس کے کوچے میں نہ کر شورِ قیامت کا ذکر — شیخ یاں ایسے تو ہنگامے ہوا کرتے ہیں
بے بسی سے تو تری بزم میں ہم بہرے بنے — نیک و بد کوئی کہے بیٹھے سنا کرتے ہیں
رخصتِ جنبشِ لب عشق کی حیرت سے نہیں — مدتیں گزریں کہ ہم چپ ہی رہا کرتے ہیں

تو پری شیشے سے نازک ہے نہ کر دعویٰ مہر
دل ہیں پتھر کے انھوں کے جو وفا کرتے ہیں

۲۳۷

اس گلشنِ دنیا میں شگفتہ نہ ہوا میں — ہوں غنچۂ افسردہ کہ مردودِ صبا ہوں
ہم چشم ہے ہر آبلۂ پا کا میرا اشک — از بس کہ تری راہ میں آنکھوں سے چلا ہوں
دامن نہ جھٹک ہاتھ سے میرے کہ ستم گر — ہوں خاک سرِ راہ کوئی دم میں ہوا ہوں
دل خواہ جلا اب تو مجھے اے شبِ ہجراں — میں سوختہ بھی منتظرِ روزِ جزا ہوں

تب گرمِ سخن کہنے لگا ہوں میں کہ اک عمر
جوں شمع سرِ شام سے تا صبح جلا ہوں

۲۳۸

سہل اس قدر نہیں ہے مشکل پسندی میری
جو تجھ کو دیکھتے ہیں مجھ کو سراہتے ہیں

ں

۲۲۹

بے کلی بے خودی کچھ آج نہیں　　ایک مدت سے وہ مزاج نہیں
درد اگر یہ ہے تو مجھے بس ہے　　اب دوا کی کچھ احتیاج نہیں

۲۳۰

از خویش رفتہ ہر دم فکرِ وصال میں ہوں　　کتنا میں کھویا جاؤں یارب کہ تجھ کو پاؤں
دل تفتگی نے مارا مجھ کو کہاں مژہ دے　　اک قطرۂ آب تا میں اس آگ کو بجھاؤں

۲۳۱

سوزش دل سے مفت گلتے ہیں　　داغ جیسے چراغ جلتے ہیں
بھری آتی ہیں آج یوں آنکھیں　　جیسے دریا کہیں اُبلتے ہیں
دم آخر ہے، بیٹھ جا، مت جا　　صبر کر ٹک کہ ہم بھی چلتے ہیں
نظر اُٹھتی نہیں کہ جب خوباں　　سوتے سے اُٹھ کے آنکھ ملتے ہیں
شمع رو موم کے بنے ہیں مگر
گرم ٹک ملیے تو پگھلتے ہیں

۲۳۲

دوزخ کیا ہے سینہ مرا سوزِ عشق سے　　اس دل جلے ہوئے کے سبب ہوں عذاب میں
مت کر نگاہِ خشم یہی موت ہے مری　　ساقی نہ زہر دے تو، مجھے تو شراب میں

۲۳۳

آوازہ ہی جہاں میں ہمارا سنا کرو　　عنقا کے طور زیست ہے اپنی بنام یاں
غالب یہ ہے کہ موسم خط واں قریب ہے　　آنے لگا ہے متصل اس کا پیام یاں
مت کھا فریبِ عجز عزیزانِ حال کا
پنہاں کیے ہیں خاک میں یاروں نے دام یاں

۲۳۴

نہ گیا خیالِ زلفِ سیہ جفا شعاراں　　نہ ہوا کہ صبح ہووے شبِ تیرہ روزگاراں

خار کو جن نے لڑی موتی کی کر دکھلایا　　اس بیاباں میں وہ آبلہ پا میں ہی ہوں

سنتے ہی ہنس کے، ٹک اک سوچیو کیا تو ہی تھا
جن نے شب رو کے سب احوال کہا، میں ہی ہوں

۲۴۴

پھاڑا ہزار جا سے گریبانِ صبر میرؔ　　کیا کہہ گئی نسیم سحر، گل کے کان میں
غافل نہ رہیو ہم سے کہ ہم وے نہیں رہے　　ہوتا ہے اب تو حال عجب ایک آن میں

۲۴۵

زباں رکھ غنچہ ساں اپنے دہن میں　　بندھی مٹھی چلا جا اس چمن میں
رکھا کر ہاتھ دل پر آہ کرتے　　نہیں رہتا چراغ ایسی پون میں
خردمندی ہوئی زنجیر، ورنہ　　گزرتی خوب تھی دیوانہ پن میں
کہاں عاجز سخن قادر سخن ہوں　　ہمیں ہے شبہ یاروں کے سخن میں

گدازِ عشق میں بہہ بھی گیا میرؔ
یہی دھوکا سا ہے اب پیرہن میں

۲۴۶

کیا تیر ستم اس کے سینے میں بھی ٹوٹے تھے　　جس زخم کو چیروں ہوں پیکان نکلتے ہیں
مت سہل ہمیں جانو پھرتا ہے فلک برسوں　　تب خاک کے پردے سے انسان نکلتے ہیں

ان آئینہ رویوں کے کیا میرؔ بھی عاشق ہیں
جب گھر سے نکلتے ہیں حیران نکلتے ہیں

۲۴۷

ہیں صفا کیا دل اتنا، کہ دکھائی دیوے منھ بھی
وے مفت اس آئینے کو نہیں لیتے خود پسنداں

۲۴۸

کرتا ہے ابر دعویٔ دریا دلی عبث　　دامن نہیں مرا تو مری آستیں نہیں
فکرِ بلند سے میں کیا آسماں اسے　　ہر یک سے میرؔ خوب ہو یہ وہ زمیں نہیں

۲۳۹

تمہیں بھی چاہیے ہے کچھ تو پاس چاہت کا — ہم اپنی اور سے یوں کب تلک نباہ کریں
رکھا ہے اپنے تئیں روک روک کر ورنہ — سیاہ کر دیں زمانے کو ہم جو آہ کریں
بڑی بلا ہیں ستم کشتۂ محبت ہم
جو تیغ برسے تو سر کو نہ کچھ پناہ کریں

۲۴۰

جی انتظار کش ہے آنکھوں میں رہ گذر پر — آجا نظر کہ کب تک میں تیری راہ دیکھوں
آنکھیں جو کھل رہی ہیں مرنے کے بعد میری — حسرت یہ تھی کہ اُس کو میں اک نگاہ دیکھوں
چشم و دل و جگر یہ سارے ہوئے پریشاں
کس کس کی تیرے غم میں حالت تباہ دیکھوں

۲۴۱

چہرے پہ جیسے زخم ہے ناخن کا ہر خراش — اب دیدنی ہوئی ہیں مری دستکاریاں
اب کس کس اپنی خواہش مردہ کو رویئے — تھیں ہم کو اس سے سیکڑوں امیدواریاں
پڑھتے پھریں گے گلیوں میں ان ریختوں کو لوگ — مدت رہیں گی یاد یہ باتیں ہماریاں
کل جانتے تھے ایسے دن آجائیں گے شتاب — روتے گزرتیاں ہیں ہمیں راتیں ساریاں
گل نے ہزار رنگ سخن سر کیا ولے
دل سے گئیں نہ باتیں تری پیاری پیاریاں

۲۴۲

گر کچھ ہو درد آئینہ یوں چرخ زشت میں — ان صورتوں کو صرف کرے خاک و خشت میں
رکھتا ہے سوز عشق سے دوزخ میں روز و شب — لے جائے گا یہ سوختہ دل کیا بہشت میں
آسودہ کیونکہ ہوں میں کہ مانند گرد باد — آوارگی تمام ہے میری سرشت میں
نامے کو چاک کر کے کرے نامہ بر کو قتل
کیا یہ لکھا تھا میر مری سرنوشت میں

۲۴۳

اپنے کوچے میں فغاں جس کی سنو ہو ہر رات — وہ جگر سوختہ و سینہ جلا میں ہی ہوں

تا کے یہ دشت گردی و کب تک یہ خستگی　　اس زندگی سے کچھ تجھے حاصل بھی، مر کہیں
کہنے لگا وہ ہو کے پرآشفتہ یک بہ یک　　مسکن کرے ہے دہر میں مجھ سا بشر کہیں
آوارگوں کا ننگ ہے سننا نصیحتیں　　مت کہیو ایسی بات تو بارِ دگر کہیں
تعیین جا کو بھول گیا ہوں، پہ یہ ہے یاد　　کہتا تھا ایک روز یہ اہل نظر کہیں
بیٹھے اگرچہ نقش ترا تو بھی دل اٹھا　　کرتا ہے جائے باش کوئی رہ گذر کہیں

کتنے ہی آئے لے کے، سر پر خیال، پر
ایسے گئے کہ کچھ نہیں ان کا اثر کہیں

اس بزم کے چراغ بجھے تھے جو یار میر
ان کے فروغ باغ میں گل ہیں کہیں کہیں

۲۵۳

یاد آوے ہے جب شب کو وہ چہرۂ مہتابی
آنسو مری پلکوں سے تارے سے چھٹکتے ہیں

۲۵۴

مانند شمع ہم نے حضور اپنے یار کے　　کار وفا تمام کیا ایک آہ میں
میں صید جو ہوا تو ندامت اسے ہوئی　　یک قطرہ خون بھی نہ گرا صید گاہ میں

۲۵۵

جہاں میں گریہ نہ پہنچا بہم مجھے دل خواہ
پہ نوح کے سے تو طوفاں ہزار لایا ہوں

۲۵۶

جفائیں دیکھ لیاں بے وفائیاں دیکھیں　　بھلا ہوا کہ تری سب برائیاں دیکھیں
ہمیشہ مائل آئینہ ہی تجھے پایا　　جو دیکھیں، ہم نے یہیں خود نمائیاں دیکھیں
شہاں کہ کحل جواہر تھی خاکِ پا جن کی
انھیں کی آنکھوں میں پھرتے سلائیاں دیکھیں

۲۴۹

حسن کلام کھینچے کیوں کر نہ دامنِ دل — اس کام کو ہم آخر محبوب کر چکے ہیں
ہنگامۂ قیامت تازہ نہیں جو ہوگا — ہم اس طرح کے کتنے آشوب کر چکے ہیں

رنگ پریدہ، قاصد، بادِ سحر، کبوتر
کس کس کے ہم حوالے مکتوب کر چکے ہیں

۲۵۰

خورشید و ماہ و گل سبھی اُدھر رہے ہیں دیکھ
اس چہرے کا اک آئینہ حیران ہی نہیں

۲۵۱

ہم آپ ہی کو اپنا مقصود جانتے ہیں — اپنے سوائے کس کو موجود جانتے ہیں
اپنی ہی سیر کرنے ہم جلوہ گر ہوئے تھے — اس رمز کو و لیکن معدود جانتے ہیں

صورت پذیر ہم بن ہرگز نہیں وے معنی
اہلِ نظر ہمیں کو معبود جانتے ہیں

جب بے نقاب منھ پر تب دید کر کہ کیا کیا
در پردہ شوخیاں ہیں پھر بے حجابیاں ہیں

۲۵۲

اب فائدہ سراغ سے بلبل کے باغباں — اطراف باغ ہوں گے پڑے مشتِ پر کہیں
کچھ کچھ کہوں گا، روز یہ کہتا تھا دل میں ہیں — ق — آشفتہ طبع میرؔ کو پایا اگر کہیں
سو کل ملا مجھے وہ بیاباں کی سمت کو — جاتا تھا اضطراب زدہ سا اُدھر کہیں
لگ چل کے میں برنگِ صبا یہ اسے کہا — کاے خانماں خراب ترا بھی ہے گھر کہیں
آشفتہ جا بجا جو پھرے ہے تو دشت میں — جاگہ نہیں ہے شہر میں تجھ کو مگر کہیں
خوں بستہ اپنی کھول مژہ پوچھتا بھی گر — رکھ ٹک تو اپنے حال کو مدِ نظر کہیں
آسودگی سی جنس کو کرتا ہے کون سوخت — جانے ہے نفع کوئی بھی جی کا ضرر کہیں
موتی سے تیرے اشک ہیں غلطاں کسو طرف — یاقوت کے سے ٹکڑے ہیں لختِ جگر کہیں

ایک نے صورت نہ پکڑی پیشِ یار
دل میں شکلیں سیکڑوں ٹھہرائیاں

روکشی کو اس کی منھ بھی چاہیے
ماہ کے چہرے پہ ہیں سب جھائیاں

چل چمن میں یہ بھی ہے کوئی روش
ناز تا کے چند بے پروائیاں

شوقِ قامت میں ترے اے نونہال
گل کی شاخیں لیتی ہیں انگڑائیاں

نونہال آگے ترے ہیں جیسے ہوں
ڈالیاں ٹوٹی ہوئیں مُرجھائیاں

۲۶۱

دیکھیں تو تیری کب تک یہ کج ادائیاں ہیں
اب ہم نے بھی کسو سے آنکھیں لڑائیاں ہیں

آئینہ ہو کے صورت معنی سے ہے لبالب
رازِ نہانِ حق میں کیا خود نمائیاں ہیں

۲۶۲

میں کون ہوں اے ہم نفساں، سوختہ جاں ہوں
اک آگ مرے دل میں ہے جو شعلہ فشاں ہوں

لایا ہے مرا شوق مجھے پردے سے باہر
میں ورنہ وہی خلوتیٔ رازِ نہاں ہوں

جلوہ ہے مجھی سے لبِ دریائے سخن پر
صد رنگ مری موج ہے میں طبعِ رواں ہوں

پنجہ ہے مرا پنجۂ خورشید میں ہر صبح
میں شانہ صفت سایہ روِ زلفِ بتاں ہوں

دیکھا ہے مجھے جن نے سو دیوانہ ہے میرا
میں باعثِ آشفتگیٔ طبعِ جہاں ہوں

تکلیف نہ کر آہ مجھے جنبشِ لب کی
میں صد سخن آغشتہ بہ خوں زیرِ زباں ہوں

ہوں زرد غمِ تازہ نہالانِ چمن سے
اس باغِ خزاں دیدہ میں، میں برگِ خزاں ہوں

رکھتی ہے مجھے خواہشِ دل بسکہ پریشاں
درپے نہ ہو اس وقت خدا جانے کہاں ہوں

اک وہم نہیں بیش مری ہستیٔ موہوم
اس پر بھی تری خاطرِ نازک پہ گراں ہوں

۲۶۳

اب آنکھوں میں خوں دم بدم دیکھتے ہیں
نہ پوچھو جو کچھ رنگ ہم دیکھتے ہیں

گہے داغ رہتا ہے دل گہ جگر خوں
ان آنکھوں سے کیا کیا ستم دیکھتے ہیں

لکھیں حال کیا اس کو حیرت سے ہم تو
گہے کاغذ و گہ قلم دیکھتے ہیں

۲۵۷

خوش قداں جب سوار ہوتے ہیں　　سرو و قمری شکار ہوتے ہیں
ترے بالوں کے وصف میں میرے　　شعر سب پیچ دار ہوتے ہیں

ہفت اقلیم ہر گلی ہے کہیں
دلّی سے بھی دیار ہوتے ہیں

۲۵۸

وے جو حسن و جمال رکھتے ہیں　　سارے تیرا خیال رکھتے ہیں
دہن تنگ کے ترے مشتاق　　آرزوے محال رکھتے ہیں
خاک آدم ہی ہے تمام زمین　　پاؤں کو ہم سنبھال رکھتے ہیں
یہ جو سر کھینچے تو قیامت ہے　　دل کو ہم پائمال رکھتے ہیں
اہل دل چشم سب تری جانب　　آئینے کی مثال رکھتے ہیں

گفتگو ناقصوں سے ہے ورنہ
میرؔ جی بھی کمال رکھتے ہیں

۲۵۹

صبر و طاقت کو کڑھوں یا خوش دلی کا غم کروں
اس میں حیراں ہوں بہت کس کس کا میں ماتم کروں
موسم حیرت ہے دل بھر کر تو رونا مل چکا
اتنے بھی آنسو بہم پہنچیں کہ مژگاں نم کروں
ریزۂ الماس یا مشت نمک ہے کیا برا
جو میں اپنے ایسے زخم سینہ کو مرہم کروں

گو دھواں اٹھنے لگا دل سے مرے پُر پیچ و تاب
میرؔ اس پر قطع ربط زلف خم در خم کروں

۲۶۰

بارہا وعدوں کی راتیں آئیاں　　طالعوں نے صبح کر دکھلائیاں
ایک بھی چشمک نہ اس مہ کی سی ہے　　آنکھیں تاروں نے بہت جھمکائیاں

۲۷۰

کھوویں ہیں نیند میری مصیبت بیانیاں تم بھی تو ایک رات سنو یہ کہانیاں
صحبت رکھا کیا وہ سفیہ و ضلال سے دل ہی میں خوں ہوا کیں مری نکتہ دانیاں
تلوار کے تلے ہی گیا عہد انبساط
مر مر کے ہم نے کاٹی ہیں اپنی جوانیاں

۲۷۱

خوبی کو اس کی ساعد سیمیں کی دیکھ کر صورت گروں نے کھینچ رکھا ہاتھ کے تئیں
ہم جانتے ہیں یا کہ دل آشنا زدہ لکھیے سو کس سے عشق کے حالات کے تئیں

۲۷۲

نہ اک یعقوبؑ رویا اس الم میں کنواں اندھا ہوا یوسفؑ کے غم میں
کہوں کب تک دم آنکھوں میں ہے میری نظر آوے ہی گا اب کوئی دم میں

۲۷۳

ہم تو راہب نہیں ہیں واقف رسم سجدہ ہیں کدھر شیخ حرم کچھ ہمیں ارشاد کریں
ریختہ خوب ہی کہتا ہے جو انصاف کرو چاہیے اہلِ سخن میر کو استاد کریں

۲۷۴

جوئیں رہیں گی جاری گلشن میں اک مدت سائے میں ہر شجر کے ہم زور رو چلے ہیں
پچھتاوے نہ کیونکر جی اس طرح سے دے کر یہ گوہر گرانی ہم مفت کھو چلے ہیں

۲۷۵

بوئے گل اور رنگِ گل دونوں ہیں دلکش اے نسیم لیک بقدر یک نگاہ دیکھیے تو وفا نہیں
چشم سفید و اشک سرخ آہ دل حزیں ہے یاں شیشہ نہیں ہے مے نہیں، ابر نہیں ہوا نہیں
ایک فقط ہے سادگی تس پہ بلائے جاں ہے تو
عشوہ کرشمہ کچھ نہیں آن نہیں ادا نہیں

۲۷۶

کبھو آتے ہیں آپ میں تجھ بن گھر میں ہم میہمان ہوتے ہیں
غمزۂ چشم خوش قداں زمیں فتنۂ آسمان ہوتے ہیں

۲۶۴

دگر نہ خاک ہوئے کتنے ہی محبت میں
کسی کا بھی کہیں مشت غبار پاتے ہیں

۲۶۵

ٹک تو رہ اے بنائے ہستی تو — تجھ کو کیسا خراب کرتا ہوں
جی میں پھرتا ہے میرؔ وہ میرے — جاگتا ہوں کہ خواب کرتا ہوں

۲۶۶

اے عدم ہونے والو تم تو چلو — ہم بھی اب کوئی دم میں آتے ہیں
دیدہ و دل شتاب گم ہوں میرؔ — سر پہ آفت ہمیشہ لاتے ہیں

۲۶۷

آتا ہے دل میں حالِ بد اپنا بھلا کہوں — پھر آپ ہی آپ سوچ کے کہتا ہوں کیا کہوں
پروانہ پھر نہ شمع کی خاطر جلا کرے — گر بزم میں یہ اپنا ترا ماجرا کہوں
آوے سموم جائے صبا باغ سے سدا
گر شمہ اپنے سوزِ جگر کا میں جا کہوں

۲۶۸

نظر اے ابر اب مت آ مبادا
کہیں میری بھی آنکھیں ڈبڈباویں

۲۶۹

مثالِ سایہ محبت میں جال اپنا ہوں — تمہارے ساتھ گرفتار حال اپنا ہوں
سرشکِ سرخ کو جاتا ہوں جو پیے ہر دم — لہو کا پیاسا علی الاتصال اپنا ہوں
مری نمود نے مجھ کو کیا برابر خاک — میں نقشِ پا کی طرح پائمال اپنا ہوں
ترا ہے وہم کہ یہ ناتواں ہے جامے میں — دگر میں نہیں اب اک خیال اپنا ہوں
بلا ہوئی ہے مری گو کہ طبعِ روشن میرؔ
ہوں آفتاب و لیکن زوال اپنا ہوں

۲۹۵

آئے عدم سے ہستی میں تس پر نہیں قرار ہے ان مسافروں کا ارادہ کہاں کے تئیں
تو اک زباں پہ چپکی نہیں رہتی عندلیب رکھتا ہے منہ میں غنچۂ گل سو زباں کے تئیں

۲۹۶

موئے سہتے سہتے جفا کاریاں کوئی ہم سے سیکھے وفاداریاں
ہماری تو گزری اسی طور عمر یہی نالہ کرنا یہی زاریاں
گیا جان سے اک جہاں لیک شوخ نہ تجھ سے گئیں یہ دل آزاریاں
تری آشنائی سے ہی حد ہوئی
بہت کی تھیں دنیا میں ہم یاریاں

۲۹۷

ہے فرش عرش تک بھی قلب حزیں کا اپنے اس تنگ گھر میں ہم نے دیکھی ہیں کیا فضائیں
روکش تو ہو ترا پر آئینے ہیں کہاں یہ رعنائیاں، ادائیں، رنگینیاں، صفائیں

۲۹۸

آرزوئیں ہزار رکھتے ہیں تو بھی ہم دل کو مار رکھتے ہیں
نہ نگہ، نے پیام، نے وعدہ نام کو ہم بھی یار رکھتے ہیں
ہم سے خوش زمزمہ کہاں یوں تو
لب و لہجہ ہزار رکھتے ہیں

۲۹۹

گزر جان سے اور ڈر کچھ نہیں رہ عشق میں پھر خطر کچھ نہیں
ہے اب کام دل جس پہ موقوف تو وہ نالہ کہ جس میں اثر کچھ نہیں
ہوا مائل اس سرو کا دل مرا بجز جور جس سے ثمر کچھ نہیں
نہ کر اپنے محووں کا ہرگز سراغ گئے گزرے بس اب خبر کچھ نہیں
کروں کیونکہ انکار عشق آہ میں یہ رونا بھلا کیا ہے گر کچھ نہیں
تری ہو چکی خشک مژگاں کی سب
لہو اب جگر میں مگر کچھ نہیں

۲۹۰

میں وہ پژمردہ سبزہ ہوں کہ ہو کر خاک سے سرزد
یکایک آگیا اس آسماں کی پائمالی میں

۲۹۱

آہ اور اشک ہی صدا ہے یاں — روز برسات کی ہوا ہے یاں
گو کدورت سے وہ نہ دیوے رو — آرسی کی طرح صفا ہے یاں
کیسے کیسے مکان ہیں ستھرے — ق اک ازاں جملہ کربلا ہے یاں
اک سسکتا ہے ایک مرتا ہے — ہر طرف ظلم ہو رہا ہے یاں
صد تمنا شہید ہیں یک جا
سینہ کوبی ہے تعزیا ہے یاں

۲۹۲

جہاں اب خارزاریں ہو گئی ہیں — یہیں آگے بہاریں ہو گئی ہیں
جنوں میں خشک ہو رگ ہائے گردن — گریباں کی سی تاریں ہو گئی ہیں
سنا جاتا ہے شہر عشق کے گرد — مزاریں ہی مزاریں ہو گئی ہیں
اسی دریائے خوبی کا ہے یہ شوق
کہ موجیں سب کناریں ہو گئی ہیں

۲۹۳

خوش نہ آئی تمہاری چال ہمیں — یوں نہ کرنا تھا پائمال ہمیں
حال کیا پوچھ پوچھ جاتے ہو — کبھی پاتے بھی ہو بحال ہمیں
کب تک اس تنگنا میں کھینچے رنج — یاں سے یارب تو ہی نکال ہمیں
ترک سبزانِ شہر کریے اب
بس بہت کر چکے نہال ہمیں

۲۹۴

یہ غلط کہ پیا ہوں قدح شراب تجھ بن — نہ گلے سے میرے اترا، کبھی قطرہ آب تجھ بن
سبھی آتشیں ہیں نالے سبھی زہر میری آہیں — مری جان پر رہا ہے غرض اک عذاب تجھ بن

عالم ہے شوق کشتہ خلقت ہے تیری رفتہ ں کی آرزو تو آنکھوں کا مدعا تو
آتی بخود نہیں ہے بادِ بہار اب تک دو گام تھا چمن میں ٹک ناز سے چلا تو

کہہ سانجھ کے موئے کو اے میر روئیں کب تک
جیسے چراغِ مفلس اک دم میں جل بجھا تو

۳۱۳

خوبی یہی نہیں ہے کہ انداز و ناز ہو معشوق کا ہے حسن اگر دل نواز ہو
اک دم تو ہم میں تیغ کو تو بے دریغ کھینچ تا عشق میں ہوس میں تنک امتیاز ہو

جوں توں کے اس کی چاہ کا پردا کیا ہے میں
اے چشمِ گریہ ناک نہ افشائے راز ہو

۳۱۴

جس راہ ہو کے آج میں پہنچا ہوں تجھ تلک ق کافر کا بھی گزار الٰہی ادھر نہ ہو
یک جا نہ دیکھی آنکھوں سے ایسی تمام راہ جس میں بجائے نقشِ قدم چشمِ تر نہ ہو
لیکن عبث، نگاہ جہاں کریے اس طرف امکان کیا کہ خون مرے تا کمر نہ ہو
ہر یک قدم پہ لوگ ڈرانے لگے مجھے ہاں یاں کسو شہید محبت کا گھر نہ ہو
چلیو سنبھل کے سب یہ شہیدانِ عشق ہیں تیرا گزار تا کہ کسو نعش پر نہ ہو

اٹھ جائے رسم نالہ و آہ و فغاں سب
اس تیرہ روزگار میں تو میر اگر نہ ہو

۳۱۵

کام لے یار سے جو جذب رسا رکھتا ہو یا کوئی آئینہ ساں دستِ دعا رکھتا ہو
ہائے اس زخمیٔ شمشیرِ محبت کا جگر درد کو اپنے جو ناچار چھپا رکھتا ہو
آوے ہے پہلے قدم سر ہی کا جانا در پیش دیکھتا ہو جو رہِ عشق میں پا رکھتا ہو

گل ہو، مہتاب ہو، آئینہ ہو، خورشید ہو میر
اپنا محبوب وہی ہے جو ادا رکھتا ہو

یوں عرق جلوہ گر ہے اس منھ پر — جس طرح اوس پھول پر دیکھو
ہر خراش جبیں جراحت ہے — ناخنِ شوق کا ہنر دیکھو
تھی ہمیں آرزو، لب خنداں — سو عوض اس کے چشم تر دیکھو
رنگ رفتہ بھی دل کو کھینچے ہے — ایک شب اور یاں سحر دیکھو
دل، ہوا ہے طرف محبت کا — خون کے قطرے کا جگر دیکھو
پہنچے ہیں ہم قریب مرنے کے — یعنی جاتے ہیں دور اگر دیکھو

لطف مجھ میں بھی ہزاروں میرؔ
دیدنی ہوں جو سوچ کر دیکھو

۳۰۹

دیکھا میں آنسوؤں میں دل داغدار کو — پانی پہ جیسے غنچۂ لالہ پھرے بہا
برسا تو میرے دیدۂ خوں بار کے حضور — پر اب تک انفعال ہے ابر بہار کو

ہنستا ہی میں پھروں جو مرا کچھ ہو اختیار
پر کیا کروں میں دیدۂ بے اختیار کو

۳۱۰

اچھی لگی ہے تجھ بن گل گشتِ باغ کس کو — صحبت رکھے گلوں سے اتنا دماغ کس کو
بے سوز داغِ دل پر گر جی جلے بجا ہے — اچھا لگے ہے اپنا گھر بے چراغ کس کو

۳۱۱

دن گزرتا ہے مجھے فکر ہی میں تا کیا ہو — رات جاتی ہے اسی غم میں کہ فردا کیا ہو
خاکِ حسرت زدگاں پر تو گزر بے وسواس — ان ستم کشتوں سے اب عرضِ تمنّا کیا ہو
شوق جاتا ہے ہمیں یار کے کوچے کو لیے — جا کے معلوم ہو کیا جانیے اُس جا کیا ہو

خاک میں لوٹوں کہ لوہو میں نہاؤں میں میرؔ
یار مستغنی ہے اُس کو میری پروا کیا ہو

۳۱۲

ایسا کہاں ہے ہم سے جیسا کہ آگے تھا تو — اوروں سے مل کے پیارے کچھ اور ہو گیا تو
آ بر ایک دو دم آپس میں رکھیں صحبت — کڑھنے کو ہوں میں آندھی رونے کو ہے بلا تو

افسانہ غم کا لب تک آیا ہے مدتوں میں — سو جائیو نہ پیارے اس داستاں تلک تو

آوارہ خاک میری ہو کس قدر الٰہی
پہنچوں غبار ہو کر میں آسماں تلک تو

ہ

۳۳۳

یوسف سے کئی آن کے تیرے سرِ بازار — بک جاتے ہیں باتوں میں خریدار ہمیشہ
ہے دامنِ گل چینِ چمن جیب ہمارا — دنیا میں رہے دیدۂ خوں بار ہمیشہ

۳۳۴

چمن میں دل خراش آواز آتی ہے چلی شاید — پسِ دیوارِ گلشن نالہ کش ہے کوئی پر بستہ
تعجب ہے مجھے یہ سرو کو آزاد کہتے ہیں — سراپا دل کی صورت جس کی ہو وہ کیا ہو وارستہ

۳۳۵

آگے تجھے ابتدائے عشق میں ہم — اب جو ہے خاک انتہا ہے یہ
بودِ آدم نمودِ شبنم ہے — ایک دو دم میں پھر ہوا ہے یہ
شکر اس کی جفا کا ہو نہ سکا — دل سے اپنے ہمیں گلا ہے یہ
بس ہوا ناز ہو چکا اغماض — ہر گھڑی ہم سے کیا ادا ہے یہ
نعشیں اٹھتی ہیں آج یاروں کی — آن بیٹھو تو خوش نما ہے یہ

میر کو کیوں نہ مغتنم جانے
اگلے لوگوں میں اک رہا ہے یہ

۳۳۶

جا کے پوچھا جو میں یہ کار گہِ مینا میں — ق — دل کی صورت کا بھی اے شیشہ گراں ہے شیشہ
کہنے لاگے کہ کدھر پھرتا ہے بہکا اے مست — ہر طرح کا جو تو دیکھے ہے کہ یاں ہے شیشہ

دل ہی سارے تھے پہ اک وقت میں جو کر کے گداز
شکل شیشے کی بنائے ہیں کہاں ہے شیشہ

ہوش و صبر و خرد و دین و حواس و دل و تاب
اُس کے ایک آنے میں کیا کیا نہ گیا مت پوچھو

۳۲۷

لذتِ زہر غم فرقت دلداراں سے
ہو وے منہ میں جنھوں کے شہد و شکر مت پوچھو

مرنے میں بند زباں ہونا اشارت ہے ندیم
یعنی ہے دور کا درپیش سفر مت پوچھو

کیا پھرے وہ وطن آوارہ گیا اب سو گیا
دل گم کردہ کی کچھ خیر خبر مت پوچھو

۳۲۸

اُس کی طرز نگاہ مت پوچھو
جی ہی جانے ہے آہ مت پوچھو

کہیں پہنچو گے بے رہی میں بھی
گمرہاں یوں یہ راہ مت پوچھو

۳۲۹

محرماں بے دمی کا میری سبب مت پوچھو
ایک دم چھوڑ دو یوں ہی مجھے اب مت پوچھو

گریۂ شمع کا اے ہم نفساں ہیں تھا حریف
گزری ہے رات کی صحبت بھی عجب مت پوچھو

لب پہ شیون، مژہ پر خون و نگہ میں اک یاس
دن گیا ہجر کا جس ڈھنگ سے شب مت پوچھو

۳۳۰

میری ہی چشمِ تر کی کرامات ہے یہ سب
پھرتا تھا ورنہ ابر تو محتاج آب کو

اب تو نقاب منھ پہ لے ظالم کہ شب ہوئی
شرمندہ سارے دن تو کیا آفتاب کو

کہنے سے میرؔ اور بھی ہوتا ہے مضطرب
سمجھاؤں کب تک اِس دل خانہ خراب کو

۳۳۱

چاہتا ہے جی کہ ہم تو ایک جا تنہا ملیں
نازِ بے جا بھی نہ ہووے کم نگاہی بھی نہ ہو

۳۳۲

آغشتہ میرے خون سے اے کاش جا کے پہنچے
کوئی پر شکستہ ٹک گلستاں تلک تو

درماندگی نے مارا اثنائے رہ میں ہم کو
معلوم ہے پہنچنا اب کارواں تلک تو

چھ

۳۴۳

ہم سے کچھ آگے زمانے میں ہوا کیا کیا کچھ — تو بھی ہم غافلوں نے آکے کیا کیا کیا کچھ
دل گیا، ہوش گیا، صبر گیا، جی بھی گیا — شغل میں غم کے ترے ہم سے گیا کیا کیا کچھ
حسرتِ وصل و غم، ہجر و خیالِ رخِ دوست — مرگیا میں پہ مرے جی میں رہا کیا کیا کچھ

دردِ دل، زخمِ جگر، کلفتِ غم، داغِ فراق
آہ عالم سے مرے ساتھ چلا کیا کیا کچھ

ی

۳۴۴

دل کو تسکین نہیں اشکِ دمادم سے بھی — اس زمانے میں گئی ہے برکت غم سے بھی
ہمت اپنی ہی تھی یہ میرؔ کہ جوں مرغِ خیال — اک پرافشانی میں گزرے سرِ عالم سے بھی

۳۴۵

تابِ دل صرفِ جدائی ہوچکی — یعنی طاقت آزمائی ہوچکی
چھوٹتا کب ہے اسیرِ خوش زباں — جیتے جی اپنی رہائی ہوچکی

درمیاں ایسا نہیں اب آئینہ
میری اس کی اب صفائی ہوچکی

۳۴۶

دل کس قدر شگفتہ ہوا تھا کہ رات میرؔ
آئی جو بات لب پر یہ سو فریاد ہوگئی

۳۴۷

یہ چشمِ آئینہ دارِ رو تھی کسو کی — نظر اس طرف بھی کبھی تھی کسو کی
یہ سرگشتہ جب تک رہا اس چمن میں — برنگِ صبا جستجو تھی کسو کی
نہ ٹھہری ٹک اک جانِ برلب رسیدہ — ہمیں مدعا گفتگو تھی کسو کی
دمِ مرگ دشوار دی جان اُن نے — مگر میرؔ کو آرزو تھی کسو کی

۳۳۷

پہنچیں گے آگے دیکھیں کس درجہ کو ابھی تو
اُس ماہِ چاردہ کا سن دس ہے یا کہ بارہ

یہ مشت خاک یاں کی چاہے ہے اک تامل
بن سوچے راہ مت چل ہر گام پر کھڑا رہ

دوڑے بہت ولیکن مطلب کو کون پہنچا
آیندہ تو بھی ہم سا ہو کر شکستہ پارہ

۳۳۸

اب حال اپنا اس کے ہے دل خواہ
کیا پوچھتے ہو الحمدللہ

پیرِ مغاں سے بے اعتقادی
استغفراللہ استغفراللہ

اس پر کہ تھا وہ شہ رگ سے اقرب
ہرگز نہ پہنچا یہ دست کوتاہ

۳۳۹

بنے یہ کیونکہ ملے تو ہی یا ہمیں سمجھیں
ہم اضطراب زدہ اور تو حجاب زدہ

جدا ہو رخ سے تری زلف میں نہ کیوں دل جائے
پناہ لیتے ہیں سائے کی آفتاب زدہ

۳۴۰

شام شب وصال ہوئی یاں کہ اُس طرف
ہونے لگا طلوع ہی خورشیدِ رو سیاہ

بے تابیوں کو سونپ نہ دینا کہیں مجھے
اے صبر میں نے آن کے لی ہے تری پناہ

خوں بستہ بارے رہنے لگی اب تو یہ مژہ
آنسو کی بوند جس سے ٹپکتی تھی گاہ گاہ

۳۴۱

کہتے ہیں اُڑ بھی گئے جل کے پرِ پروانہ
کچھ سنی سوختگاں تم خبرِ پروانہ

ی

۳۴۲

رات مجلس میں تری ہم بھی کھڑے تھے چپکے
جیسے تصویر لگا دے کوئی دیوار کے ساتھ

ذکرِ گل کیا ہے، صبا اب کہ خزاں میں ہم نے
دل کو ناچار لگایا ہے خس و خار کے ساتھ

۳۶۴

ہاں خدا مغفرت کرے اس کو صبر مرحوم تھا عجب کوئی
اس کے کوچے میں حشر تھی مجھ تک آہ و نالہ کرے نہ اب کوئی

۳۶۵

آگے ہمارے عہد سے وحشت کو جا نہ تھی دیوانگی کسو کی بھی زنجیرِ پا نہ تھی
بیگانہ سا لگے ہے چمن اب خزاں میں ہائے ایسی گئی بہار مگر آشنا نہ تھی
وہ اور کوئی ہوگی سحر جب ہوئی قبول شرمندۂ اثر تو ہماری دعا نہ تھی
آگے بھی تیرے عشق میں کھینچے تھے دردِ رنج
لیکن ہماری جان پر ایسی بلا نہ تھی

۳۶۶

کب تلک داغ دکھاوے گی اسیری مجھ کو مر گئے ساتھ کے میرے تو گرفتار کئی
گرم ہیں شور سے تجھ حسن کے بازار کئی رشک سے جلتے ہیں یوسف کے خریدار کئی
خوف تنہائی نہیں کر تو جہاں سے تو سفر
ہر جگہ راہِ عدم میں ملیں گے یار کئی

○

چھن گیا سینہ بھی کلیجا بھی
مار کے تیر جان لے جا بھی

۳۶۷

کتنے پیغام چمن کو ہیں سو دل میں ہیں گرہ
کسو دن ہم تئیں بھی بادِ سحر آوے گی

۳۶۸

کیا کروں شرح خستہ جانی کی میں نے مر مر کے زندگانی کی
حال بد گفتنی نہیں میرا تم نے پوچھا تو مہربانی کی
تشنہ لب مر گئے ترے عاشق نہ ملی ایک بوند پانی کی
بیت بحثی سمجھ کے کر بلبل دھوم ہے میری خوش زبانی کی

نزاکت کیا کہوں خورشید رو کی، کل شبِ مہ میں
گیا تھا سائے سائے باغ تک تس پر حرارت کی
ترے کوچے کے شوقِ طوف میں جیسے بگولا تھا
بیاباں میں غبارِ میرؔ کی ہم نے زیارت کی

۳۵۹

بلبل کی بے کلی نے شب بے دماغ رکھا — سونے دیا نہ ہم کو ظالم نہ آپ سوئی
اس مہ کے جلوے سے کچھ تا میرؔ یاد دیوے — اب کے گھروں میں ہم نے سب چاندنی ہے بوئی

۳۶۰

چمن کا نام سنا تھا وے نہ دیکھا ہائے
جہاں میں ہم نے قفس ہی میں زندگانی کی

۳۶۱

کیسی کیسی صحبتیں آنکھوں کے آگے سے گئیں — دیکھتے ہی دیکھتے کیا ہو گیا یک بارگی
روئے گل پر روز و شب کس شوق سے رہتا ہے باز — رخنۂ دیوار ہے یا دیدۂ نظارگی
اشک خونیں آنکھ میں بھر لا کے پی جاتا ہوں میں
محتسب رکھتا ہے مجھ پر تہمت بے خوارگی

۳۶۲

کچھ موج ہوا پیچاں اے میرؔ نظر آئی — شاید کہ بہار آئی زنجیر نظر آئی
دِلّی کے نہ تھے کوچے، اوراقِ مصوّر تھے — جو شکل نظر آئی تصویر نظر آئی
مغرور بہت تھے ہم آنسو کی سرایت پر — سو صبح کے ہونے کو تاثیر نظر آئی
گل بار کرے ہے گا اسباب سفر شاید
غنچے کی طرح بلبل دلگیر نظر آئی

۳۶۳

ہو گئی شہر شہر رسوائی — اے مری موت تو بھلی آئی
یک بیاباں برنگ صوت جرس — مجھ پہ ہے بیکسی و تنہائی
نہ کھنچے تجھ سے ایک جا نقاش — اس کی وہ تصویر ہے ہرجائی

۳۷۳

آج کل بے قرار ہیں ہم بھی | بیٹھ جا چلنے ہار ہیں ہم بھی
آن میں کچھ ہیں، آن میں کچھ ہیں | تحفۂ روزگار ہیں ہم بھی
منعِ گریہ نہ کر تو اے ناصح | اس میں بے اختیار ہیں ہم بھی

مدعی کو شراب ہم کو زہر
عاقبت دوست دار ہیں ہم بھی

۳۷۴

مدت سے ہیں اک مشتِ پر آوارہ چمن میں | نکلی ہے یہ کس کی ہوس بال فشانی
اک شخص مجھی سا تھا کہ وہ تجھ پر تھا عاشق | وہ اس کی وفاپیشگی وہ اس کی جوانی

یہ کہہ کے جو رویا تو لگا کہنے نہ کہہ میر
سنتا نہیں میں ظلم رسیدوں کی کہانی

۳۷۵

خورشید سا پیالۂ مے بے طلب دیا | پیرِ مغاں سے رات کرامات ہوگئی
ٹک شہر سے نکل کے مرا گریہ سیر کر | گویا کہ کوہ و دشت پہ برسات ہوگئی

اپنے تو ہونٹ بھی نہ ہلے اس کے روبرو
رنجش کی وجہ وہ کیا میر بات ہوگئی

○

کوئی ہو محرمِ شوخی ترا تو میں پوچھوں
کہ بزمِ عیشِ جہاں کیا سمجھ کے برہم کی

۳۷۶

صد حرف زیرِ خاک تہِ دل چلے گئے | مہلت نہ دی اجل نے ہمیں ایک بات کی
ہم تو ہی اس زمانے میں حیرت سے چپ نہیں | اب بات جا چکی سبھی کائنات کی

۳۷۷

کس حسن سے کہوں میں اس کی خوش اختری کی | اس ماہرو کے آگے کیا تاب مشتری کی
خوباں تمہاری خوبی تا چند نقل کریے | ہم رنجہ خاطروں کی کیا خوب دلبری کی

جس سے کھوئی تھی نیند میرؔ نے کل
ابتدا، پھر وہی کہانی کی

۳۶۹

یہ بگولہ تو نہیں دشتِ محبت میں سے　　جمع ہو خاک اڑی کتنے پریشانوں کی
سیل آنکھوں سے بہے، صرصر آہوں سے اُٹھے　　مجھ سے کیا کیا نہ خرابی ہوئی ویرانوں کی
سرگذشتیں نہ مری سن کہ اُچٹتی ہے نیند
خاصیت یہ ہے مری جان ان افسانوں کی

۳۷۰

نہیں اس گزر گہ سے آتی ادھر اب
نئی راہ کوئی صبا کیا نکالی

۳۷۱

رہی نگفتہ مرے دل میں داستاں میری　　نہ اس دیار میں سمجھا کوئی زباں میری
برنگِ صوتِ جرس تجھ سے دور ہوں تنہا　　خبر نہیں ہے تجھے آہ کارواں میری
ترے نہ آج کے آنے میں صبح کے مجھ پاس　　ہزار جائے گئی طبع بدگماں میری
اسی سے دور رہا اصلِ مدعا جو تھا　　گئی یہ عمرِ عزیز آہ رائیگاں میری
ترے فراق میں جیسے خیال مفلس کا　　گئی ہے فکر پریشاں کہاں کہاں میری
دیا دکھائی مجھے تو اسی کا جلوہ میرؔ
پڑی جہان میں جاکر نظر جہاں میری

۳۷۲

اب کے بھی سیرِ باغ کی جی میں ہوس رہی　　اپنی جگہ بہار میں کنجِ قفس رہی
میں پا شکستہ جا نہ سکا قافلے تلک　　آتی اگرچہ دیر صدائے جرس رہی
دن رات میری آنکھوں سے آنسو چلے گئے　　برسات اب کے شہر میں سارے برس رہی
جوں صبح اس چمن میں نہ ہم کُھل کے ہنس سکے
فرصت رہی جو میرؔ بھی سو ایک نفس رہی

۳۸۳

تجھے نسبت جو دیتے ہیں شرار و برق و شعلے سے ۔۔۔ تسلی کرتے ہیں ناچار شاعران مثالوں سے
نہیں خالی اثر سے تصفیۂ دل کا محبت ہیں ۔۔۔ کہ آئینے کو ربطِ خاص ہے صاحب جمالوں سے

کہاں یہ قامت دلکش کہاں پاکیزگی ایسی
ملے ہیں ہم بہت گلزار کے نازک نہالوں سے

۳۸۴

لختِ دل کب تک الٰہی چشم سے ٹپکا کریں ۔۔۔ خاک میں تا چند ایسے لعل پارے دیکھیے
خنجر بیداد کو کیا دیکھتے ہو دم بدم ۔۔۔ چشم سے ۔۔۔ ہمارے دیکھیے

۳۸۵

عشق اُن کو ہے جو یار کو اپنے دم رفتن
کرتے نہیں غیرت سے خدا کے بھی حوالے

۳۸۶

برنگِ بوئے گل اُس باغ کے ہم آشنا ہوتے ۔۔۔ کہ ہمراہِ صبا ٹک سیر کرتے پھر ہوا ہوتے
سراپا آرزو ہونے نے بندہ کر دیا ہم کو ۔۔۔ وگرنہ ہم خدا تھے گر دلِ بے مدعا ہوتے
فلک اے کاش ہم کو خاک ہی رکھتا کہ یہیں ہم ۔۔۔ غبار راہ ہوتے یا کسو کی خاکِ پا ہوتے

الٰہی کیسے ہوتے ہیں جنھیں ہے بندگی خواہش
ہمیں تو شرم دامن گیر ہوتی ہے خدا ہوتے

۳۸۷

سراپا میں اس کے نظر کر کے تم ۔۔۔ جہاں دیکھو اللہ اللہ ہے
تری آہ کس سے خبر پائیے ۔۔۔ وہی بے خبر ہے جو آگاہ ہے
گذر سر سے تب عشق کی راہ چل ۔۔۔ کہ ہر گام یاں اک خطر گاہ ہے
جہاں سے تو رخت اقامت کو باندھ ۔۔۔ یہ منزل نہیں بے خبر راہ ہے

یہ وہ کارواں گاہِ دلکش ہے میر
کہ پھر یاں سے حسرت ہی ہمراہ ہے

۳۷۸

دیکھ تو دل کہ جاں سے اُٹھتا ہے — یہ دھواں سا کہاں سے اُٹھتا ہے
گور کس دل جلے کی ہے یہ فلک — شعلہ اک صبح یاں سے اُٹھتا ہے
خانۂ دل سے زینہار نہ جا — کوئی ایسے مکاں سے اُٹھتا ہے
نالہ سر کھینچتا ہے جب میرا — شور اک آسماں سے اُٹھتا ہے
لڑتی ہے اس کی چشم شوخ جہاں — اک آشوب واں سے اُٹھتا ہے
سدھ لے گھر کی بھی شعلۂ آواز — دود کچھ آشیاں سے اُٹھتا ہے
بیٹھنے کون دے ہے پھر اس کو — جو ترے آستاں سے اُٹھتا ہے

یوں اُٹھے اُس گلی سے ہم
جیسے کوئی جہاں سے اُٹھتا ہے

۳۷۹

ٹپکتے درد میں آنسو کی جاگہ — الٰہی چشم یا زخم کہن ہے
شہادت گاہ ہے باغِ زمانہ — کہ ہر گل اس میں اک خونیں کفن ہے

۳۸۰

فرصت میں یک نفس کی کیا درد دل سنوگے — آئے تو تم ولیکن وقتِ آخر آئے
دلّی میں اب کی آکر اُن یاروں کو نہ دیکھا — کچھ وے گئے شتابی کچھ ہم بھی دیر آئے

۳۸۱

کب سے نظر لگی تھی دروازۂ حرم سے — پردہ اٹھا تو لڑیاں آنکھیں ہماری ہم سے
بات احتیاط سے کر ضائع نہ کر نفس کو — بالیدگیٔ دل ہے مانندِ شیشہ دم سے

پامال کر کے ہم کو پچھتاؤ گے بہت تم
کمیاب ہیں جہاں میں سر دینے والے ہم سے

۳۸۲

وہ اپنی ہی خوبی پہ رہتا ہے نازاں — مرو یا جیو کوئی اس کی بلا سے
نہ رکھی مری خاک بھی اس گلی میں — کدورت مجھے ہے نہایت صبا سے
نہ شکوہ شکایت نہ حرف و حکایت — کہو میر جی آج کیوں ہو خفا سے

۳۹۳

کسے قید قفس میں یاد گل کی
پڑے ہیں اب تو جینے کے ہی لالے

۳۹۴

بے یار شہر دل کا ویران ہو رہا ہے دکھلائی دے جہاں تک میدان ہو رہا ہے
اس منزل جہاں کے باشندے رفتنی ہیں ہر اک کے ہاں سفر کا سامان ہو رہا ہے
اچھا لگا ہے شاید آنکھوں میں یار اپنی
آئینہ دیکھ کر کچھ حیران ہو رہا ہے

۳۹۵

آزردہ خاطروں سے کیا فائدہ سخن کا تم حرف سر کروگے ہم گریہ سر کریں گے
اپنی خبر بھی ہم کو اب دیر پہنچتی ہے کیا جانے یار اس کو کب تک خبر کریں گے
گر دل کی تاب و طاقت یہ ہے تو ہمنشیں ہم
شام غم جدائی کیوں کر سحر کریں گے

۳۹۶

بہت دور کوئی رہا ہے مگر کہ فریاد میں ہے جرس شور سے
مری خاک تفتہ پہ اے ابر تر قسم ہے تجھے ٹک برس زور سے

۳۹۷

مر گئے پر بھی ہے صولت فقر کی چشم شیر اپنا چراغ گور ہے
تھا بلا ہنگامہ آرا میرؔ بھی اب تلک گلیوں میں اسکے شور ہے

۳۹۸

مصطبۂ بے خودی ہے یہ جہاں جلد خبردار ہوا چاہیے
کچھ نہیں خورشید صفت سرکشی سایۂ دیوار ہوا چاہیے
کر نہ تعلق کہ یہ منزل نہیں
آہ سبک بار ہوا چاہیے

۳۸۸

ڈھب ہیں تیرے سے باغ ہیں گل کے　　بُو گئی کچھ دماغ میں گل کے
سیر کر میرؔ اس چمن کی شتاب　　ہے خزاں بھی سراغ میں گل کے

۳۸۹

حال یہ پہنچا ہے کہ اب ضعف سے　　اُٹھتے پلک ایک پہر چاہیے
کم ہے شناسائے زرِ داغِ دل　　اس کے پرکھنے کو نظر چاہیے
شرط سلیقہ ہے ہر اک امر میں　　عیب بھی کرنے کو ہنر چاہیے

خوف قیامت کا یہی ہے کہ میرؔ
ہم کو جیا بارِ دِگر چاہیے

۳۹۰

ہستی اپنی حباب کی سی ہے　　یہ نمائش سراب کی سی ہے
نازکی اس کے لب کی کیا کہیے　　پنکھڑی ایک گلاب کی سی ہے
چشم دل کھول اس بھی عالم پر　　یاں کی اوقات خواب کی سی ہے
بار بار اُس کے در پہ جاتا ہوں　　حالت اب اضطراب کی سی ہے
میں جو بولا کہا کہ یہ آواز　　اُسی خانہ خراب کی سی ہے

میرؔ اُن نیم باز آنکھوں میں
ساری مستی شراب کی سی ہے

۳۹۱

کھل گئے رخسار اگر یار کے
شمس و قمر جی سے اُتر جائیں گے

۳۹۲

گریہ ہر وقت کا نہیں بے ہیچ　　دل میں کوئی غم نہانی ہے
ہم قفس زاد قیدی ہیں ورنہ　　تا چمن ایک پر افشانی ہے
خاک تھی موجزن جہاں میں اور　　ہم کو دھوکا یہ تھا کہ پانی ہے
یاں ہوئے میرؔ تم برابر خاک　　واں وہی ناز و سرگرانی ہے

۴۰۴

کھینچا تھا آہِ شعلہ فشاں نے جگر سے سر — برسوں تئیں پڑے ہوئے جنگل جلا کیے
غنچے نے ساری طرز ہماری ہی اخذ کی — ہم جو چمن میں برسوں گرفتہ رہا کیے

۴۰۵

کروں جو آہ زمین و زمان جل جاوے
سپہر نیلی کا یہ سائبان جل جاوے

۴۰۶

چمن پر نوحہ وزاری سے کس گل کا یہ ماتم ہے
جو شبنم ہے تو گریاں ہے جو بلبل ہے تو نالاں ہے
ہر اک مژگاں پہ مری اشک کے قطرے جھمکتے ہیں
تماشا مفت خوباں ہے لبِ دریا چراغاں ہے

۴۰۷

مت کر زمینِ دل میں تخمِ امید ضائع — بوٹا جو یاں اُگا ہے سو اگتے ہی جلا ہے
اے شمع بزمِ عاشق روشن ہے یہ کہ تجھ بن — آنکھوں میں میری عالم تاریک ہو گیا ہے

۴۰۸

ہوا ہے دن تو جدائی کا سو تعب سے شام — شبِ فراق کس امید پر سحر کریئے
جہاں کا دید بجز ماتم نظارہ نہیں — کہ دیدنی ہی نہیں جس پہ یاں نظر کریئے

۴۰۹

مشہور چمن میں تیری گل پیرہنی ہے — قربان ترے ہر عضو پہ نازک بدنی ہے
بلبل کی کفِ خاک بھی اب ہو گی پریشاں — جامے کا ترے رنگ ستم گر چمنی ہے
لیتا ہی نکلتا ہے مرا لختِ جگر اشک — آنسو نہیں گویا کہ یہ ہیرے کی کنی ہے
کچھ تو ابھر اے صورتِ شیریں کہ دکھاؤں
فرہاد کے ذمّے بھی عجب کوہ کنی ہے

۴۱۰

غیروں پہ اگر کھینچو گے شمشیر تو خوباں — اب اور مری جان پہ بیداد کروگے

۳۹۹

اس اسیری سے نہ کوئی اے صبا پالے پڑے — اک نظر گل دیکھنے کے بھی ہمیں لالے پڑے
حسن کو بھی عشق نے آخر کیا حلقہ بگوش — رفتہ رفتہ دلبروں کے کان میں بالے پڑے
ہیں بعینہ ویسے جوں پردا کرے ہے عنکبوت
روتے روتے بسکہ میری آنکھوں میں جالے پڑے

۴۰۰

رنج کھینچے تھے، داغ کھائے تھے — دل نے صدمے بڑے اُٹھائے تھے
پاس ناموس عشق تھا ورنہ — کتنے آنسو پلک تک آئے تھے
وہی سمجھا نہ ورنہ ہم نے تو — زخم چھاتی کے سب دکھلائے تھے
اب جہاں آفتاب میں ہم ہیں — یاں کبھو سرو و گل کے سائے تھے
میرؔ صاحب رُلا گئے سب کو
کل وے تشریف یاں بھی لائے تھے

۴۰۱

گہرے بحرِ بلا مژگانِ تر سے
نگاہیں اُٹھ گئیں طوفان پر سے

۴۰۲

نیلا نہیں سپہر تجھے اشتباہ ہے
دردِ جگر سے میرے یہ چھت سب سیاہ ہے

۴۰۳

جب نام ترا لیجے تب چشم بھر آوے — اس زندگی کرنے کو کہاں سے جگر آوے
مے خانہ وہ منظر ہے کہ ہر صبح جہاں شیخ — دیوار پہ خورشید کا مستی سے سر آوے
کیا جانیں وے مرغانِ گرفتارِ چمن کو — جن تک کہ بصد ناز نسیمِ سحر آوے
صناع ہیں سب خوار ازاں جملہ ہوں میں بھی
ہے عیب بڑا اس میں جسے کچھ ہنر آوے

۴۱۷

شش جہت سے اس میں ظالم بوئے خوں کی راہ ہے　　ترا کوچہ ہم سے تو کہہ کس کی بسمل گاہ ہے
اس جنوں پر میر کوئی بھی پھرے ہے شہر میں　　جادۂ صحرا سے کر سازش جو تجھ سے راہ ہے

۴۱۸

مرتا ہے کیوں تو ناحق یاری برادری پر　　دنیا کے سارے ناتے ہیں جیتے جی تلک کے
لاتے نہیں نظر میں غلطانی گہر کو　　ہم معتقد ہیں اپنے آنسو ہی کی ڈھلک کے

۴۱۹

کیفیت چشماں اب معلوم ہوئی اس کی
یہ مست ہیں دو خونی ہشیار رہا کیجیے

۴۲۰

آنے کہا ہے میرے خوش قد نے رات گزرے
ہنگامۂ قیامت اب صبح پر رہا ہے

○

اقرار دل کا یہ کاہے کو ڈھنگ تھا آگے
ہمارے چہرے کے اوپر بھی رنگ تھا آگے

۴۲۱

دیکھیں وہ غیرتِ خورشید کہاں جاتا ہے　　اب سرِ راہ، دم صبح سے آ بیٹھیں گے
جا نہ اظہار محبت پہ ہوس ناکوں کے　　وقت کے وقت یہ سب منہ کو چھپا بیٹھیں گے

○

کیا خرابی ہے میکدے کی سہل　　محتسب اک جہان جاتا ہے
گو وہ ہرجائی آئے اپنی اور　　سو طرف ہی گمان جاتا ہے

○

میر اب بہار آئی صحرا میں چل جنوں کر　　کوئی بھی فصل گل میں نادان گھر رہے ہے

۴۲۲

اے ہم صفیر! بے گل کس کو دماغِ نالہ　　مدت ہوئی ہماری منقار زیر پر ہے

اس دشت میں اے راہرواں ہر قدم اوپر
مانند جرس نالہ و فریاد کروگے

۴۱۱

کیا اے سایۂ دیوار تونے مجھ سے رو پنہاں
مرے اب دھوپ میں جلنے ہی کا آثار پیدا ہے

۴۱۲

پریشاں گرد سا گاہے جو مل جاتا ہے صحرا میں — اسی کی جستجو میں خضر بھی اوقات کھوتا ہے
نہ رکھو کان نظمِ شاعراں حال پر اتنے — چلو ٹک میر کو سننے کہ موتی سے پروتا ہے

○

ٹوٹے جوں لالہ ستاں سے ایک پھول
ہم لے یاں سے داغ یک عالم چلے

۴۱۳

بال کھلے وہ شب کو شاید بسترِ ناز پہ سوتا ہے
آئی نسیمِ صبح جو ایدھر پھیلا عنبر سارا ہے

۴۱۴

لائی تری گلی تک آوارگی ہماری — ذلّت کی اپنی اب ہم عزت کیا کریں گے
احوال میر کیونکر آخر ہو ایک شب میں — اک عمر ہم یہ قصہ تم سے کہا کریں گے

۴۱۵

ہم ہوئے تم ہوئے کہ میر ہوئے — اس کی زلفوں کے سب اسیر ہوئے
یعنی مانند صبح دنیا میں — ہم جو پیدا ہوئے سو پیر ہوئے

۴۱۶

اب تلک بھی مزارِ مجنوں سے
ناتواں اک غبار اُٹھتا ہے
ہے بگولا غبار کس کا میر
کہ جو ہو بے قرار اُٹھتا ہے

○

عریاں پھریں کب تک اے کاش کہیں آ کر
تہ گرد بیاباں کی بالاتے بدن بیٹھے

۴۲۹

گفتگو ریختے میں ہم سے نہ کر یہ ہماری زبان ہے پیارے
شکلیں کیا کیا کیاں ہیں جن نے خاک یہ وہی آسمان ہے پیارے
چھوڑ جاتے ہیں دل کو تیرے پاس
یہ ہمارا نشان ہے پیارے

۴۳۰

یک حرف کی بھی مہلت ہم کو نہ دی اجل نے تھا جی میں آہ کیا کیا پر کچھ نہ کہنے پائے
اعجاز عشق ہی سے جیتے رہے وگرنہ کیا حوصلہ کہ جس میں آزار یہ سمائے

۴۳۱

مدہوشاں پوچھیں نہ ٹک ہجراں میں گر مر جایئے
اب کہو اس شہر ناپرساں سے کیدھر جایئے

۴۳۲

غالب کہ یہ دل خستہ شب ہجر میں مر جائے یہ رات نہیں وہ جو کہانی میں گزر جائے
یاقوت کوئی اُن کو کہے ہے کوئی گل برگ ٹک ہونٹھ ہلا تو بھی کہ اک بات ٹھہر جائے
اس ورطے سے تختہ جو کوئی پہنچے کنارے
تو میرؔ وطن میرے بھی شاید جو خبر جائے

۴۳۳

ہم نے جانا تھا سخن ہوں گے زباں پر کتنے پر قلم ہاتھ جو آئی لکھے دفتر کتنے
آہ نکلی ہے یہ کس کی ہوس سیرِ بہار آتے ہیں باغ میں آوارہ ہوئے پر کتنے
دیکھیو پنجۂ مژگاں کی ٹک آتش دستی ہر سحر خاک میں ملتے ہیں دُرِ تر کتنے
عمر گذری کہ نہیں دودۂ آدم سے کوئی
جس طرف دیکھیے عرصے میں ہیں اب خر کتنے

شمعِ اخیرِ شب ہوں سن سرگزشت میری
پھر صبح ہونے تک تو قصہ ہی مختصر ہے

تو ہی زمام اپنی ناقے تڑا کہ مجنوں
مدت سے نقشِ پا کے مانند راہ پر ہے

آفت رسیدہ ہم کیا سر کھینچیں اس چمن میں
جوں نخلِ خشک ہم کو نے سایہ نے ثمر ہے

۴۲۳

ہر دم قدم کو اپنے رکھ احتیاط سے یاں
یہ کارگاہ ساری دکانِ شیشہ گر ہے

تیری گلی سے بچ کر کیوں مہر و مہ نہ نکلیں
ہر کوئی جانتا ہے اس راہ میں خطر ہے

۴۲۴

اٹھیو سمجھ کے جا سے کہ مانند گرد باد
آوارگی سے تیری زمانے کو عشق ہے

۴۲۵

رہرو راہ خوفناک عشق
چاہیے پانو کو سنبھال رکھے

پہنچے ہر اک نہ درد کو میرے
وہی جانے جو ایسا حال رکھے

۴۲۶

یاں جو وہ نونہال آتا ہے
جی میں کیا کیا خیال آتا ہے

پر تو گذرا قفس ہی میں دیکھیں
اب کی کیسا یہ سال آتا ہے

۴۲۷

شب گئے تھے باغ میں ہم ظلم کے مارے ہوئے
جان کو اپنی گلِ مہتاب انگارے ہوئے

۴۲۸

کرے کیا کہ دل بھی تو مجبور ہے
زمیں سخت ہے آسماں دور ہے

جرس راہ میں جملہ تن شور ہے
مگر قافلے سے کوئی دور ہے

تمنائے دل کے لیے جان دی
سلیقہ ہمارا تو مشہور ہے

پلک کی سیاہی میں ہے وہ نگاہ
کسو کا مگر خون منظور ہے

تنک گرم تو سنگ ریزے کو دیکھ
نہاں اس میں بھی شعلۂ طور ہے

۴۴۲

ترا ہے وہم کہ میں اپنے پیرہن میں ہوں — نگاہ غور سے کر مجھ میں کچھ رہا بھی ہے
کہاں تلک شب و روز آہ دردِ دل کہیے — ہر ایک بات کو آخر کچھ انتہا بھی ہے

ہوس تو دل میں ہمارے جگہ کرے لیکن
کہیں ہجوم سے اندوہ غم کے جا بھی ہے

۴۴۳

دیوانگی کی شورشیں دکھلائیں گے بلبل — آتی ہے بہار اب ہمیں زنجیر کریں گے
وا اس سے سرِ حرف تو ہو گو کہ یہ سر جائے — ہم حلق بریدہ ہی سے تقریر کریں گے
شب دیکھی ہے زلف اس کی بجز دام اسیری — کیا یار اب اس خواب کی تعبیر کریں گے

بازیچہ نہیں میر کے احوال کا لکھنا
اس قصے کو ہم کرتے ہی تحریر کریں گے

۴۴۴

نہیں کھلتیں آنکھیں تمہاری ٹک کہ مآل پر بھی نظر کرو
یہ جو وہم کی سی نمود ہے اسے خوب دیکھو تو خواب ہے
مرا شور سن کے جو لوگوں نے کیا پوچھنا تو کہے ہے کیا
جسے میر کہتے ہیں صاحبو، یہ وہی تو خانہ خراب ہے

۴۴۵

اس سے آنکھوں کو ملا جی میں رہے کیونکر تاب
چشم اعجاز، مژہ سحر، نگہ افسوں ہے

۴۴۶ اس دشت میں اے سیل سنبھل ہی کے قدم رکھ — ہر سمت کو یاں دفن مری تشنہ لبی ہے
۴۴۷ خون ہر ایک رقم شوق سے ٹپکے تھا و لے — ورنہ سمجھا کہ مرے نامے کا کیا مضموں ہے
۴۴۸ دو سونپ دودِ دل کو میرا کوئی نشاں ہے — ہوں میں چراغ کشتہ بادِ سحر کہاں ہے
بھڑکے ہے آتشِ گل اے ابرِ تر ترحم — گوشے میں گلستاں کے میرا بھی آشیاں ہے

کس دور میں اٹھایا مجھ سینہ سوختہ کو
پیوند ہو زمیں کا جیسا یہ آسماں ہے

۴۳۴

اے شب ہجر راست کہہ تجھ کو   بات کچھ صبح کی بھی آتی ہے
چشم بد دور چشم تر اے میرؔ   آنکھیں طوفان کو دکھاتی ہے

۴۳۵

گرد رہ اس کی یا رب کس اور سے اُٹھے گی
سو سو غزال ہر سو آنکھیں لگا رہا ہے

۴۳۶

نہ پوچھو کر احوال ناگفتہ بہ ہے   مصیبت کے مارے ہوئے دل کا اپنے
بِنائیں رکھیں میں نے عالم میں کیا کیا   ہوں بندہ خیالات باطل کا اپنے

۴۳۷

کر بے خبر اک نگہ سے ساقی
لیکن کسو کو خبر نہ ہووے

۴۳۸

کو موسم شباب، کہاں گل، کسے دماغ
بلبل وہ چہچہے انھیں یاراں تلک گئے

۴۳۹

جن جن کو تھا یہ عشق کا آزار مر گئے   اکثر ہمارے ساتھ کے بیمار مر گئے
یوں کانوں کان گل نے نہ جانا چمن میں آہ   سر کو پٹک کے ہم پس دیوار مر گئے
مجنوں نہ دشت میں ہے نہ فرہاد کوہ میں
تھا جن سے لطفِ زندگی وہ یار مر گئے

۴۴۰

رُکا جاتا ہے جی اندر ہی اندر آج گرمی سے   بلا سے چاک ہی ہو جاوے سینہ ٹک ہوا آوے
برنگ بوئے غنچہ عمر اک ہی رنگ میں گزرے   میسّر میرؔ صاحب گر دلِ بے مدعا آوے

۴۴۱

بغل پروردۂ طوفاں ہوں ہیں یہ موج ہے میری   بیاباں میں اگر رُوؤں تو شہروں میں بھی آب آوے

عالم میں آب و گل کا ٹھہراؤ کس طرح ہو | گر خاک ہے اڑے ہے در آب ہے رواں ہے
ہنگام جلوہ اس کے مشکل ہے ٹھہرے رہنا | چتون ہے دل کی آفت چشمک بلائے جاں ہے
اس فن میں کوئی بے تہ کیا ہو مرا معارض | اول تو میں سند ہوں پھر یہ مری زباں ہے

از خویش رفتہ اُس بن رہتا ہے میر اکثر
کرتے ہو بات کس سے وہ آپ میں کہاں ہے

۴۵۵

گر دوپہر کو اس کو نکلنے دے نازکی | حیرت سے آفتاب کی پھر دن نہ ڈھل سکے

۴۵۶

ہم گرم رو ہیں راہِ فنا کے شرر صفت
ایسے نہ جائیں گے کہ کوئی کھوج پا سکے

۴۵۷

دن کو نہیں ہے چین نہ ہے خواب شب مجھے
مرنا پڑا ضرور، ترے غم میں اب مجھے

۴۵۸

شب خواب کا لباس ہے عریاں تنی میں یہ
جب سوئیے تو چادر مہتاب تانیے

۴۵۹

چپ کا باعث ہے بے تمنّائی | کہیے کچھ بھی تو مدّعا ہووے
بے کلی مار ڈالتی ہے نسیم | دیکھیے اب کے سال کیا ہووے

نہ سنا رات ہم نے اک نالہ
غالباً میر مر رہا ہووے

۴۶۰

روز آنے پہ نہیں نسبت عشقی موقوف
عمر بھر ایک ملاقات چلی جاتی ہے

۴۴۹

نالے جو آج سنتے ہیں سو ہیں جگر خراش | کیا جانیے قفس میں گرفتار کون ہے
رکھیو قدم سنبھل کے کہ تو جانتا نہیں | مانند نقش پا یہ سرِ راہ کون ہے

۴۵۰

دیدار خواہ اس کے کم ہوں تو شور کم ہو | ہر صبح اک قیامت اٹھتی ہے اس کے در سے
اب جوں سرشک ان سے پھرنے کی چشم مت رکھ | جو خاک میں ملے ہیں گر کر تری نظر سے

۴۵۱

میں مست مر گیا ہوں کرنا عجب نہ ساقی
گر سنگ شیشہ میرا سنگ مزار ہووے

۴۵۲

کوئی بیگانہ گر نہیں موجود | منھ چھپانا یہ کیا ہے پھر ہم سے
مُندھ گئی آنکھ ہے اندھیرا پاک | روشنی ہے سو یاں مرے دم سے
درہمی آ گئی مزاجوں میں | آخر ان گیسوان درہم سے
مفت یوں ہاتھ سے نہ کھو ہم کو
کہیں پیدا بھی ہوتے ہیں ہم سے

۴۵۳

دل میں ناسور پھر جدھر چاہے | ہر طرف کوچۂ جراحت ہے
تجھ کو مسجد ہے مجھ کو میخانہ | واعظ اپنی اپنی قسمت ہے
کیا ہوا گر غزل قصیدہ ہوئی | عاقبت قصّہ محبّت ہے
باطل السحر دیکھ باطل تھے | تیری آنکھوں کا سحر آفت ہے
تربت میرؔ پر ہیں اہل سخن
ہر طرف حرف ہے حکایت ہے

۴۵۴

ناز چمن وہی ہے بلبل سے گو خزاں ہے | ٹہنی جو زرد بھی ہے سو شاخ زعفراں ہے
باغ و بہار ہے وہ میں کشت زعفراں ہوں | جو لطف اک اُدھر ہے تو یاں بھی اک سماں ہے

۴۶۷

جانگداز اتنی کہاں آواز عود و چنگ ہے دل کے سے نالوں کا ان پردوں میں کچھ آہنگ ہے
چشم کم سے دیکھ مت قمری تو اس خوش قد کو ٹک آہ بھی سرو گلستان شکست رنگ ہے

رو و خال و زلف ہی ہیں سنبل و سبزہ و گل
آنکھیں ہوں تو یہ چمن آئینۂ نیرنگ ہے

۴۶۸

دیوار کہنہ ہے یہ مت بیٹھ اس کے سائے اٹھ چل کہ آسماں تو کاواک ہو گیا ہے
کیا جانوں لذت درد اس کی جراحتوں کی یہ جانوں ہوں کہ سینہ سب چاک ہو گیا ہے

زیر فلک بھلا تو رووے ہے آپ کو میر
کس کس طرح کا عالم یاں خاک ہو گیا ہے

۴۶۹

فقیرانہ آئے صدا کر چلے میاں خوش رہو ہم دعا کر چلے
جو تجھ بن نہ جینے کو کہتے تھے ہم سو اس عہد کو اب وفا کر چلے
شفا اپنی تقدیر ہی میں نہ تھی کہ مقدور تک تو دوا کر چلے
وہ کیا چیز ہے آہ جس کے لیے ہر اک چیز سے دل اُٹھا کر چلے
کوئی ناامیدانہ کرتے نگاہ سو تم ہم سے منہ بھی چھپا کر چلے
بہت آرزو تھی گلی کی تری سو یاں سے لہو میں نہا کر چلے
دکھائی دیئے یوں کہ بے خود کیا ہمیں آپ سے بھی جُدا کر چلے

نہ دیکھا غم دوستاں شکر ہے
ہمیں داغ اپنا دکھا کر چلے

۴۷۰

عالم مری تقلید سے خواہش تری کرنے لگا
میں تو پشیماں ہو چکا لوگوں کو اب ارمان ہے

۴۶۱

میرے تغیرِ حال پر مت جا | اتفاقات ہیں زمانے کے
اس کدورت کو ہم سمجھتے ہیں | ڈھب ہیں یہ خاک میں ملانے کے
بس ہیں دو برگِ گل قفس میں صبا | نہیں بھوکے ہم آب ودانے کے
دمِ آخر ہی کیا نہ آنا تھا | اور بھی وقت تھے بہانے کے
چشمِ انجم سپہر جھپکے ہے | صدقے اس انکھڑیاں لڑانے کے

دل و دیں ہوش و صبر سب ہی گئے
آگے آگے تمہارے آنے کے

۴۶۲

کم فرصتیٔ گل جو کہیں کوئی نہ مانے | ایسے گئے ایام بہاراں کہ نہ جانے
ان ہی چمنوں میں کہ جنھوں میں نہیں اب چھاؤ | کن کن روشوں ہم کو پھرایا ہے ہوا نے

۴۶۳

پہنچا نہیں کیا سمع مبارک میں مرا حال | یہ قصہ تو اس شہر میں مشہور ہوا ہے
بے خوابی تری آنکھوں پہ دیکھوں ہوں مگر رات | افسانہ مرے حال کا مذکور ہوا ہے

۴۶۴

چل قلم غم کی رقم کوئی حکایت کیجے
ہر سرِ حرف پہ فریاد نہایت کیجے

۴۶۵

تیرے بن دیکھے میں مکدّر ہوں | آنکھوں پر اب غبار رہتا ہے
تجھ بن آئے ہیں تنگ جینے سے | مرنے کا انتظار رہتا ہے

۴۶۶

دہر بھی میرؔ طرفہ مقتل ہے | جو ہے سو کوئی دم کو فیصل ہے
بند ہو تجھ سے یہ کھلا نہ کبھو | دل ہے یا خانۂ مقفّل ہے
ٹک گریباں میں سر کو ڈال کے دیکھ | دل بھی کیا لق و دق جنگل ہے
مر گیا کوہ کن اسی غم میں | آنکھ اوجھل پہاڑ اوجھل ہے

۴۸۴

پائے خطاب کیا کیا دیکھے عتاب کیا کیا — دل کو لگا کے ہم نے کھینچے عذاب کیا کیا
کاٹے ہیں خاک اڑا کر جوں گرد باد برسوں — گلیوں میں ہم ہوئے ہیں اُس بن خراب کیا کیا
کچھ گل سے ہیں شگفتہ کچھ سرو سے ہیں قد کش — اس کے خیال میں ہم دیکھیں ہیں خواب کیا کیا

آشفتہ اس کے گیسو جب سے ہوئے ہیں منھ پر
تب سے ہمارے دل کو ہے پیچ و تاب کیا کیا

۴۸۵

وحشی مزاج از بس مانوس بادیہ ہیں — ان کے جنوں میں جنگل اپنا ہوا ہے گھر سا
طرزِ نگاہ اس کی دل لے گئی سبھوں کے — کیا مومن و برہمن کیا گبر اور ترسا

انداز سے ہے پیدا سب کچھ خبر ہے اس کو
گو میر بے سر و پا خبر ہے اس کو بے خبر سا

۴۸۶

حیران رنگِ باغِ جہاں تھا بہت رکا — تصویر کی کلی کی طرح دل نہ وا ہوا
اس کے گئے پہ دل کی خرابی نہ پوچھیے — جیسے کسو کا کوئی نگر ہو لُٹا ہوا

کہتا تھا میر حال تو جب تک تو تھا بھلا
کچھ ضبط کرتے کرتے ترا حال کیا ہوا

۴۸۷

عزت بھی بعد ذلت بسیار چھیڑ ہے — مجلس میں جب خفیف کیا پھر ادب ہے کیا
آتے ہم آپ میں تو نہ پہچانے پھر گئے — اس راہِ صعب عشق میں یارو تعب ہے کیا
آنکھیں جو ہوویں تیری تو نوعین کر رکھے — عالم تمام گر وہ نہیں تو یہ سب ہے کیا
اس آفتاب بن نہیں کچھ سوجھتا ہمیں — گر یہ ہی اپنے دن ہیں تو تاریک شب ہے کیا

کیوں کر تمہاری بات کرے کوئی اعتبار
ظاہر میں کیا کہو ہو، سخن زیرِ لب ہے کیا

۴۸۸

جھمکے دکھا کے طور کو جن نے جلا دیا — آئی قیامت ان نے جو پردہ اُٹھا دیا

دیوان دوم

۴۸۱

بکھری ہے زلف اس رخ عالم فروز پر — ورنہ بناؤ ہووے نہ دن اور رات کا
اشجار ہُوویں خامہ و آب سیہ بحار — لکھنا نہ تو بھی ہو سکے اس کی صفات کا

۴۸۲

جلوہ نہیں ہے نظم میں حسنِ قبول کا — دیوان میں شعر گر نہیں نعتِ رسولؐ کا
جو معتقد نہیں ہے علی کے کمال کا — ہر بال اس کے تن پہ ہے موجب وبال کا

۴۸۳

لذت سے نہیں خالی جانوں کا کھپا جانا — کب خضر و مسیحا نے مرنے کا مزا جانا
یہ بھی ہے ادا کوئی خورشید نمط پیارے — منہ صبح دکھا جانا پھر شام چھپا جانا
گردن کشی کیا حاصل مانند بگولے کی — اس دشت میں سر گاڑے جوں سیل چلا جانا
اس گریۂ خونیں کا ہو ضبط تو بہتر ہے — اچھا نہیں چہرے پر لوہو کا بہا جانا
اے شورِ قیامت ہم سوئے ہی نہ رہ جاویں — اس راہ سے نکلے تو ہم کو بھی جگا جانا
ہے میری تری نسبت روح اور جسد کی سی — کب آپ سے میں تجھ کو اے جان جُدا جانا

جاتی ہے گزر جی پر اس وقت قیامت سی
یاد آوے ہے جب تیرا یک بارگی آجانا

۴۹۴

دل فرطِ اضطراب سے سیماب سا ہوا چہرہ تمام زرد زرِ ناب سا ہوا
شاید جگر گداختہ یک لخت ہو گیا کچھ آب دیدہ رات سے خوناب سا ہوا
اک دن کیا تھا یار نے قد ناز سے بلند خجلت سے سرو جوئے چمن آب سا ہوا
کیا اور کوئی روئے کہ اب جوشِ اشک سے حلقہ ہماری چشم کا گرداب سا ہوا

چل باغ میں کبھی سوتے سے اٹھ کر کبھو کہ گل
تک تک کے راہ دیدۂ بے خواب سا ہوا

۴۹۵

دیکھ آرسی کو یار ہوا محو ناز کا خانہ خراب ہوجیو آئینہ ساز کا
اس لطف سے نہ غنچۂ نرگس کھلا کبھو کھلنا تو دیکھ اس مژۂ نیم باز کا

۴۹۶

غم ابھی کیا محشر مشہور کا شور سا ہے تو ولیکن دور کا
طرفہ آتش خیز سنگستاں ہے دل مقتبس یاں سے ہے شعلہ طور کا

۴۹۷

گلوں کے پیرہن ہیں چاک سارے کھلا تھا کیا کہیں بند اس قبا کا
بچا ہے عمر سے اب ایک حسرت گیا وہ شور سر کا زور پا کا

۴۹۸

جدا جدا پھرے ہے میر سب سے کس خاطر
خیال ملنے کا اس کے اگر نہیں رکھتا

ہم سے تکلف اس کا چلا جائے ہے وہی
کل راہ میں ملا تھا سو منہ ڈھانپ کر چلا

۴۹۹

اس موجِ خیز دہر میں تو ہے حباب سا آنکھیں کھلیں تری تو یہ عالم ہے خواب سا
دوزخ ہوا ہے ہجر میں اس کے جہاں ہمیں سوزِ دروں سے جان پہ ہے اک عذاب سا

اس فتنے کو جگا کے پشیماں ہوئی نسیم — کیا کیا عزیز لوگوں کو ان نے سلا دیا
اب بھی دماغ رفتہ ہمارا ہے عرش پر — گو آسمان نے خاک میں ہم کو ملا دیا
جانی نہ قدر اس گہر شب چراغ کی — دل ریزۂ خزف کی طرح میں اٹھا دیا
تقصیر جان دینے میں ہم نے کبھو نہ کی — جب تیغ وہ بلند ہوئی سر جھکا دیا
وہ آگ ہو رہا ہے خدا جانے غیر نے — میری طرف سے اس کے تئیں کیا لگا دیا

کیا کیا زیان میرؔ نے کھینچے ہیں عشق میں
دل ہاتھ سے دیا ہے جدا، سر جدا دیا

۴۸۹

ہے ابر کی چادر شفقی جوش سے گل کے — مے خانے کے ہاں دیکھیے یہ رنگ ہوا کا
ہاتھ آئینہ رویوں سے اٹھا بیٹھیں نہ کیونکر — بالعکس اثر پاتے تھے ہم اپنی دعا کا

مر جائے گا باتوں میں کوئی غمزدہ یونہی
ہر لحظہ نہ ہو ممتحن ارباب وفا کا

۴۹۰

رہتا ہے ہڈیوں سے مری جو ہما لگا — کچھ دردِ عاشقی کا اسے بھی مزا لگا
عالم کی سیر میرؔ کی صحبت میں ہوگئی — طالع سے مرے ہاتھ یہ بے دست و پا لگا

۴۹۱

ایک سا عالم نہیں رہتا ہے اس عالم کے بیچ — اب جہاں کوئی نہیں یاں ایک عالم ہوگیا
عشق ان شہری غزالوں کا جنوں کو اب کھنچا — وحشتِ دل بڑھ گئی آرامِ جاں رم ہوگیا

ہم نے جو کچھ اس سے دیکھا سو خلافِ چشم داشت
اپنا عزرائیل وہ جانِ مجسم ہوگیا

۴۹۲

معلوم تیرے چہرۂ پُر نور کا سا لطف — بالفرض آسماں پہ گیا بھول مہ ہوا

۴۹۳

مذکور میری سوختگی کا جو چل پڑا — مجلس میں حسن سپند یکایک اچھل پڑا
پہنچے ہے کوئی اس تن نازک کے لطف کو — گل گو چمن میں جامے سے اپنے نکل پڑا

نیمچہ ہاتھ میں مستی سے لہو سی آنکھیں   سج تری دیکھ کے اے شوخ حذر ہم نے کیا
جیسے حسرت لیے جاتا ہے جہاں سے کوئی
آہ یوں کوچۂ دلبر سے سفر ہم نے کیا

۵۰۵

لطف کے حرف و سخن پہلے جو تھے بہر فریب   مدتیں جاتیں ہیں اُن باتوں کا اب مذکور کیا
اٹھ نہیں سکتا ترے در سے شکایت کیا مری   حال میں اپنے ہوں عاجز میں مجھے معذور کیا
ابر سا روتا جو میں نکلا تو بولا طنز سے
آرسی جا دیکھ گھر، برسے ہے منہ پر نور کیا

۵۰۶

شب میکدے سے وارد مسجد ہوا تھا میں   پر شکر ہے کہ صبح تئیں بے خبر رہا
رہتے تو تھے مکاں پہ ولے آپ میں نہ تھے   اُس بن ہمیں ہمیشہ وطن میں سفر رہا
اب چھیڑ یہ رکھی ہے کہ پوچھے ہے بار بار   کچھ وجہ بھی کہ آپ کا منہ ہے اُتر رہا
تسکین دل ہو تب کہ کبھو آ گیا بھی ہو
برسوں سے اس کا آنا یہی صبح پر رہا

۵۰۷

ٹک جوش سا اٹھا تھا مرے دل سے رات کو   دیکھا تو ایک پل ہی میں دریا سا ہو گیا
بے رونقی، باغ ہے جنگل سے بھی پرے   گل سوکھ تیرے ہجر میں کانٹا سا ہو گیا
جلوہ ترا تھا جب تئیں باغ و بہار تھا   اب دل کو دیکھتے ہیں تو صحرا سا ہو گیا
کل تک تو ہم وے ہنستے چلے آئے تھے ہیں
مرنا بھی میرؔ جی کا تماشا سا ہو گیا

۵۰۸

دل کی واشد کے لیے کل باغ میں میں ٹک گیا
سُن گلہ بلبل سے گل کا اور بھی جی رک گیا
عشق کی سوزش نے دل میں کچھ نہ چھوڑا کیا کہیں
لگ اٹھی یہ آگ ناگاہی کہ گھر سب پھک گیا

مدّت ہوئی کہ دل سے قرار و سکوں گئے رہتا ہے اب تو آٹھ پہر اضطراب سا
مواج آب سا ہے ولیکن اُڑے ہے خاک
ہے میرؔ بحرِ بے تہ ہستی سراب سا

۵۰۰

سب سطح ہے پانی کا آئینے کا سا تختہ دریا میں کہیں شاید عکس اس کے بدن کا تھا
خوگر نہیں ہم یوں ہی کچھ ریختہ کہنے سے معشوق جو اپنا تھا باشندہ دکن کا تھا
رہ میرؔ غریبا نہ جاتا تھا چلا روتا
ہر گام گلہ لب پر یارانِ وطن کا تھا

۵۰۱

یہ بھی طرفہ ماجرا ہے کہ اسی کو چاہتا ہوں
مجھے چاہیے ہے جس سے بہت احتراز کرنا

۵۰۲

ایک آن اس زمانے میں یہ دل نہ وا ہوا کیا جانیے کہ میرؔ زمانے کو کیا ہوا
دکھلاتے کیا ہو دستِ حنائی کا مجھ کو رنگ ہاتھوں سے میں تمہارے بہت ہوں جلا ہوا
یوں پھر اٹھا نہ جائے گا اے ابر دشت سے گر کوئی رونے بیٹھ گیا دل بھرا ہوا
از خویش رفتہ میں ہی نہیں اس کی راہ میں آتا نہیں ہے پھر کے اُدھر کا گیا ہوا
لے کر جواب خط کا نہ قاصد پھرا کبھو کیا جانے سرنوشت میں کیا ہے لکھا ہوا
دیکھا نہ ایک گل کو بھی چشمک زنی میں ہائے جب کچھ رہا نہ باغ میں تب میں رہا ہوا
بحرِ بلا سے کوئی نکلتا مرا جہاز
بارے خدائے عزّ و جل ناخدا ہوا

۵۰۳

کھینچا بغل میں میں جو اسے مست پا کے رات کہنے لگا کہ آپ کو بھی اب نشا ہوا
جوں برق مجھ کو ہنستے نہ دیکھا کسو نے پایا تو ابر سا کہیں روتا کھڑا ہوا

۵۰۴

کل دل آزردہ گلستاں سے گذر ہم نے کیا گل لگے کہنے کہ منھ نہ اُدھر ہم نے کیا

۵۱۲

تیغ لے کر کیوں تو عاشق پر گیا زیرِ لب جب کچھ کہا وہ مر گیا
کیا بندھا ہے اس کے کوچے میں طلسم پھر نہ آیا جو کوئی اُودھر گیا

۵۱۳

تھی چشم دم آخر وہ دیکھنے آوے گا سو آنکھوں میں جی آیا پر وہ نظر نہ آیا
گل برگ ہی کچھ تنہا پانی نہیں خجلت سے جنبش سے ترے لب کی یاقوت بھی تر آیا

۵۱۴

یار ہے میرؔ کا مگر گل سا کہ سحر نالہ کش ہے بلبل سا
یاں کوئی اپنی جان ووُ دشوار واں وہی ہے سو ہے تساہل سا
دردِ دل کو ہمارے ٹک دیکھو یہ بھی پُر پیچ اب ہے کاکل سا
کب تھی جرأت رقیب کی اتنی تم نے بھی کچھ کیا تغافل سا
اک نگہ ایک چشمک ایک سخن اِس میں بھی تم کو ہے تامل سا
ٹوٹی زنجیرِ پائے میرؔ مگر
رات سنتے رہے ہیں ہم غل سا

۵۱۵

چمن میں جا کے جو میں گرمِ وصفِ یار ہوا گل اشتیاق سے میرے گلے کا ہار ہوا
ہماری خاک پہ اک بے بسی برستی ہے اِدھر سے ابر جب آیا تب اشکبار ہوا
کریں نہ کیوں کہ یہ تُرکاں بلند پروازی
انھوں کا طائرِ سدرہ نشیں شکار ہوا

۵۱۶

ایک دل کو ہزار داغ لگا اندرونے میں جیسے باغ لگا
میر اس بے نشاں کو پایا جان کچھ ہمارا اگر سراغ لگا

۵۱۷

کہہ دل کو گنوایا ہے یا رنج اٹھایا ہے
اے میرؔ تجھے ہم نے کچھ آج خفا دیکھا

۵۰۹

پھرتا ہے زندگی کے لیے آہ خوار کیا — اس وہم کی نمود کا ہے اعتبار کیا
کیا جانیں ہم اسیر قفس زاد اے نسیم — گل کیسے باغ کہتے ہیں کس کو بہار کیا
آنکھیں برنگِ نقش قدم ہو گئیں سفید — پھر اور کوئی اس کا کرے انتظار کیا
سرکش کسو سے ایسی کدورت رکھے وہ شوخ — ہم اس کی خاکِ راہ ہیں ہم سے غبار کیا
نے وہ نگہ چبھی ہے نہ وے پلکیں گڑ گئیں — کیا جانیے کہ دل کو ہے یہ خار خار کیا
عاشق کے دل سے رکھ نہ تسلی کی چشم داشت — ہے برق پارہ یہ اسے آوے قرار کیا

پاتے ہیں اپنے حال میں مجبور سب کو ہم
کہنے کو اختیار ہے پر اختیار کیا

۵۱۰

غنچہ ہی وہ دہان ہے گویا — ہونٹھ پر رنگ پان ہے گویا
مُردے سے بھی وہ چونکے ہے — اب تلک مجھ میں جان ہے گویا
حیرت روے گل سے مرغِ چمن — چپ ہے یوں بے زبان ہے گویا
مسجد ایسی بھری بھری کب ہے — مے کدہ اک جہان ہے گویا
بس کہ ہیں اس غزل میں شعر بلند — یہ زمین آسمان ہے گویا

سر بسر کیں ہے لیک وہ پُرکار
دیکھو تو مہربان ہے گویا

۵۱۱

ان سختیوں میں کس کا میلان خواب پر تھا — بالیں کی جائے ہر شب یاں سنگ زیرِ سر تھا
کل ہم وہ دونوں یکجا ناگاہ ہو گئے تھے — وہ جیسے برق خاطف میں جیسے ابرِ تر تھا
ہوش اُڑ گئے سبھوں کے شور سحر سے اس کے — مرغِ چمن اگرچہ یک مشتِ بال و پر تھا
پھر آج یہ کہانی کل شب پہ رہ گئی ہے — سوتا نہ رہتا ٹک تو قصہ ہی مختصر تھا
عصمت کو اپنی واں تو روتے ملک پھریں ہیں — لغزش ہوئی جو مجھ سے کیا عیب میں بشر تھا

تھا وہ بھی اک زمانہ جب نالے آتشیں تھے
چاروں طرف سے جنگل جلتا دہر دہر تھا

۵۲۳

آیا نہ پھر وہ آئینہ رو ٹک نظر مجھے		میں منھ پر اپنے خاک ملے جابجا پھرا
طالع پھرے، سپہر پھرا، قلب پھر گئے		چندے وہ رشکِ ماہ جو ہم سے جدا پھرا
آنسو گرا نہ رازِ محبت کا پاس کر		میں جیسے ابر برسوں تئیں دل بھرا پھرا

بے صرفہ رونے لگ گئے ہم بھی اگر کبھو
تو دیکھیو کہ بادیہ سارا بہا پھرا

۵۲۴

عشق نے کیا کیا تصرف یاں کیے ہیں آجکل		چشم کو پانی کیا سب، دل کو سب لوہو کیا
ہاتھ پر رکھ ہاتھ اب وہ دو قدم چلتا نہیں		جن نے بالش خواب کا برسوں مرا بازو کیا

پھول نرگس کا لیے حیراں کھڑا تھا راہ میں
کس کی چشمِ پُر فسوں نے میر کو جادو کیا

۵۲۵

کل صبح سیر باغ میں دل اور میرا رک گیا		بلبل نہ بولا منھ سے کچھ گل ٹک نہ مجھ سے وا ہوا
کتنوں کے دل بے جاں ہوئے کتنے نہ جانا کیا ہوئے		چلنے میں اس کے دو قدم ہنگامہ اک برپا ہوا

۵۲۶

تمام رو رجو گل میں پتے شراب پھرا		بسان جام لیے دیدۂ پر آب پھرا
اثر بن آہ کے وہ منھ ادھر نہ ہوتا تھا		پھری ہے مگر کچھ کہ آفتاب پھرا
وہ رشک گنج ہی نایاب تھا بہت ورنہ		خرابہ کون سا جس میں نہ میں خراب پھرا

کہیں ٹھہرنے کی جا یاں نہ دیکھی میں نے میر
چمن میں عالم امکاں کے جیسے آب پھرا

۵۲۷

اڑتی ہے خاک یارب اِشام و سحر جہاں میں		کس کے غبارِ دل سے یہ خاک داں بنایا
نقشِ قدم سے اس کے گلشن کی طرح ڈالی		گردِ رہ اس کی لے کر سروِ رواں بنایا

۵۲۸

یہ میر ستم کشتہ کسو وقت جواں تھا		اندازِ سخن کا سببِ شور و فغاں تھا

۵۱۸

دست و پا گم کرنے سے میرے کھلے اسرارِ عشق دیکھ کر کھویا گیا سا مجھ کو ہر یک پا گیا
داغ محجوبی ہوں اس کا میں کہ میرے روبرو عکس اپنا آرسی میں دیکھ کر شرما گیا
ہو گئے تحلیل سب اعضا مرے پا کر گداز
رفتہ رفتہ، ہجر کا اندوہ مجھ کو کھا گیا

۵۱۹

اپنا بھی قصد تھا سرِ دیوارِ باغ کا توڑا ہی تھا قفس کو پہ صیّاد آگیا
دیکھیں گے آدمی کی روش میرہم تری گر سامنے سے ٹک وہ پری زاد آگیا

۵۲۰

گرم مجھ سوختہ کے پاس سے جانا کیا تھا آگ لینے مگر آئے تھے یہ آنا کیا تھا
مدعی ہوتے ہیں اک آن میں اب تو دلدار مہر جب رسم تھی یارب وہ زمانا کیا تھا

۵۲۱

دل کی آبادی کو پہنچا اپنے گویا چشم زخم دیکھتے ہی دیکھتے یہ شہر سب ویراں ہوا
سبز بختی پر ہے اس کی طائرِ سدرہ کو رشک جو شکار اس تیغ کے سائے تلے بے جاں ہوا
طائرانِ باغ کو بیتِ بحشتی کا دماغ پر ہر اک دردِ سخن سے میر کے نالاں ہوا
خاک پر بھی دوڑتی ہے چشمِ مہر و ماہِ چرخ کس دنی الطبع کے گھر جا کے میں مہماں ہوا
اُس کے میرے بیچ میں آئینہ آیا تھا و لے صورتِ احوال ساری دیکھ کر حیراں ہوا
تم جو کل اس راہ نکلے برق سے ہنستے گئے
ابر کو دیکھو کہ جب آیا ادھر گریاں ہوا

۵۲۲

آیا ہے ابر جب کا قبلے سے تیرا تیرا مستی کے ذوق میں ہیں آنکھیں بہت ہی خیرا
کیا کم ہے ہولناکی صحرائے عاشقی کی شیروں کو اس جگہ پر ہوتا ہے قشعریرا
آئینے کو بھی دیکھو پر ٹک ادھر بھی دیکھو حیران چشمِ عاشق دیکھے ہے جیسے ہیرا
غیرت سے میر صاحب سب جذب ہو گئے تھے
نکلا نہ بوند لو ہو سینہ جو اُن کا چیرا

۵۳۳

نکتہ مشتاق و یار ہے اپنا شاعری تو شعار ہے اپنا
بے خودی لے گئی کہاں ہم کو دیر سے انتظار ہے اپنا
کچھ نہیں ہم مثالِ عنقا لیک شہر شہر اشتہار ہے اپنا
جس کو تم آسمان کہتے ہو سو دلوں کا غبار ہے اپنا
دل کے دل ہم جو ہو گئے مجبور
اس میں کیا اختیار ہے اپنا

۵۳۴

رو کش ہوا جو شب وہ بالائے بام نکلا ماہِ تمام یارو کیا ناتمام نکلا
ہو گوشہ گیر شہرت مدِ نظر اگر ہے عنقا کی طرح اپنا عزلت سے نام نکلا

۵۳۵

کیا کہیں کچھ کہا نہیں جاتا اب تو چپ بھی رہا نہیں جاتا
اس در تر کا حیرتی ہے بحر تب تو اس سے بہا نہیں جاتا

۵۳۶

کچھ عشق و ہوس میں فرق بھی کر
کیدھر ہے وہ امتیاز تیرا

۵۳۷

مرا خوں تجھ پہ ثابت ہی کرے گا
کنارے بیٹھ کر ہاتھوں کو دھونا

۵۳۸

صد شکر کہ داغِ دل افسردہ ہوا ورنہ یہ شعلہ بھڑکتا تو گھر بار جلا جاتا
کہتے تو ہو یوں کہتے، یوں کہتے جو وہ آتا یہ کہنے کی باتیں ہیں کچھ بھی نہ کہا جاتا

۵۳۹

بالقوہ ملک دکھایئے چشم پر آب کا دامن پکڑ کے رویئے یک دم سحاب کا
جو کچھ نظر پڑے ہے حقیقت میں کچھ نہیں عالم میں خوب دیکھو تو عالم ہے خواب کا

جادو کی پڑی پرچۂ ابیات تھا اس کا — منھ تکیے غزل پڑھتے عجب سحر بیاں تھا
جس راہ سے وہ دل زدہ دلّی میں نکلتا — ساتھ اُس کے قیامت کا سا ہنگامہ رواں تھا
افسردہ نہ تھا ایسا کہ جوں آب زدہ خاک — آندھی تھی، بلا تھا، کوئی آشوب جہاں تھا
کس مرتبہ تھی حسرتِ دیدار مرے ساتھ — جو پھول مری خاک سے نکلا نگراں تھا
مجنوں کو عبث دعویٔ وحشت ہے مجھی سے — جس دن کہ جنوں مجھ کو ہوا تھا وہ کہاں تھا

غافل تھے ہم احوالِ دل خستہ سے اپنے
وہ گنج اس کُنج خرابی میں نہاں تھا

۵۲۹

گھر کے آگے سے ترے نعش گئی عاشق کی — اپنے دروازے تلک کو بھی تو آیا ہوتا
جو ہے سو بے خود رفتار ہے تیرا اے شوخ — اس روش سے نہ قدم تو نے اٹھایا ہوتا

کم کم اٹھتا وہ نقاب آہ کہ طاقت رہتی
کاش یک بار ہمیں منھ نہ دکھایا ہوتا

۵۳۰

مکثِ طالع دیکھ وہ ایدھر کو جل کر رہ گیا — رات جو تھی چاند سا گھر سے نکل کر رہ گیا
کیا ہمیں کو یار کے تیغے نے کھا کر دم لیا — ایسے بہتیروں کو یہ اژدر نگل کر رہ گیا

ایک ڈھیری راکھ کی تھی صبح جائے میرؔ پر
برسوں سے جلتا تھا شاید رات جل کر رہ گیا

۵۳۱

ملا کہیں تو دکھادیں گے عشق کا جنگل — بہت ہی خضر کو غرّہ ہے رہنمائی کا
رکھا ہے باز ہمیں در بلا کے پھرنے سے — سروں پہ اپنے ہے احساں شکستہ پائی کا

نہ پوچھ مہندی لگانے کی خوبیاں اپنی
جگر ہے خستہ ترے پنجۂ حنائی کا

۵۳۲

نام اس کا سن کے آنسو گر ہی پڑے ملک سے — دل کا لگاؤ یارو چھپتا نہیں چھپایا
زلف سیاہ اس کی جاتی نہیں نظر سے — اس چشم روسیہ نے روز سیہ دکھایا

ایک تھے ہم وِے نہ ہوتے ہست اگر اپنا ہونا بیچ میں حائل ہوا
میرؔ ہم کسی ذیل میں دیکھ اس کی آنکھ
ہوش اہلِ قدس کا زائل ہوا

۵۴۴

فقیر بستی میں تھا تو ترا زیاں کیا تھا کبھو جو آن نکلتا کوئی صدا کرتا
تلاطم آنکھ کے صد رنگ رہتے تھے تجھ بن کبھو کبھو جو یہ دریائے خوں چڑھا کرتا
گئے پہ تیرے نہ تھا ہم نفس کوئی اے گل کبھو نسیم سے میں دردِ دل کہا کرتا
کہاں سے نکلی یہ آتش نہ مانتا تھا میں شروعِ ربط میں اس کے جو دل جلا کرتا
موئے ہی رہتی تھی عزت، مری محبت میں
ہلاک آپ کو کرتا نہ میں تو کیا کرتا

۵۴۵

بندھا رات آنسو کا کچھ تار سا ہوا ابرِ رحمت گنہ گار سا
کوئی سادہ ہی اس کو سادہ کہے ہمیں تو لگے ہے وہ عیّار سا
کھڑے منتظر ضعف جو آگیا گِرا اس کے در پر میں دیوار سا
گل و سروِ اچھے سبھی ہیں وِلے نہ نکلا چمن میں کوئی یار سا
دکھاؤں متاعِ وفا کب اُسے
لگا واں تو رہتا ہے بازار سا

۵۴۶

حیران ہے لحظہ لحظہ طرزِ عجب عجب کا جو رفتہ محبت واقف ہے اس کے ڈھب کا
کہتے ہیں کوئی صورت بن معنی یاں نہیں ہے یہ وجہ ہے کہ عارف منہ دیکھتا ہے سب کا
منہ اس کے منہ کے اوپر شام و سحر رکھوں ہوں
اب ہاتھ سے دیا ہے سر رشتہ میں ادب کا

۵۴۷

کل نہ آنے میں ایک یاں تیرے
آج سو سو طرف گمان گیا

شاید کہ قلب یار بھی ٹک اس طرف پھرے
میں منتظر زمانے کے ہوں انقلاب کا
دریا دلی جنھیں ہے نہیں ہوتے کاسہ لیس
دیکھا ہے واژگون ہی پیالہ حباب کا
بارے نقاب دن کو جو رکھتا ہے منھ پہ تو
پردہ سا رہ گیا ہے کچھ اک آفتاب کا

۵۴۰

بعد مدت اس طرف لایا تھا اس کو جذبِ عشق
بخت کی برگشتگی سے آتے آتے پھر گیا

۵۴۱

اس بدزباں نے صرف سخن آہ کب کیا
چپکے ہی چپکے اُن نے ہمیں جاں بلب کیا
عمامے کو شیخ کہیں ہے کدے بے جا
بس مغبچوں نے حد سے زیادہ ادب کیا
ظاہر ہوا نہ مجھ پہ کچھ اس ظلم کا سبب
کیا جانوں خون اُن نے مرا کس سبب کیا
اُس رُخ سے دل اٹھایا تو زلفوں میں جا پھنسا
القصہ اپنے روز کو ہم نے بھی شب کیا
یکساں کیا نہیں ہے ہمیں خاک رہ سے آج
ایسا ہی کچھ سلوک کیا ان نے جب کیا
بچھڑے تمھارے اپنا عجب حال ہو گیا
جس کی نگاہ پڑ گئی اُن نے عجب کیا
برسوں سے اپنے دل کی ہے دلیس کہ یار نے
اک دن جدا نہ غیر سے ہم کو طلب کیا

۵۴۲

طوفان میرے رونے سے آخر کو ہو رہا
یونان کی طرح بستی یہ سب میں ڈبو رہا
بہتوں نے چاہا، کہیے، یہ کوئی نہ کہہ سکا
احوال عاشقی کا مری گو مگو رہا
آنسو تھما نہ، جب سے گیا وہ نگاہ سے
پایانِ کار آنکھوں کو اپنی میں رو رہا

۵۴۳

لعل پر کب دل مرا مائل ہوا
اُس لب خاموش کا قائل ہوا
لڑ گئیں آنکھیں اُٹھائی دل نے چوٹ
یہ تماشائی عبث گھائل ہوا

آگیا عشق میں جو پیش نشیب اور فراز ہوئے ہیں خاک برابر اسے ہموار کیا

میر اے کاش زباں بند رکھا کرتے ہم
صبح کے بولنے نے ہم کو گرفتار کیا

۵۵۵

ہر سحر آئینہ رہتا ہے ترا منھ تکتا دل کی تقلید نہ کرتا تو نہ حیراں ہوتا
میری زنجیر کی جھنکار نہ سنتا کوئی شورِ مجنوں نہ اگر سلسلہ جنباں ہوتا

۵۵۶

شب رفتہ میں اُس کے در پر گیا سگِ یار آدم گری کر گیا
ہوئے یار کیا کیا خراب اس بغیر وہ کس خانہ آباد کے گھر گیا

۵۵۷

کیا ہے جو راہ دل کی طے کرتے مر گئے ہم جوں نقش پا ہمارا تا دیر اثر رہے گا
پایانِ کار دیکھیں کیا ہووے دل کی صورت ایسا ہی جو وہ چہرہ پیشِ نظر رہے گا

اب رفتگی روّیہ اپنا کیا ہے میں نے
میر ایہ ڈھب دلوں میں کچھ راہ کر رہے گا

۵۵۸

کب کھبا جاتا تھا یوں آنکھوں میں جیسا صبح تھا پھول خوش رنگ اور اس کے فرش پر بچھ کر ہوا
جل گیا یاقوت اس کے لعلِ لب جب ہل گئے گوہر خوش آب اندازِ سخن سے تر ہوا

۵۵۹

کبھو تو دربدر ہوں میں کبھو ہوں کنج میں کہاں کہاں لیے پھرتا ہے شوق اس در کا
ہمیں، کہ جلنے سے خوگر ہیں، آگ میں ہے عیش محیط میں تو تلف ہونا ہے سمندر کا
شکستہ بالی و لب بستگی پر اب کی نہ جا چمن میں شور مرا اب تلک بھی ہے پر کا

پھرے ہے خاک ملے منھ پہ یا نمد پہنے
یہ آئینہ ہے نظر کردہ کس قلندر کا

۵۶۰

کیا زہر چشم یار کو کوئی بیاں کرے جس کی طرف نگاہ کی اُس کو سُلا رکھا

۵۴۸

دل میں رہا نہ کچھ تو کیا ہم نے ضبطِ شوق
یہ شہر جب تمام ہوا تب نسق ہوا

برسوں تری گلی میں چمن ساز جو رہا
سو دیدہ اب گداختہ ہو کر شفق ہوا

۵۴۹

کل میں کہا وہ طور کا شعلہ کہاں گرا
دل نے جگر کی اور اشارت کی یاں گرا

شور کہ مری نہاد سے تجھ بن اُٹھا تھا رات
جس سے کیا خیال کہ یہ آسماں گرا

۵۵۰

یا خط چلے ہی آتے تھے یا حرف ہی نہیں
شاید کہ سادگی کا وہ ہنگام ہو چکا

۵۵۱

بلبل کی اور گل کی جو صحبت کی میر سیر
دل اپنا دلبروں کی طرف سے اُچٹ گیا

نکلا تھا آج صبح بہت گرم ہو ولے
خورشید اُس کو دیکھتے ہی سرد ہو گیا

بے پردہ اس کی شوخی قیامت ہے دیکھیو
یاں خاک سی اُڑا دی فلک گرد ہو گیا

دفتر لکھے ہیں میر نے دل کے الم کے یہ
یاں اپنے طور و طرز میں وہ فرد ہو گیا

۵۵۲

کیا تو نمود کس کی کیسا کمال تیرا
اے نقشِ وہم آیا کیدھر خیال تیرا

اب صبح پاس گل کے ہو کر نہیں نکلتی
دیکھا نسیم نے بھی شاید جمال تیرا

پہلا قدم ہے انساں پامالِ مرگ ہونا
کیا جانے رفتہ رفتہ کیا ہو مآل تیرا

۵۵۳

اگرچہ خاک اُڑائی دیدۂ تر نے بیاباں کی
ولے نکلا نہ خاطر خواہ رونے سے غبار اپنا

۵۵۴

جی ہی جاتے سنے ہیں عشق کے مشہور ہوئے
کیا کیا ہم نے کہ اس راز کو اظہار کیا

دیکھا پلک اٹھاکے تو پایا نہ کچھ اثر اے عمر برق جلوہ گئی تو شتاب کیا
ہر چند میر بستی کے لوگوں سے ہے نفور
پر ہائے آدمی ہے وہ خانہ خراب کیا

۵۶۷

گلوگیر ہی ہو گئی یا وہ گوئی
رہا میں خموشی کو آواز کرتا

۵۶۸

مدت میں وہ ہوا شب ہم بستر آکے میرا خوابیدہ طالعوں نے اک خواب سا دکھایا
طرزِ نگہ سے اس کی بے ہوش کیا ہوں میں ہی ان مست انکھڑیوں نے بہتیروں کو سلایا
آنکھیں کھلیں تو دیکھا جو کچھ نہ دیکھنا تھا
خوابِ عدم سے ہم کو کاہے کے تئیں جگایا

۵۶۹

سمندر کا میں کیوں احساں سہوں گا مرے آنسو نہیں، اُن پر بہوں گا
نہ تو آوے، نہ جاوے بیقراری یونہی اک دن سنا میں مر رہوں گا
اگر جیتا رہا میں میر اے یار
تو شب کو مو بہ مو قصہ کہوں گا

۵۷۰

عشق سے دل یہ تازہ داغ جلا
اس سیہ خانے میں چراغ جلا

۵۷۱

اندوہ سے ہوئی نہ رہائی تمام شب مجھ دل زدہ کو نیند نہ آئی تمام شب
جب میں شروع قصہ کیا آنکھیں کھول دیں یعنی تھی مجھ کو چشم نمائی تمام شب
چشمک چلی گئی تھی ستاروں کی صبح تک کی آسماں نے دیدہ درائی تمام شب
بختِ سیہ نے دیر میں کل یاوری سی کی تھی دشمنوں سے ہم کو لڑائی تمام شب
بیٹھے ہی گزری وعدے کی شب وہ نہ آپھرا ایذا عجب طرح کی اٹھائی تمام شب

ہم سرہی جاتے عشق میں ایسا سنا کیے　　اس راہِ خوفناک میں کیوں تم نے پار رکھا

کیا میں ہی محوِ چشمکِ انجم ہوں خلق کو
اس مہ نے ایک جھمکی دکھا کر لگا رکھا

۵۶۱

میں جوانی میں مے پرست رہا　　گردن شیشہ ہی میں دست رہا
سر پہ پتھر جنوں میں کب نہ پڑے　　یہ سبو ثابتِ شکست رہا

۵۶۲

گئی نیند شیون سے بلبل کی رات　　کہیں دل ہمارا گرفتار تھا
قد یار کے آگے سروِ چمن　　کھڑا دور جیسے گنہ گار تھا

۵۶۳

یہ شب ہجر سر کرے ہے پرے　　ہو سفیدی کا جس جگہ سایا
مر گیا تس پہ سنگ سار کیا　　نخل ماتم مرا یہ پھل لایا

صحن میں میرے اے گل مہتاب
کیوں شگوفہ تو کھلنے کا لایا

۵۶۴

سب گئے ہوش و صبر و تاب و تواں　　دل سے اک داغ ہی جدا نہ ہوا
اُٹھ گیا میر وہ جو بالیں سے　　پھر مری جان مجھ میں کچھ نہ رہا

۵۶۵

اندوہ و غم کے جوش سے دل رک کے خوں ہوا　　اب کے مجھے بہار سے آگے جنوں ہوا
جی میں تھا خوب جا کے خرابے میں روئیے　　سیلاب آیا، آکے چلا، کیا شگوں ہوا
ہوں داغِ نازکی کہ کیا تھا خیالِ بوس　　گلبرگ سا وہ ہونٹھ جو تھا نیلگوں ہوا

میر اُن نے سرگزشت سنی ساری رات کو
افسانہ عاشقی کا ہماری فسوں ہوا

۵۶۶

ہستی ہے اپنے طور پہ جوں بحر جوش میں　　گرداب کیسا، موج کہاں ہے حباب کیا

۵۷۶

اس عمر برق جلوہ کی فرصت بہت ہے کم — جو کام پیش آوے تجھے اس میں ہو شتاب
یہ بستیاں اجڑے کہیں بستیاں بھی ہیں — دل ہو گیا خراب جہاں پھر رہا خراب
ٹک دل کے نسخے ہی کو کیا کر مطالعہ — اس درس گہ میں حرف ہمارا ہے اک کتاب

کاش اس کے روبرو نہ کریں مجھ کو حشر میں
کتنے مرے سوال ہیں جن کا نہیں جواب

۵۷۷

سادہ ذہنی ہیں نکتہ چیں تھے تم — اب تو ہیں حرف آشنا صاحب
شوق رخ، یاد لب، غمِ دیدار — جی میں کیا کیا مرے رہا صاحب

کن نے سن شعر میر یہ نہ کہا
کہیو پھر ہائے کیا کہا صاحب

۵۷۸

فسانہ شاخ در شاخ اس نہالِ حسن کے غم کا
کہاں اے میر بے برگ و نوا اتمام کریے اب

۵۷۹

تھی چشم یہ رکے گا پلکوں سے گریہ لیکن — ہوتی ہے بند کوئی تنکوں سے راہ سیلاب
اس بحر حسن کے تئیں دیکھا ہے آپ میں کیا — جاتا ہے صدقے اپنے جو لحظہ لحظہ گرداب

نکلی ہیں اب کے کلیاں اس رنگ سے چمن میں
سر جوڑ جوڑ جیسے مل بیٹھتے ہیں احباب

۵۸۰

یہ کس آشفتہ کی جمعیت دل تھی منظور
بال بکھرے ترے منھ پر کہیں ہیں رات کی بات

۵۸۱

دیکھیں تو کیا دکھائے یہ افراط اشتیاق
لگتی ہیں تیری آنکھیں ہمیں پیاریاں بہت

سنا ہٹے سے دل گزر جائیں سو کہاں / بلبل نے گو کی نالہ سرائی تمام شب

تارے سے میری پلکوں پہ قطرے سرشک کے
دیتے رہے ہیں میرؔ دکھائی تمام شب

۵۷۲

داغ ہوں جلتا ہے دل بے طور اب / دیکھیے کیا گل کھلے ہے اور اب

شعر پڑھتے پھرتے ہیں سب میرؔ کے / اس قلم رو میں ہے اُن کا دور اب

۵۷۳

پھول اس چمن کے دیکھتے کیا کیا جھڑے ہیں ہائے / سیل بہار آنکھوں سے میری رواں ہے اب

جن و ملک زمین و فلک سب نکل گئے / بار گراں عشق و دل ناتواں ہے اب

پیش از دمِ سحر مرا رونا لہو کا دیکھ / پھوٹے ہے جیسے سانجھ وہی یاں سماں ہے اب

نالاں ہوئی کہ یاد ہمیں سب کو دے گئی
گلشن میں عندلیب ہماری زباں ہے اب

۵۷۴

شبنم سے کچھ نہیں ہے گل و یاسمن میں آب / دیکھ اس کو بھر بھر آوے ہے سب کے دہن میں آب

سوزش بہت ہو دل میں تو آنسو کو پی نہ جا / کرتا ہے کام آگ کا ایسی جلن میں آب

لو شدھ شتاب فاختہ گریہ ناک کی / آیا نہیں ہے دیر سے جوے چمن میں آب

دیکھو تو کس روانی سے کہتے ہیں شعر میرؔ
دُر سے ہزار چند ہے ان کے سخن میں آب

۵۷۵

جیسا مزاج آگے تھا میرا سو کب ہے اب / ہر روز دل کو سوز ہے ہر شب تعب ہے اب

جاں بخشیاں جو پیش تر از خط کیا کیے / اُن ہی لبوں سے خلق خدا جاں بلب ہے اب

نے چاہ وہ اسے ہے نہ مجھ کو ہے وہ دماغ / جانا مرا ادھر کو بشرطِ طلب ہے اب

جاتا ہوں ان کو ملنے تو کہتا ہے دن ہے میرؔ
جو شب کو جائیے تو کہے ہے کہ شب ہے اب

۵۸۹

پردہ اٹھتا ہے تو پھر جان پر آبنتی ہے   خوبی عاشق کی نہیں عشق کے اظہار کے بیچ
توجو جاتا ہے چمن میں تو تماشے کے لیے [۵۸۹] موسم رفتہ بھی پھر آوے ہے گلزار کے بیچ

۵۹۰

سرسری مت جہاں سے جا غافل   پاؤں تیرا پڑے جہاں ٹک سوچ
پھیل اتنا پڑا ہے کیوں یاں تو   یار اگلے گئے کہاں ٹک سوچ
گل و رنگ و بہار پردے ہیں
ہر عیاں میں ہے وہ نہاں ٹک سوچ

۵۹۱

مرغِ چمن نے زور رُلایا سبھوں کے تئیں
میری غزل پڑھی تھی شب اک روضہ خواں کی طرح

۵۹۲

ہم گرفتاروں سے وحشت ہی کرے ہے وہ غزال
کوئی تو بتلاؤ اُس کے دام میں لانے کی طرح

۵۹۳

صنم فراق میں مَیں تیرے کچھ تو کر رہتا
یہ کیا کروں کہ مرا ہاتھ زیرِ سنگ ہے شوخ

۵۹۴

رہیے بغیر تیرے اے رشک ماہ تا چند
آنکھوں میں یوں ہماری عالم سیاہ تا چند

۵۹۵

پہنچی شاید جگر تک آتشِ عشق   خشک ہیں سب شرار کے مانند
کو دماغ اس کی رہ سے اٹھنے کا   بیٹھے اب ہم غبار کے مانند
کوئی نکلے کلی تو لاوے کی
اس دل داغدار کے مانند

۵۸۲

ہجر میں کیا کیا سمے دیکھے ہیں اِن آنکھوں سے میں زرد رخ پر لالہ گوں آنسو بہا کرتا تھا رات
بعد میرے اس غزل پر بھی بہت رو دیں گے لوگ میں بھی ہر ہر بیت پر اُس کی بکا کرتا تھا رات

دیکھ خالی جا کہیں گے برسوں اہلِ روزگار
میرؔ اکثر دل کا قصہ یاں کہا کرتا تھا رات

۵۸۳

آئینہ پانی پانی رہا اس کے سامنے کہیے جہاں کہوں یہ تو ہے روبرو کی بات
سر گل نے پھر جھکا کے اٹھایا نہ شرم سے گلزار میں چلی تھی کہیں اس کے رو کی بات

۵۸۴

عالم سیاہ خانہ ہے کس کا کہ روز و شب یہ شور ہے کہ دیتی نہیں کچھ سُنائی بات
اک دن کہا تھا یہ کہ خموشی میں ہے وقار سو مجھ سے ہی سخن نہیں میں جو بنائی بات

۵۸۵

ہم اٹھے روتے تو لی گردوں نے پھر راہِ گریز
بیٹھ جاوے گا یہ ماتم خانہ بام و در سمیت

۵۸۶

دیکھیے کب ہو وصال اب تو لگے ہے ڈر بہت کوفت گزرے ہے فراقِ یار میں جی پر بہت
دیکھ روے زرد پر بھی میرے آنسو کی ڈھلک اے کہ تو نے دیکھی ہے غلطانیٔ گوہر بہت

کم مجھی سے بولنا، کم آنکھ مجھ پر کھولنا
اب عنایت یار کی رہتی ہے کچھ ایدھر بہت

۵۸۷

آگ سا تو جو ہوا اے گلِ تر اُن کے بیچ صبح کی باد نے کیا پھونک دیا کان کے بیچ
گھر میں آئینے کے کب تک تمہیں نازاں دیکھوں کبھو تو آؤ مرے دیدۂ حیران کے بیچ

۵۸۸

سن اے جنوں کہ مجھ میں نہیں کچھ سوائے دم تار ایک یہی رہ گیا ہے پیرہن کے بیچ
سرسبز ہند ہی میں نہیں کچھ یہ ریختہ ہے دھوم میرے شعر کی سارے دکھن کے بیچ

طائرِ خوش زمزمہ کنجِ قفس میں ہے خموش
چہچہے چہیاں کریں ہیں صحنِ گلشن میں ہزار

کیا کہوں سوئے چمن ہوتا جو میں سرگرمِ گشت
پھول گل جب کھلنے لگتے جوش زن ہوتی بہار

رفتہ رفتہ ہو گئیں آنکھیں مری دونوں سفید
بسکہ نالے کا کیا یاروں کے میں نے انتظار

اب بیاباں در بیاباں ہے مرا شور و فغاں
گو چمن میں خوش کی تم نے میری جائے نالہ دار

منہ پہ آویں گے سخن آلودۂ خونِ جگر
کیونکہ یارانِ زماں سے خاک ہے دل جوں انار

۶۰۱

اک بار تونے آکر خاطر نہ رکھی میری
میں جی سے اپنے گذرا سو بار تیری خاطر

۶۰۲

آغشتہ خونِ دل سے سخن تھے زبان پر
رکھے نہ تم نے کان ٹک اس داستان پر

کچھ ہو رہے گا عشق و ہوس میں بھی امتیاز
آیا ہے اب مزاج ترا امتحان پر

۶۰۳

آئینے کی مشہور پریشاں نظری ہے
تو سادہ ہے ایسوں کو نہ دیدار دیا کر

۶۰۴

ہر چند چپ ہوں لیک مرا حال ہے عجب
احوال پرسی تو نہ کرے تو عجب ہے اور

کیا کہیے حال دل کا جدائی کی رات میں
گذرے ہے کب کہانی کہے سے یہ شب ہے اور

۶۰۵

فرصت سے اس چمن کی گل رو کے میں جو پوچھا
چشمک کی ایک گل نے میری طرف کو ہنس کر

جی رک گیا کہیں تو پھر ہوئے گا اندھیرا
مت چھیڑ ابر مجھ کو یوں ہی برس برس کر

اس قافلے میں کوئی دل آشنا نہیں ہے
ٹکڑے گلے کے اپنے ناحق نہ اے جرس کر

صیاد اگر اجازت گل گشت کی نہیں ٹک
دیوار باغ کو تو بارے درِ قفس کر

۵۹۶

رہے گی ایسی ہی گر بے کلی ہمیں اس سال — تو دیکھیو کہ رہے ہم قفس میں مر صیّاد
چمن کی باؤ کے آتے خبر نہ اتنی رہی — کہ مَیں کدھر ہوں، کدھر ہے قفس، کدھر صیّاد
شکستہ بالی کو چاہے تو ہم سے ضامن لے — شکار موسمِ گُل میں ہمیں نہ کر صیّاد
ہوا نہ وا درِ گلزار اپنے ڈھب سے کبھو — کُھلا سو منھ پہ ہمارے قفس کا در صیّاد
سنا ہے بھڑکی ہے اب کی بہت ہی آتشِ گل — چمن میں اپنے بھی ہیں خار و خس کے گھر صیّاد

لگی بہت رہیں چاکِ قفس سے آنکھیں لیک
پڑا نہ اب کی کوئی پھول گل نظر صیّاد

۵۹۷

لڑکے پھر آئے ڈر گئے شاید — بگڑے تھے کچھ سنور گئے شاید
سب پریشان دلی میں شب گزری — بال اس کے بکھر گئے شاید
ہیں مکان و سرا و جا خالی — یار سب کوچ کر گئے شاید
آنکھ آئینہ رو چھپاتے ہیں — دل کو لے کر مُکر گئے شاید
لوہو آنکھوں میں اب نہیں آتا — زخم اب دل کے بھر گئے شاید
اب کہیں جنگلوں میں ملتے نہیں — حضرت خضر مر گئے شاید

شور بازار سے نہیں اُٹھتا
رات کو میر گھر گئے شاید

۵۹۸

جدائی کے حالات میں کیا کہوں — قیامت تھی ایک ایک ساعت کے بعد
سخن کی نہ تکلیف ہم سے کرو — لہو ٹپکے ہے اب شکایت کے بعد

۵۹۹

مَیں مشت خاک یارب بارِ گرانِ غم تھا
کیا کہیے آ پڑا ہے اک آسماں زمیں پر

۶۰۰

اے صبا گر شہر کے لوگوں میں ہو تیرا گزر — کہیو ہم صحرا نوردوں کا تمامی حال زار

سر و کار آہ کب تک خامہ و کاغذ سے یوں رکھیے
رکھے ہے انتہا احوال کی تحریر بھی آخر
پھرے ہے باولا سا پیچھے ان شہری غزالوں کے
بیاباں مرگ ہوگا اس چلن سے میرؔ بھی آخر

۶۱۱

کیا لطف تھا کہ میکدے کی پشت بام پر سوتے تھے مست چادر مہتاب تان کر
اُس گوہر مُراد کو پایا نہ ہم نے میرؔ پایانِ کار مر گئے یوں خاک چھان کر

۶۱۲

مجھ کو قفس میں سنبل و ریحاں کی کیا خبر
کہہ اے نسیم صبحِ گلستاں کی کیا خبر

۶۱۳

ناسازی و خشونت جنگل ہی چاہتی ہے
شہروں میں ہم نہ دیکھا بالیدہ ہوتے کیکر

۶۱۴

سو بار ایک دم میں گیا ڈوب ڈوب جی
پر بحرِ غم کی پائی نہ کچھ انتہا ہنوز

۶۱۵

ہے میرے لو ہو رونے کا آثار سا ہنوز کوچہ کوئی کوئی ہے چمن زار سا ہنوز
سایہ سا آگیا تھا نظر اُس کا ایک دن مبہوت میں پھروں ہوں پری وار سا ہنوز
برسوں سے گل چمن میں نکلتے ہیں رنگ رنگ نکلا نہیں ہے ایک رخِ یار سا ہنوز
دیکھا تھا خانہ باغ میں پھرتے اسے کہیں
گل حیرتی ہے صورتِ دیوار سا ہنوز

۶۱۶

رُلایا ہم نے پہروں رات اس کو کہا یہ قصّۂ غم جس کسو پاس
قیامت ہے نہ اے سرمایۂ جاں نہ ہووئے وقت مرنے کے بھی تو پاس

۶۰۶

تدبیر دوستوں کی مجھے نفع کیا کرے — بیماری اور کچھ ہے کریں ہیں دوا کچھ اور
صورت پرست ہوتے نہیں معنیٰ آشنا — ہے عشق سے بتوں کے مرا مدعا کچھ اور

۶۰۷

چمکی ہے جب سے برقِ سحر گلستاں سے اور — جی لگ رہا ہے خار و خسِ آشیاں کی اور
رنگ سخن تو دیکھ کہ حیرت سے باغ میں — رہ جاتے ہیں گے دیکھ کے گل اُس وہاں کی اور
کیا بے خبر ہے رفتنِ رنگینِ عمر سے — جوئے چمن میں دیکھ ٹک آب رواں کی اور

آیا کسے تکدّر خاطر ہے زیر خاک
جاتا ہے اکثر اب تو غبار آسماں کی اور

۶۰۸

ادا کچھ ہے، انداز کچھ، ناز کچھ
تہِ دل ہے کچھ اور زیر لب اور

۶۰۹

ہم آپ سے گئے تو گئے پر بسانِ نقش
بیٹھا تو روز حشر تئیں انتظار کر

۶۱۰

جنوں میں اب کے کام آئی نہ کچھ تدبیر بھی آخر
گئی کل ٹوٹ مرے پاؤں کی زنجیر بھی آخر
اگر ساکت ہیں ہم حیرت سے پر ہیں دیکھنے قابل
کہ اک عالم رکھے ہے عالم تصویر بھی آخر
یکایک یوں نہیں ہوتے ہیں پیارے جان کے لاگو
کبھو آدم ہی سے ہو جاتی ہے تقصیر بھی آخر
نہ دیکھی ایک واشد اپنے دل کی اس گلستاں میں
کھلے پائے ہزاروں غنچہ دل گیر بھی آخر

۶۲۳

کیا کہوں تم سے میں کہ کیا ہے عشق　　جان کا روگ ہے بلا ہے عشق
عشق ہی عشق ہے جہاں دیکھو　　سارے عالم میں بھر رہا ہے عشق

۶۲۴

دیکھی تھی ترے کان کے موتی کی اک جھلک
جاتی نہیں ہے اشک کی رخسار کے ڈھلک

۶۲۵

حال آنکہ کام پہنچ گیا کب کا جاں تلک　　آتی نہیں ہے تو بھی شکایت زباں تلک
جو آرزو کی اس سے سو دل میں ہی خوں ہوئی　　نومیدیوں بسر کرے کوئی کہاں تلک

۶۲۶

شاید کہ سر نوشت میں مرنا ہے گھٹ کے میر
کاغذ نہ محرمِ غمِ دل، نے قلم شریک

۶۲۷

خاک ہی میں ملائے رکھتے ہو　　ہو کوئی تم سے آشنا کیا خاک
چلے ہے باغ کی صبا کیا خاک　　دل جلا کوئی ہو گیا کیا خاک
تربتِ میر پر چلے تم دیر
اتنی مدّت میں واں، رہا کیا خاک

۶۲۸

سبز ہے رونے سے میرے گوشہ دشت کا
باعثِ آبادیٔ صحرا ہے چشمِ گریہ ناک

۶۲۹

ان ہڈیوں کا جلنا کوئی ہما سے پوچھو　　لاتا نہیں ہے منہ وہ اب میرے استخواں تک
جاتی ہیں خط کے پیچھے جوں مہر آنکھیں میری　　اب کارِ شوق میرا پہنچا ہے میر یاں تک

۶۳۰

مجھے نیند کیسی کہ مانندِ انجم　　کھلی رہتی ہیں میری آنکھیں سحر تک

کہیں اک دور کی سی کچھ تھی نسبت
رکھا تھا آئینے کو اس کے رو پا
(۳)

۶۱۷

گل کو ہوتا صبا قرار اے کاش — رہتی ایک آدھ دن بہار اے کاش
یہ جو دو آنکھ مُند گئیں میری — اُس پہ وا ہوتیں ایک بار اے کاش
اس میں راہِ سخن نکلتی تھی — شعر ہوتا ترا شعار اے کاش

شش جہت اب تو تنگ ہے ہم پر
اُس سے ہوتے نہ ہم دو چار اے کاش

۶۱۸

اٹھتی ہے موج ہر یک آغوش ہی کی صورت — دریا کو ہے یہ کس کا بوس و کنار خواہش
صد رنگ جلوہ گر ہے ہر جادہ غیرتِ گل — عاشق کی ایک پاوے کیونکر قرار خواہش
لے ہاتھ میں قفس ٹک صیّاد چل چمن تک — مدت سے ہے ہمیں بھی سیرِ بہار خواہش

کرتے ہیں سب تمنّا پر میرؔ جی نہ اتنی
رکھے گی مار تم کو پایانِ کار خواہش

۶۱۹

لعلِ خموش اپنے دیکھو ہو آرسی میں
پھر پوچھتے ہو ہنس کر مجھ بے نوا کی خواہش

۶۲۰

عشق کی رہ نہ چل خبر ہے شرط — اولِ گام ترکِ سر ہے شرط
قلب یعنی کہ دل عجب زر ہے — اس کی نقّادی کو نظر ہے شرط

۶۲۱

کیا لالہ ایک داغ پہ پھولے ہے باغ میں — بہتیرے ایسے چھاتی پہ، ہم نے جلائے داغ

۶۲۲

یک سب نظر پڑا تھا کہیں تو سواب مُدام — رہتی ہے چشم ماہ ترے بام کی طرف
خارا شگاف و سینہ خراش ایک سے نہیں — لیکن نظر نہیں ہے تجھے کام کی طرف

رہے ہم تو کھوئے گئے سے سدا　　کبھو آپ میں ہم کو پاتے ہیں لوگ
اُن آنکھوں کے بیمار ہیں میر ہم
بجا دیکھنے ہم کو آتے ہیں لوگ

۶۳۵

ہے تیرہ یہ بیاباں گرد و غبار سے سب　　دے راہ کب دکھائی بے رہنمائیِ دل
پیش آوے کوئی صورت منھ موڑتے نہیں وے　　آئینہ ساں جنھیں ہے کچھ آشنائیِ دل
اس دامگہ میں اس کے سارے فریب ہی ہیں
آتی نہیں نظر کچھ مجھ کو رہائیِ دل

۶۳۶

وہ کون سی امید بر آئی ہے عشق میں　　رہتا ہے کس اُمّید پہ اُمّیدوار دل
تم پر تو صاف میری کدورت کھلی ہے آج　　مدت سے ہے ملال کے زیرِ غبار دل

۶۳۷

ٹک اُس بے رنگ کے نیرنگ تو دیکھ　　ہوا ہر رنگ میں جوں آب شامل
غنیمت جان فرصت آج کے دن　　سحر کیا جانے کیا ہو شب ہے حائل
وہی پہنچے تو پہنچے آپ ہم تک
نہ یاں طائع رسا، نے جذب کامل

۶۳۸

سوکھ غم سے ہوئے ہیں کانٹا سے　　پر دلوں میں کھٹک رہے ہیں ہم
وقفۂ مرگ اب ضروری ہے　　عمر طے کرتے تھک رہے ہیں ہم
کیونکہ گرد علاقہ بیٹھ سکے　　دامنِ دل جھٹک رہے ہیں ہم
کون پہنچے ہے بات کی تہ کو　　ایک مدت سے بک رہے ہیں ہم
نقش پا سی رہی ہیں کھل آنکھیں
کس کی یوں راہ تک رہے ہیں ہم

۶۳۹

ہے تہِ دل بتوں کو کیا معلوم　　نکلے پردے سے کیا، خدا معلوم

اٹھا پاس بے اختیاری سے سب کا بکا بیٹھے کرتے ہیں دو دو پہر تک

دماغ اور دل ہیں سراسیمہ دونوں
سرزخم شاید کہ پہنچا جگر تک

۶۳۱

غافل ہیں ایسے سوتے ہیں گویا جہاں کے لوگ
حالانکہ رفتنی ہیں سب اس کارواں کے لوگ

رونق تھی دل میں جب تئیں بستے تھے دلبراں
اب کیا رہا ہے اُٹھ گئے سب اس مکاں کے لوگ

فردوس کو بھی آنکھ اُٹھا دیکھتے نہیں
کس درجہ سیر چشم ہیں کوئے بُتاں کے لوگ

کیا سہل جی سے ہاتھ اُٹھا بیٹھتے ہیں ہائے
یہ عشق پیشگاں ہیں الٰہی کہاں کے لوگ

۶۳۲

پاؤں میں پڑ گئے ہیں پھپھولے مرے تمام ہر گام راہِ عشق میں گویا دبی ہے آگ

کیونکر نہ طبع آتشیں اُس کی ہمیں جلائے ہم مشتِ خس کا حکم رکھیں وہ پری ہے آگ

افسردگیٔ سوختہ جاناں ہے قہر میر
دامن کو ٹک ہلا کہ دلوں کی بجھی ہے آگ

۶۳۳

ہے آگ کا سا نالۂ کاہش فزا کا رنگ کچھ اور صبح دم سے ہوا ہے ہوا کا رنگ

کس بے گنہ کے خوں میں ترا پڑ گیا ہے پاؤں ہوتا نہیں ہے سرخ تو ایسا حنا کا رنگ

پوچھیں ہیں وجہ گریۂ خونیں جو مجھ سے لوگ
کیا دیکھتے نہیں ہیں سب اس بے وفا کا رنگ

۶۳۴

رہِ مرگ سے کیوں ڈراتے ہیں لوگ بہت اس طرف کو تو جاتے ہیں لوگ

مظاہر سب اس کے ہیں ظاہر ہے وہ تکلف ہے یاں جو چھپاتے ہیں لوگ

۶۴۴

کون کہتا ہے منھ کو کھولو تم　　کاش کے پردے ہی میں ہو لو تم
حکمِ آبِ رواں رکھے ہے حسن　　بہتے دریا میں ہاتھ دھو لو تم
جانا آیا ہے اب جہاں سے ہمیں　　تھوڑی تو دُور ساتھ ہو لو تم
آتے ہیں متّصل چلے آنسو　　آہ کب تک یہ موتی رو لو تم
رات گزری ہے سب تڑپتے میر
آنکھ لگ جائے ٹک تو سو لو تم

۶۴۵

نہیں دیکھتے صبح اب آرسی　　خفا رہتے ہیں اپنی صورت سے ہم
رکھا جس کو آنکھوں میں اک عمر اب　　اسے دیکھ رہتے ہیں حسرت سے ہم
نہ ٹک لا سکا تاب جلوے کی دل
نہ رکھتے ہیں صبر و طاقت سے ہم

۶۴۶

مدعی مجھ کو کھڑے صاف بُرا کہتے ہیں　　چپکے تم سنتے ہو بیٹھے اسے کیا کہتے ہیں
عشق کے شہر کی بھی رسم کے ہیں گشتے ہم　　دردِ جانکاہ جو ہو اس کو دوا کہتے ہیں

۶۴۷

کیا کیا جہاں اثر تھا سو اب واں عیاں نہیں　　جن کے نشاں تھے میلوں پران کا نشاں نہیں
دفتر بنی، کہانی بنی، مثنوی ہوئی　　کیا شرحِ سوزِ عشق کروں میں زباں نہیں
اپنا ہی ہاتھ سر پہ رہا اپنے یاں سدا　　مشفق کوئی نہیں ہے کوئی مہرباں نہیں
اس عہد کو نہ جانیے اگلا سا عہد میر
وہ دَور اب نہیں وہ زمیں آسماں نہیں

۶۴۸

نہ نکلا دوسرا ویسا جہاں میں　　وہی اک جنس ہے اس کارواں میں
کیا منھ بند سب کا بات کہتے　　بلا کچھ سحر ہے اس کی زباں میں
اگر وہ بت نہ جانے تو نہ جانے　　ہمیں سب جانتے ہیں ہندستاں میں

یہی جانا کہ کچھ نہ جانا ہائے　　سو بھی اک عمر میں ہُوا معلوم
گرچہ تو ہی ہے سب جگہ لیکن　　ہم کو تیری نہیں ہے جا معلوم
ان سیہ چشم دلبروں سے ہمیں　　تھی وفا چشم سو وفا معلوم
عشق جانا تھا مار رکھے گا
ابتدا میں تھی انتہا معلوم

۶۴۰

صیاد بہار اب کی سب لوٹوں گا کیا میں ہی　　ٹک باغ تک لے چل میرا بھی قفس ظالم
کیا کھولے ہوئے محمل یاں گرم حکایت ہے　　چل راہ میں کچھ کہتا مانند جرس ظالم
سررشتۂ ہستی کو ہم دے چکے ہاتھوں سے
کچھ ٹوٹے ہی جاتے ہیں اب تارِ نفس ظالم

۶۴۱

تدبیریں کریں اپنے تنِ زار و زبوں کی　　افراط سے اندوہ کی ہوں آپ میں جب ہم
یک سلسلہ ہے قیس کا فرہاد کا اپنا　　جوں حلقۂ زنجیر گرفتار ہیں سب ہم
مجمع میں قیامت کے اک آشوب سا ہوگا
آ نکلے اگر عرصے میں یوں نالہ بہ لب ہم

۶۴۲

مشتاق ان لبوں کے ہیں سب مرد و زن تمام　　دفتر لکھے گئے نہ ہوا پر سخن تمام
آوارہ گرد باد سے تھے ہم پہ شہر میں　　کیا خاک میں ملا ہے یہ دیوانہ پن تمام
کیا لطف تن چھپا ہے مرے تنگ پوش کا　　اُگلا پڑے ہے جامے سے اس کا بدن تمام
اک گل زمیں نہ وقفے کے قابل نظر پڑی　　دیکھا برنگ آب رواں یہ چمن تمام
نکلے ہیں گل کے رنگ گلستاں میں خاک سے　　یہ وے ہیں اس کے عشق کے خونیں کفن تمام
کچھ ہند ہی میں میرؔ نہیں لوگ جیب چاک
ہے میرے ریختوں کا دِوانہ دکن تمام

۶۴۳

منظور سجدہ ہے ہمیں اس آفتاب کا　　ظاہر میں یوں کریں ہیں نماز زوال ہم

۶۵۵

گرچہ عالم جلوہ گاہِ یار یوں بھی تھا ولے
آنکھیں جوں موندیں عجب عالم نظر آیا ہمیں

۶۵۶

اشک کے جوش سے ہوں شام وسحر پانی میں — جیسے ماہی ہے مجھے سیر و سفر پانی میں
شب نہاتا تھا جو وہ رشکِ قمر پانی میں — گتھی مہتاب سے اٹھتی تھی لہر پانی میں
ساتھ اس حسن کے دیتا تھا دکھائی وہ بدن — جیسے جھمکے ہے پڑا گوہرِ تر پانی میں
رونے سے بھی نہ ہوا سبز درختِ خواہش — گرچہ مرجاں کی طرح تھا یہ شجر پانی میں
آتشِ عشق نے راون کو جلا کر مارا — گرچہ لنکا سا تھا اس دیو کا گھر پانی میں
چشمِ تر ہی میں رہے کاش وہ روئے خوش رنگ — پھول رہتا ہے بہت تازہ و تر پانی میں
روؤں تو آتشِ دل شمع نمط بجھتی نہیں — مجھ کو لے جا کے ڈبو دیویں مگر پانی میں

محو کر آپ کو یوں ہستی میں اس کی جیسے
بوند پانی کی نہیں آتی نظر پانی میں

۶۵۷

طبع دریا جو ہو آشفتہ تو پھر طوفاں ہے — آہ بالوں کو پراگندہ نہ کر پانی میں
غرقِ آبِ عشق سے ہوں لیک اڑا جاتا ہوں — جوں سمک گو کہ مرے ڈوبے ہیں پر پانی میں
ہیئت آنکھوں کی نہیں وہ رہی روتے روتے — اب تو گرداب سے آتے ہیں نظر پانی میں

فرطِ گریہ سے ہوا میر تباہ اپنا جہاز
تختہ پارے گئے کیا جانوں کدھر پانی میں

۶۵۸

عجب کیا ہے جو یارانِ چمن کو ہم نہ پہچانیں — رہائی اتفاق اپنی پڑی ہے ایک مدت میں
سلاتا تیغ خوں میں گر نہ میرے تو قیامت تھی — اٹھا تھا روزِ محشر کا سا فتنہ رات صحبت میں

تحمل ہو سکا جب تک بدن میں تاب و طاقت تھی
قیامت اب گزر جاتی ہے جی پر ایک ساعت میں

٦٤٩

غریبانہ کوئی شب روز کر یاں — ہمیشہ کون رہتا ہے سرا میں
اُٹھاتے ہاتھ کیوں نومید ہوکر — اگر پاتے اثر کچھ ہم دُعا میں
اُدھر جانے کو آندھی تو ہے لیکن — سبک پائی سی ہے بادِ صبا میں
بلا تہ دار بحرِ عشق نکلا — نہ ہم نے انتہا لی ابتدا میں

ملے برسوں وہی بیگانہ ہے وہ
ہُنر ہے یہ ہمارے آشنا میں

٦٥٠

یوسف عزیزِ دلہا جا مصر میں ہوا تھا — پاکیزہ گوہروں کی عزت نہیں وطن میں
آجاتے شہر میں تو جیسے کہ آندھی آئی — کیا وحشتیں کیاں ہیں ہم نے دِوانپن میں

٦٥١

کن نے لپٹے بال دکھلائے ترے مانی کے تئیں — اُن نے جو اس طول سے کھینچا پریشانی کے تئیں
طائرانِ خوش معاش اس باغ کے ہم تھے کبھو — اب ترستے ہیں قفس میں اک پرافشانی کے تئیں

دل جو پانی ہو تو آئینہ ہے روئے یار کا
خانہ آبادی سمجھ اس خانہ ویرانی کے تئیں

٦٥٢

مدت ہوئی کہ اپنی خبر کچھ ہمیں نہیں
کیا جانیے کہ میرؔ گئے ہم کدھر کے تئیں

٦٥٣

کیا کہوں اوّل بخود تو دیر میں آتا ہوں مَیں
پھر جو یاد آتا ہے وہ چُپکا سارہ جاتا ہوں مَیں

٦٥٤

ایام ہجر کریے بسر کس اُمید پر — ملنا انھوں کا صبح نہیں شام بھی نہیں
پروا اسے ہو کا ہے کو ناکام گر مروں — اُس کامِ جاں کو مجھ سے تو کچھ کام بھی نہیں
کیا جانوں دل کو کھینچے ہیں کیوں شعر میرؔ کے — کچھ طرز ایسی بھی نہیں ایہام بھی نہیں

۶۶۳

جا ہمیں اس گلی میں گر رہنا　　ضعف و بے طاقتی بہانے ہیں
اب تو افسردگی ہی ہے ہر آن　　وے نہ ہم ہیں نہ وے زمانے ہیں
قیس و فرہاد کے وہ عشق کے شور　　اب مرے عہد میں فسانے ہیں
مشک و سنبل کہاں وہ زلف کہاں　　شاعروں کے یہ شاخسانے ہیں

عشق کرتے ہیں اس پری رو سے
میر صاحب بھی کیا دِوانے ہیں

۶۶۴

الف کی رمز اگر سمجھا اٹھا دل بحث علمی سے
اسی اک حرف کو برسوں سے ہم تکرار کرتے ہیں

۶۶۵

کرتا نہیں قصور ہمارے ہلاک میں　　یارب یہ آسمان بھی جل جائے خاک میں
اب کے جنوں میں فاصلہ شاید نہ کچھ رہے　　دامن کے چاک اور گریباں کے چاک میں

کہیئے لطافت اُس تنِ نازک کی میر کی
شاید یہ لطف ہوگا کسو جانِ پاک میں

۶۶۶

سن شورِ گل قفس میں دل داغ سب ہوا ہے　　کیا پھول گل کھلے ہیں اب کی بہار میں یاں
ہم مر گئے و لیکن سوزِ دروں وہی ہے　　اک آگ لگ اُٹھی ہے کُنجِ مزار میں یاں

۶۶۷

آج ہمارے گھر آیا تو کیا ہے یاں جو نثار کریں　　اِلّا کھینچ بغل میں تجھ کو دیر تلک ہم پیار کریں
پتّا پتّا گلشن کا تو حال ہمارا جانے ہے　　اور کہے تو جس سے اے گل بے برگی اظہار کریں

۶۶۸

گر کوئی اعمیٰ کہے کچھ پر کہاں وہ تو کہاں　　لے گئے پیش فلک اس مہ کا ایسا رُو کہاں

گل کو کیا نسبت ہے تجھ سے میں نہ مانوں زینہار
رنگ اگر بالفرض تیرا سا ہوا یہ بُو کہاں

۶۵۹

لوہو روتا ہوں میں ہر اک حرفِ خط پر ہمدماں　　اور اب رنگین جیسا تم کہو انشا کروں
دل پریشانی مجھے دے ہے بکھیرے گل کے رنگ　　آپ کو جوں غنچہ کیونکر آہ میں یک جا کروں
خاک اڑاتا اشک افشاں آن نکلوں ہوں تو پھر
دشت کو دریا کروں بستی کے تئیں صحرا کروں

۶۶۰

کلفت میں گزری ساری مدت تو زندگی کی
آسودگی کا منہ اب دیکھیں گے ہم عدم میں

۶۶۱

عشق میں جی کو صبر و تاب کہاں　　اُس سے آنکھیں لگیں تو خواب کہاں
بے کلی دل ہی کی تماشا ہے　　برق میں ایسے اضطراب کہاں
ہستی اپنی ہے بیچ میں پردا　　ہم نہ ہوویں تو پھر حجاب کہاں
گریۂ شب سے سرخ ہیں آنکھیں　　مجھ بلانوش کو شراب کہاں
عشق ہے عاشقوں کے جلنے کو　　یہ جہنم میں ہے عذاب کہاں
محو ہیں اس کتابی چہرے کے　　عاشقوں کو سر کتاب کہاں
عشق کا گھر ہے میرؔ سے آباد
ایسے پھر خانماں خراب کہاں

۶۶۲

یارو مجھے معاف رکھو مَیں نشے میں ہوں　　اب دو تو جام، خالی ہی دو، مَیں نشے میں ہوں
مستی سے درہمی ہے مری گفتگو کے بیچ　　جو چاہو تم بھی مجھ کو کہو مَیں نشے میں ہوں
یا ہاتھوں ہاتھ لو مجھے مانندِ جامِ مے　　یا تھوڑی دور ساتھ چلو مَیں نشے میں ہوں
معذور ہوں جو پاؤں مرا بے طرح پڑے　　تم سرگراں تو مجھ سے نہ ہو مَیں نشے میں ہوں
نازک مزاج آپ قیامت ہیں میرؔ جی
جوں شیشہ مرے منہ نہ لگو مَیں نشے میں ہوں

۶۷۵

باغ گو سبز ہوا اب سرِ گلزار کہاں   دل کہاں وقت کہاں عمر کہاں یار کہاں
دم زدن مصلحتِ وقت نہیں اے ہمدم   جی میں کیا کیا ہے مرے پر لبِ اظہار کہاں

۶۷۶

تھا سب کو دعویٰ عشق کا لیکن نہ ٹھہرا کوئی بھی
دانستہ اپنی جان سے دل کو اٹھایا ایک میں
بجلی سے یوں چمکے بہت پر بات کہتے ہو چکے
جوں ابر ساری خلق پر ہوں اب تو چھایا ایک میں
اس گلستاں سے منفعت یوں تو ہزاروں کو ہوئی
دیکھا نہ سرو و گل کا یاں ٹک سر پہ سایا ایک میں

۶۷۷

صنم پرستی میں اے راہباں نہ کی تقصیر   تم اہلِ صومعہ سے پوچھو وے مسلماں ہیں
چمن میں جا کے بھرو تم گلو سے جیب و کنار   ہم اپنے دل ہی کے ٹکڑوں سے گل بداماں ہیں
رہیں ہیں دیکھ جو تصویر سے ترے منھ کو   ہماری آنکھ سے ظاہر ہے یہ کہ حیراں ہیں
رہا ہے کون سا پردہ ترے ستم کا شوخ
کہ زخمِ سینہ ہمارے سبھی نمایاں ہیں

۶۷۸

جور کیا کیا جفائیں کیا کیا ہیں   عاشقی میں بلائیں کیا کیا ہیں
گہ نسیم صبا ہے گاہ سموم   اس چمن میں ہوائیں کیا کیا ہیں

۶۷۹

فراق آنکھ لگنے کی جا ہی نہیں   پلک سے پلک آشنا ہی نہیں
وہ کیا کچھ نہیں حسن کے شہر میں   نہیں ہے تو رسمِ وفا ہی نہیں

۶۸۰

کیا قدر تھی سخن کی جب یاں بھی صحبتیں تھیں   ہر بات جائزہ ہے ہر بیت پر صلے ہیں
اندیشہ زادِ رہ کا رکھیے تو ہے مناسب   چلنے کو یاں سے اکثر تیار قافلے ہیں

۶۶۹

بے گانہ وضع برسوں اس شہر میں رہا ہوں — بھاگوں ہوں دور سب سے میں کس کا آشنا ہوں
مجھ کو بلا ہے وحشت اے میر دور اس سے — جاگہ سے جب اٹھا ہوں آشوب سا اٹھا ہوں

۶۷۰

ہے عاشقی کے بیچ ستم دیکھنا ہی لطف — مرجانا آنکھیں موند کے یہ کچھ ہنر نہیں
کب شب ہوئی زمانے میں جو پھر ہوا نہ روز — کیا اے شب فراق تجھی کو سحر نہیں

۶۷۱

کھینچتا چلا ہے اب تو تصدیع کو تصور — ہر لحظہ اس کے جلوے پیش نظر رہے ہیں
کل دیکھتے ہمارے بستے تھے گھر برابر — اب یہ کہیں کہیں جو دیوار و در رہے ہیں
کیا یہ سرائے فانی ہے جائے باش اپنی — ہم یاں مسافرانہ آکر اتر رہے ہیں
کیا آج ڈبڈبائی دیکھو ہو تم یہ آنکھیں
جوں چشمہ یوں ہی برسوں ہم چشم تر رہے ہیں

۶۷۲

اے کاش ہم کو شکر کی حالت رہے مدام — تا حال کی خرابی سے ہم بے خبر رہیں
وعدہ تو جب ہو صبح کا تب ہم بھی جاں بلب — جیسے چراغ آخر شب تا سحر رہیں
آوارگی کی سب ہیں یہ خانہ خرابیاں
لوگ آویں دیکھنے کو بہت ہم جو گھر رہیں

۶۷۳

کیا کہیے آہ جی کو قیامت ہے انتظار — آتا نہ کاش وعدۂ دیدار درمیاں
ثابت ہے ساری خلق کے اوپر کہ تو ہے ایک — حاجت نہیں جو آوے یہ تکرار درمیاں
کتنے دنوں سے میر کا نالہ نہیں سنا
شاید نہیں ہے اب وہ گرفتار درمیاں

۶۷۴

برسی تلوار کہ حائل ہو کوئی سیل بلا — پیش کچھ آؤ ہم اس کوچے میں جا رہتے ہیں
دشت میں گرد رہ اس کی اٹھی ہے جیدھر سے — وحش و طیر آنکھیں ادھر ہی کو لگا رہتے ہیں

۶۸۵

دیکھیں پیش آوے ہے کیا عشق میں اب توجوں سیل
ہم بھی اس راہ میں سر گاڑے چلے جاتے ہیں
یادِ قد میں ترے آنکھوں سے بہیں ہیں جوئیں
گر کسو باغ میں ہم سروتلے جاتے ہیں
پُرغباریٔ جہاں سے نہیں سدھ میرؔ ہمیں
گرد اتنی ہے کہ مٹی میں رُلے جاتے ہیں

۶۸۶

مت حنائی پانو سے چل کر کہیں جایا کرو
دِلّی ہے آخر نہ ہنگامہ کہیں برپا ہو میاں
شہر میں تو موسم گل میں نہیں لگتا ہے جی
یا گریباں کوہ کا یا دامنِ صحرا ہو میاں

۶۸۷

سب جاں سے بے خبر ہیں یاں تو
برہم زدہ شہر ہے جہاں تو
کیا اس کے گئے ہے ذکر دل کا
ویران پڑا ہے یہ مکاں تو
کیا کیا نہ عزیز خوار ہوں گے
ہونے دو اسے ابھی جواں تو
یہ طالع نارسا بھی جاگیں
سو جائے ٹک اس کا پاسباں تو
مت تُربتِ میرؔ کو ہٹاؤ
رہنے دو غریب کا نشاں تو

۶۸۸

فرش ہیں آنکھیں ہی تیری راہ میں
آہ ٹک تو دیکھ کر چل راہ تو
کاہش دل بھی دوچنداں کیوں نہ ہو
آنکھ میں آوے نہ دو دو ماہ تو

۶۸۹

ہوں تو نالاں زیرِ دیوارِ چمن پر ضعف سے
گوش زد گل کے نہیں ہوتا مرا شیون کبھو

۶۹۰

گل برگ سے ہیں نازک خوبیٔ پا تو دیکھو
کیا ہے جھمک کفک کی رنگِ حنا تو دیکھو

سوز دروں سے کیونکر میں آگ میں نہ لوٹوں
جوں شیشہ حبابی سب دل پر آبلے ہیں

۶۸۱

پھرا کرتے ہیں دھوپ میں جلتے ہم — ہوا ہے کہے تو کہ سایا ہمیں
گہے تر رہیں گاہ خوں بستہ تھیں — ان آنکھوں نے کیا کیا دکھایا ہمیں

۶۸۲

جنوں نے تماشا بنایا ہمیں — رہا دیکھ اپنا پرایا ہمیں
سدا ہم تو کھوئے گئے سے رہے — کبھو آپ میں تم نے پایا ہمیں
شب آنکھوں سے دریا سا بہتا رہا — انھیں نے کنارے لگایا ہمیں

جلیں پیش و پس جیسے شمع و پتنگ
جلا وہ بھی جن نے جلایا ہمیں

۶۸۳

ہم نے یہ مانا کہ واعظ ہے ملک — آدمی ہونا بھی مشکل ہے میاں
مرنے کے پیچھے تو راحت سچ ہے لیک — بیچ میں یہ واقعہ حائل ہے میاں
آج کیا فردائے محشر کا ہراس — صبح دیکھیں کیا ہو شب حامل ہے میاں
سامنے سے ٹک ٹلے تو دق نہ ہو — آسماں چھاتی پر اپنی سل ہے میاں
دل لگی اتنی جہاں میں کس لیے — رہ گذر ہے یہ تو کیا منزل ہے میاں
چشم حق بیں سے کرو ٹک تم نظر — دیکھتے جو کچھ ہو سب باطل ہے میاں
بے تہی دریائے ہستی کی نہ پوچھ — یاں سے واں تک سو جگہ ساحل ہے میاں
دیکھ کر سبزہ ہی خرم دل کو رکھ — مزرع دنیا کا یہ حاصل ہے میاں
مستعدوں پر سخن ہے آج کل — شعر اپنا فن سو کس قابل ہے میاں

کی زیارت میر کی ہم نے بھی کل
لاابالی سا ہے پر کامل ہے میاں

۶۸۴

تلوار ہی کھنچا کی ترے ہونے بزم میں — بیٹھا ہے کب تو آ کے کہ فتنہ اٹھا نہیں

بدی نوشتے کی تحریر کیا کروں اپنے
کہ نامہ پہنچے تو پھر کاغذ ہوائی ہو
چمکتے دانتوں سے اس کے ہوئی ہے روکش میر
عجب نہیں ہے کہ بجلی کی جگ ہنسائی ہو

۶۹۶

پھولوں کے عکس سے نہیں جوئے چمن میں رنگ
گل بہ چلے ہیں شرم سے اس منھ کی آب ہو
لطفِ شرابِ ابر سے ہے سو نصیب۔ دیکھ
جب لیویں جام ہاتھ میں تب آفتاب ہو
ہستی پر ایک دم کی تمھیں جوش اس قدر
اس بحرِ موج خیز میں تم تو حباب ہو

۶۹۷

سب سرگزشت سن چکے اب چپکے ہو رہو
آخر ہوئی کہانی مری تم بھی سو رہو
جوشِ محیطِ عشق میں کیا جی سے گفتگو
اس گوہرِ گرامی سے اب ہاتھ دھو رہو
اتنا سیاہ خانۂ عاشق سے ننگ کیا
کتنے دنوں میں آئے ہو یاں رات تو رہو

۶۹۸

اب نیک و بد پہ عشق میں مجھ کو نظر نہیں
اس میں مجھے بُرا کہو، کوئی بھلا کہو

۶۹۹

تم تو تصویر ہوئے دیکھ کے کچھ آئینہ
اتنی چپ بھی نہیں ہے خوب کوئی بات کرو
بس بہت وقت کیا شعر کے فن میں ضائع
میر اب پیر ہوئے ترک خیالات کرو

۷۰۰

جوں غنچہ میر اتنے نہ بیٹھے رہا کرو
گل پھول دیکھنے کو کبھی ٹک اٹھ چلا کرو

۷۰۱

ہے روزگار میرا ایسا سیہ کہ یارو
مشکل ہے فرق کرنا ٹک شام سے سحر کو
ہر چند ہے سخن کو تشبیہہ دُر سے لیکن
باتیں مری سنو تو تم پھینک دو گہر کو

سائے میں ہر پلک کے خوابیدہ ہے قیامت ۔ اُس فتنہ زماں کو کوئی جگا تو دیکھو
ہے اِس چمن میں وہ گُل صد رنگ محوِ جلوہ دیکھو جہاں وہی ہے کچھ اُس سوا تو دیکھو

اشعار میرؔ پر ہے اب ہائے وائے ہر سُو
کچھ سحر تو نہیں ہے لیکن ہوا تو دیکھو

۶۹۱

منعقد کاش مجلس مُل ہو درمیاں تو ہو، سامنے گُل ہو
اب دھواں یوں جگر سے اٹھتا ہے جیسے پُر پیچ کوئی کاکُل ہو
لگ نہ چل اے نسیم باغ کہ میں رہ گیا ہوں چراغ سا گُل ہو
دیر رہنے کی جا نہیں یہ چمن بوئے گُل ہو صفیرِ بُلبُل ہو

منکشف ہو رہا ہے حال میرؔ
کاش ٹک یار کو تامل ہو

۶۹۲

نہ میرے باعث شور و فغاں ہو ابھی کیا جانیے یاں کیا سماں ہو
یہی مشہور عالم ہیں دو عالم خدا جانے ملاپ اس سے کہاں ہو
جہاں سجدے میں ہم نے غش کیا تھا وہیں شاید کہ اس کا آستاں ہو

نہ ہووے وصف اِن بالوں کا مجھ سے
اگر ہر مُو مرے تن پر زباں ہو

۶۹۳

کھولے تھے بال کن نے ہنگام صبح اپنے
آتی ہے اے صبا تو، ایسی جو مشک بو ہو

۶۹۴

قطرہ قطرہ اشک باری تو کُجا پیش سحاب
ایک دن تو ٹوٹ پڑ اے دیدۂ تر ہو سو ہو

۶۹۵

بدن نما ہے ہر آئینہ لوحِ تُربت کا نظر جسے ہو اُسے خاک خود نمائی ہو

۷۰۶

مطرب نے پڑھی تھی غزل اک میرؔ کی شب کو — مجلس میں بہت وجد کی حالت رہی سب کو
ہوگا کسو دیوار کے سائے میں پڑا میرؔ — کیا ربط محبّت سے اس آرام طلب کو

۷۰۷

ادھر کر سنگ کے تختے سے پھر دیکھا کیا ادھر — محبت ہو گئی تھی کوہ کن سے نقشِ شیریں کو
ہم اس کے چاند سے منہ کے ہیں عاشق مرتے کیا ہم کو — مرا اپنا کبک ہی مارا کرے اس خشتِ سیمیں کو

بہت مدت ہوئی صحرا سے مجنوں کی خبر آئے
نہیں معلوم پیش آیا ہے کیا اس یارِ دیریں کو

۷۰۸

سب طائر قدسی ہیں یہ جو زیرِ فلک ہیں — موندا ہے کہاں عشق نے ان جانوروں کو
پیراہنِ صدچاک سلاتے ہیں مرا لوگ — تہ سے نہیں مطلق خبر ان بے خبروں کو

۷۰۹

اب جو نصیب میں ہے سو دیکھ لوں گا میں بھی — تم دستِ لطف اپنا سر سے مرے اٹھا لو
جنبش بھی اس کے آگے ہونٹھوں کو ہو تو کہیو — یوں اپنے طور پر تم باتیں بہت بنا لو
دو نعروں ہی میں شب کے ہوگا مکاں تُہو کا — سن رکھو کان رکھ کر یہ بات بستی والو
زلف اور خال و خط کا سودا نہیں ہے اچھا — یارو بنے تو سر سے جلد اس بلا کو ٹالو

یارانِ رفتہ ایسے کیا دُور تر گئے ہیں
ٹک کر کے تیز گامی اس قافلے کو جا لو

۷۱۰

کھُل گیا منہ اب تو اس محبوب کا — کچھ سخن کی بھی نکل آوے گی راہ
لذّتِ دنیا سے کیا بہرہ ہمیں — پاس ہے رنڈی و لے ہے ضعفِ باہ

ضبط بہتیرا ہی کرتے ہیں و لے
آہ اک منہ سے نکل جاتی ہے گاہ

۷۱۱

اب خاک تو ہماری سب سبز ہو چلی ہے — کب منہ ادھر کرے گا وہ آہوتے رمیدہ

بندے کے درد دل کو کوئی نہیں پہنچتا　　ہر ایک بے حقیقت یاں ہے خدا رسیدہ
سائے سے اپنے وحشت ہم کو رہی ہمیشہ　　جوں آفتاب ہم بھی کیسے رہے جریدہ
منصور کی نظر تھی جو دار کی طرف سو　　پھل وہ درخت لایا آخر سرِ بریدہ

ذوقِ سخن ہوا ہے اب تو بہت ہمیں بھی
لکھیں گے میر جی کے کچھ شعر چیدہ چیدہ

۷۰۲

اس جسم خاکی سے ہم مٹی میں اٹ رہے ہیں
یوں خاک میں کہاں تک کوئی رلے ہمیشہ

۷۰۳

لطف کیا ہر کسو کی چاہ کے ساتھ　　چاہ وہ ہے جو ہو نباہ کے ساتھ
سفری وہ جو مہ ہوا تا دیر　　چشم اپنی تھی گرد رہ کے ساتھ

۷۰۴

کھینچتا ہے دلوں کو صحرا کچھ　　ہے مزاجوں میں اپنے سودا کچھ
دل نہیں جمع چشمِ تر سے اب　　پھیلتا سا چلا یہ دریا کچھ
شہر میں حشر کیوں نہ برپا ہو　　شور ہے میرے سر میں کیسا کچھ
ویسے ظاہر کا لطف ہے چھپنا　　کم تماشا نہیں یہ پردا کچھ
خلق کی کیا سمجھ میں وہ آیا　　آپ سے تو گیا نہ سمجھا کچھ

وصل اس کا، خدا نصیب کرے
میر دل چاہتا ہے کیا کیا کچھ

۷۰۵

بود نقش و نگار سا ہے کچھ　　صورت اک اعتبار سا ہے کچھ
یہ جو مہلت جسے کہیں ہیں عمر　　دیکھو تو انتظار سا ہے کچھ
منہ نہ ہم جبریوں کا کھلواؤ　　کہنے کو اختیار سا ہے کچھ
منتظر اس کی گرد راہ کے تھے　　آنکھوں میں سو غبار سا ہے کچھ
اس کی برہم زنی مژگاں سے　　دل میں اب خار خار سا ہے کچھ

۷۱۶

آنکھیں غبار لائیں مری انتظار میں
دیکھوں تو گرد کب اُٹھے اُس رہ گزار کی

کیا جانوں چشم تر سے اُدھر دل پہ کیا ہوا
کس کو خبر ہے میر سمندر کے پار کی

۷۱۷

پھوڑ ڈالیں گے سر ہی اس در پر
منّت اُٹھتی نہیں ہے درباں کی

آدمی سے ملک کو کیا نسبت
شان ارفع ہے میر انساں کی

۷۱۸

کی اس طبیبِ جاں نے تجویز مرگِ عاشق
آزار کے مناسب تدبیر کیا نکالی

دل بند ہے ہمارا موجِ ہوائے گل سے
اب کے جنوں میں ہم نے زنجیر کیا نکالی

نامے پہ لوہو رو رو خط کھینچ ڈالے سارے
یہ میر بیٹھے بیٹھے تحریر کیا نکالی

۷۱۹

جی رشک سے گئے جو اُدھر کو صبا چلی
کیا کہیے آج صبح عجب کچھ ہوا چلی

کیا رنگ و بو و بادِ سحر سب ہیں گرمِ راہ
کیا ہے جو اس چمن میں ہے ایسی ہوا چلی

فتنہ ہے اس سے شہر میں برپا ہزار جا
تلوار اس کی چال پہ کیا ایک جا چلی

تو دو قدم جو راہ چلا گرم اے نگار
مہندی کفک کی آگ دلوں میں لگا چلی

۷۲۱

آج کچھ بے حجاب ہے وہ بھی
کیا ہی مست شراب ہے وہ بھی

وہم جس کو محیط سمجھا ہے
دیکھیے تو سراب ہے وہ بھی

حسن سے دُودِ دل نہیں خالی
زلفِ پُر پیچ و تاب ہے وہ بھی

۷۲۲

بُرقع کو اُٹھا دینا پر آدھے ہی چہرے سے
کیا منہ کو چھپانا بھی کچھ جھمکی دِکھانا بھی

۷۱۳

دل ترا آیا کسو کے پیچ میں جو سُدھ گئی — متصل بکھرے رہا کرتے ہیں منہ پر بال کچھ
ماہ سے ماہی تلک اس داغ میں ہیں مبتلا — کیا بلائے جان ہے میرا تمہارا حال کچھ
ایک دن کنجِ قفس میں ہم کہیں رہ جائیں گے — بے کلی گل بن بہت رہتی ہے اب کے سال کچھ

کیا اس آتش باز کے لونڈے کا اتنا شوق میر
بہہ چلی ہے دیکھ کر اس کو تمہاری رال کچھ

اب تو صبا چمن سے آتی نہیں ادھر کچھ ۷۱۳ ہم تک نہیں پہنچتی گل کی خبر عطر کچھ
آنکھوں میں میری عالم سارا سیاہ ہے اب — مجھ کو بغیر اس کے آتا نہیں نظر کچھ

۷۱۴

کچھ کرو فکر مجھ دِوانے کی — دھوم ہے پھر بہار آنے کی
تیز یوں ہی نہ تھی شبِ آتش شوق — تھی خبر گرم اُس کے آنے کی

وہ جو پھرتا ہے مجھ سے دور ہی دور
ہے یہ تقریب جی کے جانے کی

۷۱۵

میر دریا ہے سنے شعر زبانی اُس کی — اللہ اللہ رے طبیعت کی روانی اس کی
خاطرِ بادیہ سے دیر میں جاوے گی کہیں — خاک مانند بگولے کے اڑانی اس کی
ایک ہے عہد میں اپنے وہ پراگندہ مزاج — اپنی آنکھوں میں نہ آیا کوئی ثانی اس کی
مینھ تو بوچھار کا دیکھا ہے برستے تم نے — اسی انداز سے تھی اشک فشانی اس کی
بات کی طرز کو دیکھو تو کوئی جادو تھا — پر ملی خاک میں کیا سحر بیانی اس کی
کچھ لکھا ہے تجھے ہر برگ پہ اے رشکِ بہار — رقعہ واریں ہیں یہ اوراقِ خزانی اس کی
سرگزشت اپنی کس اندوہ سے شب کہتا تھا — سو گئے تم نہ سنی آہ کہانی اس کی
مرثیے دل کے کئی کہہ کے دیے لوگوں کو — شہرِ دلی میں ہے سب پاس نشانی اس کی

آبلے کی سی طرح ٹھیس لگی، پھوٹ بہے
دردمندی میں گئی ساری جوانی اس کی

۷۲۸

ہر بحر میں اشعار کہے عمر کو کھویا　　اس گوہرِ نایاب کی کچھ بات نہ ہوئی
قاصد کے تصنع نے کیا دل کے تئیں داغ　　بے تاب مجھے دیکھ کے، کچھ بات نہ ہوئی
فریاد انھیں رنگوں ہے گلزار میں ہر صبح
بلبل نے مری طرزِ سخن صاف اڑائی

۷۲۹

اب کے اس کی راہ میں جو ہُو سُو ہُو　　یاد بھی آتا ہے، یا جاتا ہے جی
کیا کہیں تم سے کہ اس شعلے بغیر　　جی ہمارا کچھ جلا جاتا ہے جی
آسماں شاید ورے کچھ آگیا
رات سے کیا کیا رکا جاتا ہے جی

۷۳۰

دلیل اس بیاباں میں دل ہی ہے اپنا　　نہ خضر و بلدیاں، نہ رہبر نہ ہادی
مزاجوں میں یاس آگئی ہے ہمارے　　نہ مرنے کا غم ہے، نہ جینے کی شادی
وفا لوگ آپس میں کرتے تھے آگے　　یہ رسمِ کہن آہ تم نے اُٹھا دی
جُدا ان غزالانِ شہری سے ہو کر
پھرے ہم بگولے سے وادی بہ وادی

۷۳۱

صبح ہے کوئی آہ کریجیے
آسماں کو سیاہ کریجیے

۷۳۲

آفاق میں جو ہوتے اہلِ کرم تو سنتے　　ہم برسوں رعد آسا بے تاب ہو پکارے
جل بجھیے اب تو بہتر مانند برقِ خاطف　　جوں ابر کس کے آگے دامن کوئی پسارے

۷۳۳

سیر کی ہم نے ہر کہیں پیارے
پھر جو دیکھا تو کچھ نہیں پیارے

۷۲۳

لطف پر اس کے ہم نشیں مت جا | کبھو ہم پر بھی مہربانی تھی
میرے قصّے سے سب کی گئیں نیندیں | کچھ عجب طور کی کہانی تھی

عاشقی جی ہی لے گئی آخر
یہ بلا کوئی ناگہانی تھی

۷۲۴

دیکھا تو مثلِ اشک نظر سے گرا دیا | اب میری اسکی آنکھ میں عزّت نہیں رہی
پیدا کہاں ایسے پراگندہ طبع لوگ | افسوس تم کو میر سے صحبت نہیں رہی

۷۲۵

عکس اس بے دید کا تو متصل پڑتا تھا صبح | دن چڑھے کیا جانوں آئینے کی کیا صورت ہوئی
مرگیا آوارہ ہو کر میں تو جیسے گردباد | پر جسے یہ واقعہ پہنچا اسے وحشت ہوئی
دل کا جانا آج کل تازہ ہوا ہو تو کہوں | گذرے اس بھی سانحے کو ہم نشیں مدت ہوئی
ہم نہ کہتے تھے کہ نقش اس کا نہیں نقّاش سہل | چاند سارا لگ گیا تب نیم رخ صورت ہوئی

اس غزل پر شام سے تو صوفیوں کو وجد تھا
پھر نہیں معلوم کچھ مجلس کی کیا حالت ہوئی

۷۲۶

آنکھ اٹھا کر ٹک جو دیکھا گھر کے گھر بٹھلا دیے
اک نگہ میں سیکڑوں کی خانہ ویرانی ہوئی

۷۲۷

نرا دھوکا ہی ہے دریائے ہستی | نہیں کچھ تہ سے تجھ کو آشنائی
نہ نکلا ایک شب اس راہ وہ ماہ | بہت کی ہم نے طالع آزمائی
کہا تھا میں، نہ دیکھو غیر کی اور | سو تم نے آنکھ مجھ سے ہی چھپائی
جفا اس کی نہ پہنچی انتہا کو | دریغا عمر نے کی بے وفائی

نہ تھا جب درمیاں آئینہ تب تک
تھی یک صورت کہ ہو جاوے صفائی

اس شوخ کا تمکین سے آنا ہے قیامت
اُکتانے لگے ہم نفساں تم تو ابھی سے
تاثو سے زباں رات کو مطلق نہیں لگتی
عالم ہے سیہ خانہ مری نوحہ گری سے

۷۴۱

ہشیار کہ ہے راہ محبت کی خطرناک مارے گئے لوگ بہت بے خبری سے
جب لب ترے یاد آتے ہیں آنکھوں سے ہماری تب ٹکڑے نکلتے ہیں عقیق جگری سے

۷۴۲

برسوں ہوئے گئے ہوئے اس مہ کو بام سے کاہش مجھے جو ہے وہی ہوتی ہے شام سے
دل اور عرش دونوں پہ گویا ہے ان کی سیر کرتے ہیں باتیں میر جی کس کس مقام سے

۷۴۳

ہو برافروختہ وہ بت جو ے احمر سے آگ نکلے ہے تماشے کے تئیں پتھر سے
سیر کرنے کو جو چلے ہے کبھو وہ فتنہ خرام شہر میں شور قیامت اُٹھے ہے ہر گھر سے
کوچۂ یار ہے کیا طرفہ بلا خیز مقام
آتے ہیں فتنہ و آشوب چلے اودھر سے

۷۴۴

بھری آنکھیں کسو کی پوچھتے جو آستیں رکھتے ہوئی شرمندگی کیا کیا ہمیں اس دست خالی سے
ریاضاتِ محبت نے رکھا ہے ہم میں کیا باقی نمود اک کرتے ہیں ہم یوں ہی اب شکلِ مثالی سے
ہم اس راہِ حوادث میں بسانِ سبزہ واقع ہیں
کہ فرصت سر اُٹھانے کی نہیں ٹک پائمالی سے

۷۴۵

دنیا میں ہے بسیرا یا رو سرائے کا سا
یہ رہروان ہستی عازم ہیں سب سفر کے

۷۴۶

کس کو خبر ہے کشتی تباہوں کے حال کی تختہ مگر کنارے کوئی بہہ کے جا لگے

۷۳۴

سخن یہی ہے جو کہتے ہیں شعر میرؔ ہے سحر
زبانِ خلق کو کس طور کوئی بند کرے

۷۳۵

جل تھل فقط نہیں مرے رونے سے بھر گئے
جنگل پڑے تھے سوکھے سو وہ بھی ہوئے ہرے

۷۳۶

وہی شورش موئے پر بھی ہے اب تک ساتھ یاں میرے
ہُما کے آشیانے ہیں جلیں ہیں استخواں میرے
لب و لہجہ غزل خوانی کا کس کو آج کل ایسا
گھڑی بھر کو ہوئے مرغِ چمن ہم داستاں میرے

۷۳۷

بہار آئی ہے غنچے گل کے نکلے ہیں گلابی سے   نہالِ سبز جھومے ہیں گلستاں میں شرابی سے
نکل آتے ہو گھر سے چاند سے یہ کیا طرح پکڑی   قیامت ہووے گی ایک دن اس بے حجابی سے

۷۳۸

تصویر کے سے طائر خاموش رہتے ہیں ہم   جی کچھ اُچٹ گیا ہے اب نالہ و فغاں سے
خاموشی ہی میں ہم نے دیکھی ہے مصلحت اب   ہر یک سے حالِ دل کا مدت کیا زباں سے
اتنی بھی بدمزاجی ہر لحظہ میرؔ تم کو
اُلجھاؤ ہے زمیں سے جھگڑا ہے آسماں سے

۷۳۹

خاموش رہ سکے نہ تو بڑھ کر بھی کچھ نہ کہہ   سر شمع کا کٹے ہے زبانِ دراز سے
اب جا کسو درخت کے سائے میں بیٹھیے   اس طور پھریے کب تئیں بے برگ ساز سے

۷۴۰

آتش بجگر اُس دُرِ نایاب سے سب ہیں
دریا بھی نظر آئے اسی خشک لبی سے

شورش کدۂ عالم کہنے ہی کی جاگہ تھی دل کیا کرے جو ایسے ہنگامے میں پھنس جاوے
دل ہے تو عبث نالاں یارانِ گزشتہ بن ممکن نہیں اب اُن تک آوازِ جرس جاوے
اُس زلف سے لگ چلنا اک سانپ کھلانا ہے یہ مارِ سیہ یارو ناگاہ نہ ڈس جاوے

ہے میر عجب کوئی درویشِ برشتہ دل
بات اُس کی سنو تم تو چھاتی بھی جُھلس جاوے

۷۵۴

ہو سکتی ہیں سدِّ رہ پلکیں کہیں رونے کی تنکوں سے رُکے ہے کب دریا جو بہا چاہے
رنگِ گل و بوئے گل ہوتے ہیں ہوا دونوں کیا قافلہ جاتا ہے جو تو بھی چلا چاہے

۷۵۵

مرغانِ باغ رہتے ہیں اب گھیرے یوں مجھے ماتم زدوں کے حلقے میں جو نوحہ گر رہے
اب صبر و ہوش و عقل کی میرے یہ ہے معاش جوں قافلہ لُٹا کہیں آکر اُتر رہے

آتا کبھو تو ناز سے دکھلائی دے بھی جا
دروازے ہی کے اُور کہاں تک نظر رہے

۷۵۶

مقصود گُم کیا ہے تب ایسا ہے اضطراب چکّر میں ورنہ کاہے کو یوں آسماں رہے
گہہ شام اُس کے مُو سے ہے گہہ رُوسے اس کے صبح تم چاہو ہو کہ ایک سا ہی یاں سماں رہے

۷۵۷

آج غزال اک رہبر بن کر لایا تُربت مجنوں پر
قصدِ زیارت رکھتے تھے ہم جب سے وحشت رکھتے تھے
کس دن ہم نے سر نہ چڑھا کر ساغرِ مے کو نوش کیا
دَور میں اپنے دخترِ رز کی ہم اک حُرمت رکھتے تھے
چشم جہاں تک جاتی تھی گل دیکھتے تھے ہم سُرخ و زرد
پھول چمن کے کس کے منہ سے ایسی خجلت رکھتے تھے
کام کرے کیا سعی و کوشش مطلب یاں ناپیدا تھا
دست و پا بہتیرے مارے جب تک قدرت رکھتے تھے

بن ہڈیوں ہماری ہما کچھ نہ کھائے گا　　　ٹک چاشنی عشق کا اُس کو مزا لگے

مقصود کے خیال میں بہتوں نے چھانی خاک
عالم تمام وہم ہے یاں ہاتھ کیا لگے

۷۴۷

شاخِ گل تیری طرف جھکتی جو ہے اے مستِ ناز
چاہتی ہے تو بھی میرے ہاتھ سے اک جام لے

۷۴۸

اب جو وہ سرمایۂ جاں یاں تلک آیا تو کیا
راہ تکتے تکتے اُس کی ہم تو آخر مر چلے

۷۴۹

ہائے کس حسرت سے شبنم نے سحر رو کر کہا
خوش رہو اے ساکنانِ باغ اب تو ہم چلے

۷۵۰

ہے محو رُخ اپنا تو آئینے میں ہر ساعت
صورت ہے جو کچھ دل کی سو تیری بلا جانے

۷۵۱

الٰہی کہاں منھ چھپایا ہے تو نے　　　ہمیں کھو دیا ہے تری جستجو نے
نہ بھائیں تجھے میری باتیں وگرنہ　　　رکھی دھوم شہروں میں اس گفتگو نے

تری چال ٹیڑھی، تری بات روکھی
تجھے میرؔ سمجھا ہے یاں کم کسو نے

۷۵۲

ویسا ہے یہ جو یوسف شب تیرے ہوتے آوے
جیسے چراغ کوئی مہتاب میں جلاوے

۷۵۳

یا بادۂ گلگوں کی خاطر سے ہوس جاوے　　　یا ابر کوئی آوے اور آکے برس جاوے

۷۶۳

بوئے گل پیش از سحر گلزار سے رخصت ہوئی
ہم ستم کش رو بہ رو اس کے تو سوتے رہے

۷۶۴

گل گئے بوٹے گئے گلشن ہوئے برہم گئے
کیسے کیسے ہائے اپنے دیکھتے موسم گئے

کیا کم اس خورشید رو کی جستجو یاروں نے کی
لوہو روتے جوں شفق پورب گئے پچھم گئے

شاید اب ٹکڑوں نے دل کے قصد آنکھوں کا کیا
کچھ سبب تو ہے جو آنسو آتے آتے تھم گئے

سبزہ و گل، خوش نشینی اس چمن کی جن کو تھی
سو بھی تو دیکھا گریباں چاک و مژگاں نم گئے

ربط صاحب خانہ سے مطلق بہم پہنچا نہ میر
مدتوں سے ہم حرم میں تھے پہ نا محرم گئے

۷۶۵

کیا غزالوں کو ہی ہم بن وحشتِ بسیار ہے
کوہ بھی نالاں رہے جب ہم بیاباں سے گئے

لائی آفت خانقاہ و مسجد اوپر وہ نگاہ
صوفیاں دیں سے گئے سب شیخ ایماں سے گئے

۷۶۶

کام کیا بالِ ہما سے چترِ شہ سے کیا غرض
سر پر اک دیوار ہی کا اس کی سایا چاہیے

کیاریوں ہی میں پڑے رہیے گا سایے کی روش
اپنے ہوتے اب کے موسم گل کا آیا چاہیے

گاہ برقع پوش ہو گہ مُو پراگندہ کرو
تم کو ہم سے منہ بہر صورت چھپایا چاہیے

۷۶۷

آئے ہیں تنگ جان سے قیدِ حیات میں
اس بند سے ہمارے تئیں اب چھڑائیے

گرداب وار یار ترے صدقے جائیے
دریا کا پھیر پائیے تیرا نہ پائیے

۷۶۸

پر نہیں جو اُڑ کے اُس در جائیے
زندگانی حیف ہے مر جائیے

کچھ نہیں تو شعر ہی کی فکر کر
آئے ہیں جو یاں تو کچھ کر جائیے

خانماں آباد جو ہے سو خراب
کس کے اُٹھ کر شہر میں گھر جائیے

۷۵۸

شمس و قمر کے دیکھے جی اس میں جا رہے ہے — اس دل فروز کے بھی رخسار ایسے ہی تھے
تو ہو نہ کیوں رُلائے ان کا گداز ہونا — یہ دل جگر ہمارے غم خوار ایسے ہی تھے
ہو جائے کیوں نہ دوزخ باغِ زمانہ ہم پر — ہم بے حقیقتوں کے کردار ایسے ہی تھے

دیوار سے پٹک سر میں جو مُوا تو بولا
کچھ اس ستم زدہ کے آثار ایسے ہی تھے

۷۵۹

شور متاعِ خوبی اس شوخ کا بلا تھا — بازاری سب دُکانیں اپنی بڑھا کے بیٹھے
وادیٔ قیس سے پھر آئے نہ میر صاحب — مُرشد کے ڈھیر پر وے شاید کہ جا کے بیٹھے

۷۶۰

ہے جنبشِ لبِ مشکل جب آن کے وہ بیٹھے — جو چاہیں سو یوں کہہ لیں لوگ اپنی جگہ بیٹھے
جی ڈوب گئے اپنے اندوہ کے دریا میں — دے جوش کہاں اب ہم مدت ہوئی وہ بیٹھے
کیا رنگ ہیں شوخی ہے اس کے تنِ نازک کی — پیراہن اگر پہنے تو اس پہ بھی تہ بیٹھے
مرتے موئے پر چاہت ظاہر نہ کی اگلوں نے — بے حوصلہ تھے ہم جو اس راز کو کہہ بیٹھے

کیا جانے کہ ایدھر کا کب قصد کرے گا وہ
پامال ہوئے ہم تو اس سے سرِ رَہ بیٹھے

۷۶۱

نکتہ داں بھی خدا نے تم کو کیا — پر ہمارا نہ مُدعا سمجھے
لکھے دفتر کتابیں کیں تصنیف — پر نہ طالع کا ہم لکھا سمجھے

میر صاحب کا ہر سخن ہے رمز
بے حقیقت ہے شیخ کیا سمجھے

۷۶۲

اب اپنے قدِ راست کو خم دیکھتے ہیں ہائے — ہستی کے تئیں ہوتے عدم دیکھتے ہیں ہائے
کیا روتے ہیں یارانِ گزشتہ کے لیے ہم — جب راہ میں کچھ نقشِ قدم دیکھتے ہیں ہائے

صبا اودھر، گل اودھر، سرو اودھر اُسی کی باغ میں اب تو ہوا ہے
تماشا کردنی ہے داغِ سینہ یہ پھول اس تختے میں تازہ کھلا ہے
جو چپکے ہوں، کہے چپکے ہو کیوں تم ق کہو جو کچھ تمہارا مدّعا ہے
سخن کریے تو ہووے حرف زن یوں بس اب منہ موندرے میں نے سُنا ہے
کب اس بیگانہ خو کو سمجھے عالم ق گرچہ یار عالم آشنا ہے
نہ عالم میں ہے نے عالم کے باہر
یہ سب عالم سے عالم ہی جُدا ہے

۷۷۶

شور میرے جنوں کا جس جا ہے دخلِ عقل اس مقام میں کیا ہے
شور بازار میں ہے یوسف کا وہ بھی آ نکلے تو تماشا ہے
نظر آئے تھے وہ حنائی پا آج تک فتنہ ایک برپا ہے
دل کھنچے جاتے ہیں اُس کی اُور سارے عالم کی وہ تمنّا ہے
ٹک گریباں میں سر کو ڈال کے دیکھ
دل بھی دامن وسیع صحرا ہے

۷۷۷

کس غم میں مجھ کو یارب یہ مبتلا کیا ہے
دل ساری رات جیسے کوئی ملا کیا ہے

۷۷۸

آغاز تو یہ ہے کچھ روتے ہیں خون ہر دم کیا جانے عاشقی کا یارو مآل کیا ہے
سرگرم جلوہ اس کو دیکھے کوئی سو جانے طرز خرام کیا ہے، حسن و جمال کیا ہے
گر آپ میں نہیں ہو گہ منتظر کہیں ہو
کچھ میر جی تمہارا ان روزوں حال کیا ہے

۷۷۹

ہر طرف بحث تجھ سے ہے اے عشق شکر تیرا تری شکایت ہے
اب وہ مہ اور ایک مہ سے ملا چند در چند یہ حکایت ہے

۷۶۹

گل پھول اس چمن کے چلو صبح دیکھ لیں
شبنم سے رنگ پھر کوئی دم میں ہوا ہیں یے

۷۷۰

ہر کوئی اس مقام میں دس روز　　اپنی نوبت بجائے جاتا ہے
دیکھ سیلاب اس بیاباں کا　　کیسا سر کو جھکائے جاتا ہے
کیا کیا ہے فلک کا میں کہ مجھے
خاک ہی میں ملائے جاتا ہے

۷۷۱

جب نسیم سحر اُدھر جا ہے　　ایک سناٹا گزر جا ہے
وہ کھلے بال سووے ہے شاید　　رات کو جی مرا بکھر جا ہے

۷۷۲

کیا جانیے کہ چھاتی جلے ہے کہ داغِ دل
اک آگ سی لگی ہے کہیں کچھ دھواں سا ہے

۷۷۳

رہے خیال نہ کیوں ایسے ماہ طلعت کا
اندھیرے گھر کا ہمارے وہی اُجالا ہے

۷۷۴

چھاتی جلا کرے ہے سوزِ دروں بلا ہے　　اک آگ سی رہے ہے کیا جانیے کہ کیا ہے
حسن اُن بھی معنیوں کا تھا آپ ہی صورتوں میں　　اس مرتبے سے آگے کوئی چلے تو کیا ہے
نایاب اس گہر کی کیا ہے تلاش آساں
جی ڈوبتا ہے اس کا جو تہ سے آشنا ہے

۷۷۵

ہمارا تو ہے اصلِ مدعا تو　　خدا جانے ترا کیا مدعا ہے
نہیں ملتا سخن اپنا کسو سے　　ہماری گفتگو کا ڈھب جدا ہے

اُٹھنے کی اک ہوس ہے ہم کو قفس سے ورنہ — شائستہ پریدن بازو ہیں پر کہاں ہے

پیرانہ سر چلے ہیں اُٹھ کر گلی سے اس کی
کیا پیش آوے دیکھیں وقتِ سفر کہاں ہے

۷۸۵

کیا کہیے کلی سا وہ دہن ہے — اس میں سو پیچ سخن ہے
وابستگی مجھ سے شیشہ جاں کی — اس سنگ سے ہے کہ دل شکن ہے
لطف اس کے بدن کا کچھ نہ پوچھو — کیا جانیے جان ہے کہ تن ہے
وے بندِ قبا کھلے تھے شاید — صد چاک گلوں کا پیرہن ہے
گہ دیر میں ہیں گہے حرم میں — اپنا تو یہی دِوانہ پن ہے
ہم کشتۂ عشق ہیں ہمارا — میدان کی خاک ہی کفن ہے

کر میر کے حال پر ترحم
وہ شہر غریب و بے وطن ہے

۷۸۶

ہم مست بھی ہو دیکھا آخر مزا نہیں ہے — ہشیاری کے برابر کوئی نشا نہیں ہے
ہر صبح اُٹھ کے تجھ سے مانگوں ہوں میں تجھی کو — تیرے سوائے میرا کچھ مدّعا نہیں ہے
زیرِ فلک رکا ہے اب جی بہت ہمارا — اس بے فضا قفس میں مطلق ہوا نہیں ہے
تھیں پیش از آشنائی کیا آشنا نگاہیں — اب آشنا ہوئے پر آنکھ آشنا نہیں ہے

کریے جو ابتدا تو تا حشر حال کہیے
عاشق کی گفتگو کو کچھ انتہا نہیں ہے

۷۸۷

کیا تنِ نازک ہے جاں کو بھی حسد جس تن پہ ہے
کیا بدن کا رنگ ہے تہ جس کی پیراہن پہ ہے
گرد جب اٹھتی ہے اک حسرت سے رہ جاتے ہیں دیکھ
وحشیانِ دشت کی آنکھ اس شکار افگن پہ ہے

دہر کا ہو گلہ کہ شکوۂ چرخ   اُس ستم گر ہی سے کنایت ہے

کب ملے میر ملک داروں سے

وہ گدائے شہ ولایت ہے

۷۸۰

گرمی سے میری ابر کا ہنگامہ سرد ہے   آنکھیں اگر یہی ہیں تو دریا بھی گرد ہے

مجنوں کو مجھ سے کیا ہے جنوں ہیں مناسبت   میں شہر بند ہوں وہ بیاباں نورد ہے

ٹھہرے نہ چرخ نیلی پہ انجم کی چشمِ شوخ

اس قصر میں لگا جو ہے کیا لاجورد ہے

۷۸۱

ہم آپ سے گئے سو الٰہی کہاں گئے   مدت ہوئی کہ اپنا ہمیں انتظار ہے

بس وعدۂ وصال سے کم دے مجھے فریب   آگے ہی مجھ کو تیرا بہت اعتبار ہے

مائل نہیں ہے سرو ہی تنہا تری طرف   گل کو بھی تیرے دیکھنے کا خار خار ہے

کل سرو ناز باغ میں آیا نظر مجھے

میں نے فریب شوق سے جانا کہ یار ہے

۷۸۲

فلک پر جو مہ ہے تو روشن ہے یہ   کہ منہ سے ترے نسبتِ دُور ہے

ہم اب ناتوانوں کو مرنا ہے صرف   نہیں یہ کہ جینا بھی منظور ہے

۷۸۳

شاخ گل کا ہے کہ اس لطف سے لچکے ہے کہیں   لاگ والا کوئی دیکھے تجھے، تو، نازک ہے

چشمِ انصاف سے بُرقع کو اُٹھا دیکھو اسے   گل کے منہ سے تو کئی پردہ وہ رُو نازک ہے

۷۸۴

مستی میں جا دبے جا مدِّ نظر کہاں ہے   بے خود ہیں اس کی آنکھیں ان کو خبر کہاں ہے

پانی ہو بہہ گئے سب اجزا بدن کے لیکن   یوں بھی کہا نہ اُن نے وہ چشم تر کہاں ہے

لے اِس سرے سے یارو اُجڑی ہے اُس سرے تک   اقلیم عاشقی میں آباد گھر کہاں ہے

آرزو اس بلند و بالا کی کیا بلا میرے سر پہ لائی ہے
دیدنی ہے شکستگی دل کی کیا عمارت غموں نے ڈھائی ہے
یاں ہوئے خاک سے برابر ہم واں، وہی ناز و خودنمائی ہے
مرگِ مجنوں سے عقل گم ہے میر
کیا دِوانے نے موت پائی ہے

۷۹۴

روتا پھرا ہوں برسوں تو ہو چمن میں
کوچے میں اُس کے یکسر گل کاری ہو گئی ہے

۷۹۵

جو رونا ہے راتوں کو اپنا یہی تو کنارہ کوئی دن میں دریا کرے ہے
بنی صورتیں کیسی کیسی بگاڑیں سمجھتے نہیں ہم فلک کیا کرے ہے
خط افشاں کیا خونِ دل سے تو بولا بہت اب تو رنگین انشا کرے ہے
ہلاک آپ کو میر مت کر دِوانے
کوئی ذی شعور آہ ایسا کرے ہے

۷۹۶

گرم آکر ایک دن وہ سینے سے لگ گیا تھا
تب سے ہماری چھاتی ہر شب جلا کرے ہے
سوراخِ سینہ میرے رکھ ہاتھ بند مت کر
ان روزنوں سے دل ٹک کسب ہوا کرے ہے
گل ہی کی اور ہم بھی آنکھیں لگا رکھیں گے
ایک آدھ دن جو موسم اب کے وفا کرے ہے
ایک آفتِ زماں ہے یہ میر عشق پیشہ
پردے میں سارے مطلب اپنے ادا کرے ہے

۷۹۷

کارِ دل اُس مہِ تمام سے ہے کاہش اک روز مجھ کو شام سے ہے

۷۸۸

یہ رات ہجر کی یاں تک تو دُکھ دکھاتی ہے		کہ شکل صبح مری سب کو بھول جاتی ہے
ہنسے ہے چاکِ قفس کھلکھلا کے مجھ اوپر		چمن کی یاد میں جب بے کلی رُلاتی ہے

۷۸۹

نہیں ٹک بیٹھنے دیتے تم اپنی بزم میں ہم کو		مروّت رسم تھی مدّت کی سو تم نے اٹھا دی ہے
تپش سے رنگ اُڑا جاوے قلق سے جان گھبراوے		دیا ہے دل الٰہی ہم کو یا کوئی بلا دی ہے
کوئی صورت نہیں اس گھر سے اب تیرے نکلنے کی		قیامت کی ہے جن نے آرسی تجھ کو دکھلا دی ہے

کجیِ ذہن اس وادی میں گمراہی کی ہے باعث
سلیم الطبع کو تو پاؤں کا ہر نقش ہادی ہے

۷۹۰

کیا حال بیاں کریے عجب طرح پڑی ہے		وہ طبع تو نازک ہے کہانی یہ بڑی ہے
ایسا نہ ہوا ہوگا کوئی واقعہ آگے		اک خواہش دل ساتھ مرے جیتی گڑی ہے
کیا نقش میں مجنوں ہی کے تھی رفتگیِ عشق		لیلیٰ کی بھی تصویر تو حیران کھڑی ہے
جاتے ہیں چلے متّصل آنسو جو ہمارے		ہر تارِ نگہ آنکھوں میں موتی کی لڑی ہے

وہ زلف نہیں منعکسِ دیدۂ تر میر
اس بحر میں تہ داری سے زنجیر پڑی ہے

۷۹۱

واشد ہوئی نہ بلبل اپنی بہار میں بھی		کیا جانیے کہ جی میں یہ کیسی گل جھڑی ہے
آتش سی پھک رہی ہے سارے بدن میں میرے		دل میں عجب طرح کی چنگاری آ پڑی ہے

۷۹۲

اس منزلِ دلکش کو منزل نہ سمجھے گا
خاطر میں رہے یاں سے درپیش سفر بھی ہے

۷۹۳

کوفت سے جان لب پہ آئی ہے		ہم نے کیا چوٹ دل پہ کھائی ہے
لکھتے رقعہ لکھے گئے دفتر		شوق نے بات کیا بڑھائی ہے

دیوانِ سوم

۸۰۰

انتہا شوق کی دل کے جو صبا سے پوچھی — اک کفِ خاک کو لے ان نے پریشان کیا
مجھ کو شاعر نہ کہو میر کہ صاحب میں نے — درد و غم کتنے کیے جمع تو دیوان کیا

۸۰۱

سرگذشتِ عشق کی تہ کو نہ پہنچا یاں کوئی — گرچہ پیشِ دوستاں یہ داستاں میں لے گیا
ریختہ کاہے کو تھا اس رتبۂ اعلیٰ میں میر — جو زمیں نکلی اسے تا آسماں میں لے گیا

۸۰۲

کیا قدر ہے ریختے کی، گو میں — اس فن میں نظیری کا بدل تھا
تھا نزع میں دست میر دل پر — شاید غم کا یہی محل تھا

۸۰۳

فتنے فساد اُٹھیں گے گھر گھر میں خون ہوں گے — گر شہر میں خراماں وہ خانہ جنگ آیا
بُشرے کی اپنی رونق اے میر عارضی ہے — جب دل کو خوں کیا تو چہرے پہ رنگ آیا

۸۰۴

یاں کوئی دن رات وقفہ کر کے قصد آگے کا کر — کارواں گاہِ جہانِ رفتنی منزل ہے کیا

تم نہیں فتنہ ساز سچ صاحب — شہر پُر شور اس غلام سے ہے
کوئی تجھ سا بھی کاش تجھ کو ملے — مدّعا ہم کو انتقام سے ہے
شعر میرے ہیں سب خواص پسند — پر مجھے گفتگو عوام سے ہے

سہل ہے میرؔ کا سمجھنا کیا
ہر سخن اس کا اک مقام سے ہے

۷۹۸

لگ چلی ہے مگر اس گیسوے عنبر بُو سے — ناز کرتی ہوئی اس راہ صبا نکلے ہے
کیا ہے اقبال کہ اس دشمنِ جاں کے آتے — منھ سے ہر ایک کے سو بار دُعا نکلے ہے

۷۹۹

عبرت سے دیکھ جس جا یاں کوئی گھر بنے ہے
پردے میں چشم ڈھکنے دیوار و در بنے ہے
شب جوشِ غم سے جس دم لگتا ہے دل تڑپنے
ہر زخمِ سینہ اُس دم یک چشمِ تر بنے ہے
برسوں لگی رہی ہیں جب مہر و مہ کی آنکھیں
تب کوئی ہم سا صاحب صاحبِ نظر بنے ہے
یارانِ دیر و کعبہ دونوں بُلا رہے ہیں
اب دیکھیں میرؔ اپنا جانا کدھر بنے ہے

خون ہی آئے گا تو آنکھوں سے
ایک سیلِ بہار نکلے گا

۸۱۱

پچکے دیکھو چمکتے وے لب سُرخ — ذکر یاں کیا ہے لعل و مرجاں کا
کافرستاں ہے خال و خط و زلف — وقر کیا ہے دلِ مسلماں کا

۸۱۲

خوں ہوتی رہی دل ہی میں آزردگی میری
کس روز گلہ اس کا مرے تا بہ لب آیا

۸۱۳

کہتا تھا کسو سے کچھ، تکتا تھا کسو کا منھ — کل میر کھڑا تھا یاں سچ ہے کہ دِوانا تھا
کب اور غزل کہتا میں اس زمیں میں لیکن — پردے میں مجھے اپنا احوال سُنانا تھا

۸۱۴

کیا صورتیں بگڑی ہیں مشتاقوں کی ہجراں میں — اس چہرے کو اے خالق ایسا نہ بنانا تھا
ہو باغ و بہار آیا گل پھول کہیں پایا — جلوہ اسے یاں اپنا صد رنگ دکھانا تھا

۸۱۵

یاں اپنے جسمِ زار پہ تلوار سی لگی
ان نے جو بے دماغی سے ابرو کو خم کیا

۸۱۶

اب کی جو گل کی فصل میں، ہم کو جنوں ہوا — وہ دل کہ جس پہ اپنا بھروسا تھا، خوں ہوا
تھا شوقِ طوفِ تُربتِ مجنوں مجھے بہت — اک گرد بادِ دشت مرا رہنموں ہوا

۸۱۷

رات سے آنسو مری آنکھوں میں پھر آنے لگا — یک رمق جی تھا بدن میں سو بھی گھبرانے لگا
چشمک اس مہ کی سی دلکش دید میں آئی نہیں — گو ستارہ صبح کا بھی آنکھ جھپکانے لگا
کیونکہ اس آئینہ رو سے ملیے بے حجاب
وہ تو اپنے عکس سے بھی دیکھو شرمانے لگا

چوٹ میرے دل میں ایسی ہے کہ ہوں میں مم بخود　　وہ کشندہ یوں ہی کہتا ہے کہ تو گھائل ہے کیا
ہم تو سو سو بار مر رہتے ہیں ایک ایک آن میں　　عشق میں اُس کے گزرنا جان سے مشکل ہے کیا

مرثیہ میرے بھی دل کا رقت آور ہے بلا
محتشم کو میرؔ کیا جانوں اور مُقبل ہے کیا

۸۰۵

حیرت ہے کھولیں چشمِ تماشا کہاں کہاں　　حسن و جمال ویسا ہے اس کا حرام کیا
اس کنج لب پہ چپکے ہوئے منھ کو رکھ کے ہم　　دل چسپ اس مقام میں حرف و کلام کیا

جس جائے اس کے چہرے سے کرتے ہیں گفتگو
مرآت و ماہ و گل کا ہے اس جا مقام کیا

۸۰۶

کھینچا جو میں وہ ساعدِ سیمیں تو کہہ اٹھا　　بس بس کہیں ہمیں بھی صاحب غش آئے گا
جلوے سے اُس کے جل کے ہوئے خاک سنگ و خشت　　بیتاب دل بہت ہے یہ کتاب لائے گا

اڑتی رہے گی خاک جنوں کرتی دشت دشت
کچھ دست اگر یہ بے سر و ساماں بھی پائے گا

۸۰۷

وہ جو گلشن میں جلوہ ناک ہوا
پھول غیرت سے جل کے خاک ہوا

۸۰۸

تُربت کا میری نوحہ آئینے سے کرے ہے　　یعنی کہ اُن نے مجھ کو حیران کر کے مارا
پہلے گلے لگایا پھر دستِ جور اٹھایا　　مارا تو ان نے لیکن احسان کر کے مارا

۸۰۹

عدم کو نہیں مل کے جاتے ہیں لوگ　　غم اس راہ میں کیا ہے ہمراہ کا
اسیری کا دیتا ہے مژدہ مجھے　　مرا زمزمہ گاہ و بے گاہ کا

۸۱۰

آندھیوں سے سیاہ ہو گا چرخ　　دل کا تب کچھ غبار نکلے گا

عجب دن میر تھے دیوانگی میں دشت گردی کے
سراو پر سایہ گستر ہوتے تھے کیکر، جہاں میں تھا

۸۲۳

ہمارا ہے احوال حیرت کی جاگہ
جو دیکھے گا وہ بھی نظر کر رہے گا

۸۲۴

میر کا صحبت میں اس کی حرف سر کر رہ گیا
پیش جاتے کچھ نہ دیکھی چشم تر کر رہ گیا

۸۲۵

گردش میں رہا کرتے ہیں ہم دید میں انکی — آنکھوں نے تری خوب سماں ہم کو دکھایا
کیا کہیے دماغ اُس کا کہ گل گشت میں کل میر — گل شاخوں سے جھک آئے تھے پر منھ نہ لگایا

۸۲۶

جب گل کہے ہے اپنے تئیں یار کے رو سا — تب آنکھوں تلے میری اُترتا ہے لہو سا
تحقیق کروں کس سے حقیقت کے نشے کو — خضر آب اسے کہتا ہے، آتش کہے مُو سا

۸۲۷

نہ پتھروں سے جو سر کو دوپارہ میں کرتا
زمانہ غم کا مرے کس طرح بسر کرتا

۸۲۸

اے رشک شمع گویا تو موم کا بنا ہے
مہتاب میں تجھی کو دیکھا ہے یوں پگھلتا

۸۲۹

دیکھو ہو تو دور بھاگتے ہو — کچھ پاس نہیں تمہیں ہمارا

۸۱۸

آنکھیں دوڑیں خلق جا اودھر گری — اُٹھ گیا پردہ کہاں اودھم ہوا
در ہی سے بر ہی سے دیکھیو — دونوں عالم کا عجب عالم ہوا
جسمِ خاکی کا جہاں پردہ اٹھا
ہم ہوئے وہ میرؔ وہ سب ہم ہوا

۸۱۹

صد سخن آئے تھے لب تک، پر نہ کہنے پائے ایک — ناگہاں اس کی گلی سے اپنا جانا ہو گیا
رہنے کے قابل تو ہرگز تھی نہ یہ عبرت سرائے — اتفاقاً اُس طرف اپنا بھی آنا ہو گیا

۸۲۰

لوگ ہی اس کارواں کے حرف نشنو تھے تمام
راہ چلتے تو جرس ہر گام چلّاتا رہا

۸۲۱

وفا تھی، مہر تھی، اخلاص تھا، تلطّف تھا
کبھو مزاج میں اس کے ہمیں تصرّف تھا

۸۲۲

جنوں میں ساتھ تھا کل لڑکوں کا لشکر جہاں میں تھا
چلے آتے تھے چاروں اُور سے پتھر جہاں میں تھا
تجلّی جلوہ اس رشکِ قمر کا قُرب تھا مجھ کو
جلے جاتے تھے واں جائے ملک کے پر جہاں مَیں تھا
گلی میں اس کی میری رات کیا آرام سے گزری
یہی تھا سنگ بالیں خاک تھی بستر جہاں مَیں تھا
چبھیں تھیں جی میں وے پلکیں لگیں تھیں دل کو وے بھوئیں
یہی شمشیر چلتی تھی یہی خنجر، جہاں مَیں تھا
خیال چشم و روئے یار کا بھی طُرفہ عالم ہے
نظر آیا ہے واں اک عالمِ دیگر جہاں مَیں تھا

۸۳۳

ان نے کھینچا ہے مرے ہاتھ سے داماں اپنا
کیا کروں گر نہ کروں چاک گریباں اپنا

۸۳۴

دل عجب شہر تھا خیالوں کا — لوٹا مارا ہے حسن والوں کا
جی کو جنجال دل کو ہے اُلجھاؤ — یار کے حلقہ حلقہ بالوں کا
موے دلبر سے مشک بُو ہے نسیم — حال کچھ اس کے خستہ حالوں کا
نہ کہا کچھ، نہ آ پھرا، نہ مِلا
کیا جواب ان مرے سوالوں کا

۸۳۵

پتّے کے کھڑکنے سے ہوتی ہے ہمیں وحشت — کیا طور ہے ہم اپنے سائے سے رمیدوں کا
کیا کیا نہ گیا اُس بِن صبر اور دماغ و دل — رونق گئی بشرے سے پھر نور بھی دیدوں کا

۸۳۶

کس دن سرشکِ خونیں منھ پر نہ بہ کر آئے — کس شب پلک کے اوپر لختِ جگر نہ دیکھا
یاں شہر شہر بستی اوجڑ ہی ہوتے پائی — اقلیم عاشقی میں بستا نگر نہ دیکھا
سوجھا نہ چاہ میں کچھ برباد کر چکے دل
میر اندھے ہو رہے تھے اپنا بھی گھر نہ دیکھا

۸۳۷

آ کر کھڑا ہوا تھا بہ صد حسنِ جلوہ ناک — اپنی نظر میں وہ دُرِ نایاب تھا سو تھا
کیا بھاری بھاری قافلے پاس سے چلے گئے — تجھ کو وہی خیال گراں خواب تھا سو تھا
ساون ہرے نہ بھادوں میں ہم سوکھے اہلِ درد
سبزہ ہماری پلکوں کا سیراب تھا سو تھا

تھا کس کو دماغ باغ اُس بن
بلبل نے بہت مجھے پکارا

رخسار کے پاس وہ دُرِ گوش
ہے پہلوے ماہ میں ستارا

پھولی مجھے دیکھ کر گلوں میں
بلبل کا ہے باغ میں اجارا

۸۳۰

بزم عشرت پر جہاں کی گوش وا کر جاے چشم
آج یاں دیکھا گیا جو کچھ کل افسانہ ہوا

کیا کہیں حسرت لیے جیسے جہاں سے کوئی جائے
یار کے کوچے سے اپنا اس طرح جانا ہوا

۸۳۱

دوریِ یار میں ہے حال دل ابتر اپنا
ہم کو سو کوس سے آتا ہے نظر گھر اپنا

یک گھڑی صاف نہیں ہم سے ہوا یار کبھی
دل بھی جوں شیشۂ ساعت ہے مُکدّر اپنا

لب پہ لب رکھ کے نہ اس گل کے کبھو ہم سوئے
یہ بساطِ خسک و خار ہے بستر اپنا

کیسی رسوائی ہوئی عشق میں کیا نقل کریں
شہر و قصبات میں مذکور ہے گھر گھر اپنا

اُس گلِ تر کی قبا کے کہیں کھولے تھے بند
رنگوں گل برگ کے ناخن ہے معطّر اپنا

پیش کچھ آ ؤ ہیں ہم تو ہیں ہر صورت سے
مثلِ آئینہ نہیں چھوڑتے ہم گھر اپنا

میرؔ خط بھیجے پر اب رنگ اُڑا جاتا ہے
کہ کہاں بیٹھے کِدھر جائے کبوتر اپنا

۸۳۲

کیا میرؔ دل شکستہ بھی وحشی مثال تھا
دُنبالہ گردِ چشم سیاہِ غزال تھا

آخر کو خوابِ مرگ ہمیں جا سے لے گئی
جی دیتے تک بھی سر میں اسی کا خیال تھا

سرو اس طرف کو جیسے گنہ گار تھا کھڑا
اودھر جو آب جُو کے وہ نازک نہال تھا

کیا میرے روزگار کے اہلِ سخن کی بات
ہر ناقص اپنے زعم میں صاحب کمال تھا

کیا کیا ہوائیں دیدۂ تر سے نظر پڑیں
جب رونے بیٹھ جاتے تھے تب برشکال تھا

۸۴۵

منھ لگاتا تو در کنار، ان نے　　نہ کہا ہے یہ آشنا صورت
حلقے آنکھوں میں پڑ گئے منھ زرد　　ہو گئی میر تیری کیا صورت

۸۴۶

زخم جھیلے داغ بھی کھائے بہت　　دل لگا کر ہم تو پچھتائے بہت
پھول، گل، شمس و قمر سارے ہی تھے　　پر ہمیں ان میں تمھیں بھائے بہت
وہ جو نکلا صبح جیسے آفتاب
رشک سے گل، پھول مرجھائے بہت

۸۴۷

کوشش اپنی تھی عبث پر کی بہت　　کیا کریں ہم چاہتا تھا جی بہت
سب ترے محوِ دعائے جان ہیں　　آرزو اپنی بھی ہے تو جی بہت

۸۴۸

سخن غم سے آغشتہ خوں ہے ولیکن　　نہیں لب مرے آشنائے شکایت
ہمیں عشق میں میر چپ لگ گئی ہے　　نہ شکر و شکایت نہ حرف و حکایت

چ

۸۴۹

آرزومند ہے خورشید میسر ہے کہاں
کہ تنک ٹھہرے ترے سایۂ دیوار کے بیچ

۸۵۰

اس بحر میں رہا مجھے چکر بھنور کے طور
سرگشتگی میں عمر گئی سب وطن کے بیچ

ح

۸۵۱

سرسبز ہم ہوئے نہ تھے، جو زرد ہو چلے　　اس کشت میں پڑی یہ ہمارے نمو کی طرح

ب

کل کچھ صبا ہوئی تھی گل افشاں قفس میں بھی ۸۳۸ وہ بے کلی تو جان کو بارے نہیں ہے اب
مسکن جہاں تھا دل زدہ مسکیں کا ہم تو واں گل دیر تیر میرؔ! پکارے نہیں ہے اب

۸۳۹

بجلی اک تجلّی آئی تھی آسماں سے
آنکھیں لگا رہے ہیں اہلِ نظر اُدھر سب

۸۴۰

شیون میں شب کے ٹوٹی زنجیر میرؔ صاحب اب کیا مرے جنوں کی تدبیر میرؔ صاحب
تم کس خیال میں ہو تصویر سے جو چُپ ہو کرتے ہیں لوگ کیا کیا تقریر میرؔ صاحب

۸۴۱

پھرتی ہے اڑی خاک بھی عشاق کسو کی سر مار کے کرتا ہے پہاڑوں میں بسر آب
کس شکل سے اک رنگ پہ رہنا ہو جہاں کا رہتی ہیں کوئی صورتیں یہ نقش ہیں بر آب
استادہ ہو دریا تو خطرناکی بہت ہے
آ اپنے کھلے بالوں سے زنجیر نہ کر آب

۸۴۲

ہولے ہے خواب ملنا اس سے شب کا
کبھو آتا ہے وہ مہ خواب میں اب

ت

۸۴۳

وادی و کہسار میں روتا ہوں ڈاڑھیں مار مار
دلبرانِ شہر نے مجھ کو ستایا ہے بہت

۸۴۴

اختر شناس کو بھی خلل ہے دماغ کا
پوچھو اگر زمیں سے کہیں آسماں کی بات

۸۵۶

سعی و طلب بہت کی مطلب کے تئیں نہ پہنچے
ناچار اب جہاں سے بیٹھے ہیں ہاتھ اُٹھا کر

۸۵۷

سحر گوشِ گل میں کہا میں نے جا کر — کھُلے بند مُرغِ چمن سے ملا کر
لگا کہنے فرصت ہے یاں یک تبسم — سو وہ بھی گریباں میں منھ کو چھپا کر

۸۵۸

ہے کشیدہ جیسے تیغ آفتاب
میان میں رہتی نہیں شمشیرِ یار

۸۵۹

میں اُس کی گردِ رہ کا رہا منتظر بہت
سو آنکھیں دونوں لائیں مری اک غبار اور

۸۶۰

تن راکھ سے ملا سب آنکھیں دیے سی جلتی
ٹھہری نظر نہ جوگی میر اس فتیلہ مُو پر

ز

۸۶۱

مدت سے مثلِ شب سے مرا تیرہ روزگار — آتا نہیں وہ غیرتِ ماہ اس طرف ہنوز
پتھرا گئیں ہیں آنکھیں مری نقشِ پا کے طور — پڑتی نہیں ہے یار کی راہ اس طرف ہنوز
برسوں سے میر ماتمِ مجنوں ہے دشت میں
روتا ہے آگے ابرِ سیاہ اس طرف ہنوز

س

۸۶۲

گل و گلزار سے کیا قیدیوں کو — ہمیں داغِ دل و کنجِ قفس بس

آخر کو اس کی راہ میں ہم آپ گم ہوئے ۔ مدت میں پائی یار کی یہ جستجو کی طرح
کیا لوگ یونہی آتش سوزاں میں جا پڑے
کچھ ہو گی جلتی آگ میں اُس تندخو کی طرح

د

۸۵۲

گرفت دل سے ناچاری ہے یعنی ۔ رہا ہوں بیٹھ میں بھی کرکے گھر بند
چمن میں کیونکہ ہم پر بستہ جاویں ۔ بلند از بس کہ ہے دیوار و در بند
ہوئیں رونے کی مانع میری پلکیں ۔ بندھا خاشاک سے سیلاب پر بند
بجا رہتا تھا چہرہ جس سے شواب
گریباں میں ہے وہ دستِ ہنر بند

۸۵۳

ہزار فاختہ گردن میں طوق پہنے پھرے
اُسے خیال نہیں کچھ وہ سرو ہے آزاد

۸۵۴

کب مری سب کو سحر ہے ایک بدحالی کے بیچ ۔ جانتا ہوں صبح ہے ہوتا ہوں جب میں سرد سرد
کارواں در کارواں یاں سے چلے جاتے ہیں لوگ ۔ ہر طرف اس خاکداں میں دیکھتے ہیں گرد گرد
دفتر اعمال میرا بھول جاویں میر کاش
ہے قیامت اس جریدے کو جو دیکھیں فرد فرد

ر

۸۵۵

جس جائے سراپا میں نظر جاتی ہے اُس کے ۔ آتا ہے مرے جی میں یہیں عمر بسر کر
پڑتے نگہ اس شوخ کی ہوتا ہے وہ احوال ۔ رہ جاوے ہے جیسے کہ کوئی بجلی سے ڈر کر

وجد میں رکھتا ہے اہل فہم کو　　میرے شعر و شاعری کا استماع

دل جگر خوں ہو کے رخصت ہو گئے
حسرت آلودہ ہے کیا اشکِ وداع

غ

۸۶۸

دو حرف زیر لب کہے پھر ہو گیا خموش
یعنی کہ بات کرنے کا کس کو رہا دماغ

ف

۸۶۹

حیرت حسن یار سے چپ ہیں
سب سے حرف و کلام ہے موقوف

ق

۸۷۰

افسوس ایسے کوچے سے تم آشنا نہیں
کیا دردناک نے بھی کوئی ہے نوائے شوق

گ

۸۷۱

برق ابرِ بہار نے بھی لیے
اب دلِ بے قرار کے سے رنگ

کسو محبوب کے ہو گور پر گُل ہماری خاک کو ہے خار و خس بس

چمن کے غم میں سینہ داغ ہے میرؔ
بہت نکلی ہماری بھی ہوس بس

۸۶۳

اب سے جا کر کے پھر نہ آئے ہم
بس ہمیں تو یہی سفر ہے بس

۸۶۴

امیروں تک رسائی ہو چکی بس مری بخت آزمائی ہو چکی بس
بہار اب کے بھی جو گذری قفس میں تو پھر اپنی رہائی ہو چکی بس

برابر خاک کے تو کر دِکھایا
فلک بس، بے ادائی ہو چکی بس

ش

۸۶۵

پاؤں پڑتا ہے کہیں آنکھیں کہیں اس کی مستی دیکھ کر جاتا ہے ہوش
مر گیا اس ماہ بن میں کیا عجب چاندنی سے ہو جو میرا قبر پوش

۸۶۶

فکر میں مرگ کے ہوں سر در پیش ہے عجب طور کا سفر در پیش
مستی بھی اہل ہوش کی ہے جنھیں آوے ہے عالم دگر در پیش

کیا پتنگے کو شمع روئے میرؔ
اس کی شب کو بھی ہے سحر در پیش

ع

۸۶۷

ہے مری ہر غزل پر اجتماع خانقہ میں کرتے ہیں صوفی سماع

۸۷۸

یاں آبھی آپ آ کر گم آپ میں ہوئے ہو　　پیدا نہیں کہ کس کی کرتے ہو جستجو، تم
چاہیں تو تم کو چاہیں، دیکھیں تو تم کو دیکھیں　　خواہش دلوں کی تم ہو آنکھوں کی آرزو تم

ن

۸۷۹

ہم بھی اس شہر میں ان لوگوں سے ہیں خانہ خراب
میرؔ گھر بار جنھوں کے رہِ سیلاب میں ہیں

۸۸۰

آگ برسی تیرہ عالم ہو گیا جادو سے پُر　　اُس کی چشمِ پُر فسوں کے سامنے افسوں کہاں
کھا گیا اندوہ مجھ کو دوستانِ رفتہ کا　　ڈھونڈتا ہے جی بہت پر اب انھیں پاؤں کہاں

۸۸۱

جمع ہوتے نہیں حواس کہیں　　جائیں یاں سے جو ہم اداس کہیں
باؤ خوشبو ہی آئی ہے واں سے　　کوئی چھپتی ہے گل کی باس کہیں
اس جنوں میں کہیں ہے سر پر خاک　　ٹکڑے ہو کر گرا لباس کہیں
سب جگہ لوگ حق و ناحق، پر　　نہ ملا حیف حق شناس کہیں
عرش تک تو خیال پہنچے میرؔ
وہم پھرتے کہیں قیاس کہیں

۸۸۲

بے دماغی، بے قراری، بے کسی، بے طاقتی
کیا جیے وہ جس کے جی کو روگ یہ اکثر رہیں

۸۸۳

ہائے سبک ہونا یہ میرا فرطِ شوق سے مجلس میں
وہ تو نہیں سنتا دل دے کر میں ہی باتیں بناتا ہوں

ل

۸۷۲

اب کی ہزار رنگ گلستاں میں آئے گُل — پر اُس بغیر اپنے تو جی کو نہ بھائے گُل
چلیے بغیر مے کے گلابی کسو طرف — دامانِ دل کو کھینچے ہے ساقی ہوائے گُل

تھا وصف اُن لبوں کا زبانِ قلم پہ میر
یا منھ میں عندلیب کے تھے برگ ہائے گل

۸۷۳

نہ ٹک واشد ہوئی جب سے لگا دل — الٰہی غنچہ ہے پژمردہ یا دل
اٹھایا داغ لالہ نے چمن سے — کروں کیا دیکھتے ہی جل گیا دل

ہمارا خاص مشربِ عشق، اس میں
پیمبر دل ہے، قبلہ دل، خدا دل

م

۸۷۴

اپنے خیال ہی میں گذرتی ہے اپنی عمر — پر کچھ نہ پوچھو سمجھے نہیں جاتے ہم سے ہم
ہم طرفیں رکھے ہے ایک سخن چار چار میر — کیا کیا کہا کریں ہیں زبانِ قلم سے ہم

۸۷۵

گئے عشق کی راہ سر پر قدم — بلا پر چلے آئے ہر ہر قدم
عجب راہ پُر خوف و مشکل گذر — اٹھایا گیا ہم سے مر مر قدم

۸۷۶

اس معنی کے ادراک سے حیرت ہی ہے حاصل
آئینہ نمط صورتِ دیوار رہو تم

۸۷۷

اب سیل سیل آنسو آتے ہیں چشمِ تر سے
دیوار و در سے کہدو بے اختیار ہیں ہم

۸۳۹

ایک بگولا ساتھ مجھے بھی تربتِ قیس پہ لے لایا
کتنے غزال نظر واں آئے تھے مشغولِ زیارت میں

۸۴۰

تری پلکیں چبھتی نظر میں بھی ہیں یہ کانٹے کھٹکتے جگر میں بھی ہیں
رہے پھرتے دریا میں گرداب سے وطن میں بھی ہیں ہم سفر میں بھی ہیں
کہاں سے کہ مجنوں بھی ہم سا ہی تھا غلط کے شوائب نظر میں بھی ہیں
جھمک سطحِ رخ کی سی اس کی کہاں صفا و ضیا تو گہر میں بھی ہیں
دل و دلّی دونوں اگرہیں خراب
یہ کچھ لطف اُس اُجڑے گھر میں بھی ہیں

۸۴۱

دل کے اُلجھاؤ کو کیا تجھ سے کہوں اے ناصح تو کسو زلف کے پھندے میں گرفتار نہیں
اس کے کاکل کی پہیلی کہو تم بوجھے میر کیا ہے زنجیر نہیں، دام نہیں مار نہیں

۸۴۱

نہ کر شوق کشتوں سے جانے کی باتیں
نہیں آتیں کیا تجھ کو آنے کی باتیں

۸۴۲

کہتے ہیں بہار آئی گل پھول نکلتے ہیں
ہم کنج قفس میں ہیں دل سینوں میں جلتے ہیں

۸۴۳

چمکنا برق کا کرتا ہے کارِ تیغ ہجراں میں برسنا مینھ کا داخل ہے اُس بِن تیر باراں میں
جو دیکھو تو نہیں یہ حال اپنا حسن سے خالی دمک الماس کی ہے ہماری چشم حیراں میں
خیالِ یار میں آگے ہے یک ماہ پارہ یاں ہر دم اگر ہجراں میں زندانی ہوں پر ہوں یوسفستاں میں
جہاں سے دیکھیے اک شعرِ شور انگیز نکلے ہے
قیامت کا سا ہنگامہ ہے ہر جا میرے دیواں میں

۸۳۴

ہمارے حرف پریشاں ہی لطف رکھتے ہیں — جنوں ہے بحث جو وحشت میں عاقلانہ کریں
صفائے دل جو ہوئی ٹک تو دیکھیں ہیں کیا کیا — ہم ایسے آئینے کو اپنے کیوں جِلا نہ کریں
وبال میں نہ گرفتار ہوں کہیں مہ و مہر
خدا کرے ترے رُخ سے مقابلہ نہ کریں

۸۳۵

عشق کی دیوانگی لائی ہمیں جنگل کی اُور
ورنہ ہم پھرتے بگولے سے نہ خاک و باد میں

۸۳۶

جبہے سے سینے تک ہیں کیا کیا خراشِ ناخن — گو یا کہ ہم نے منہ پر تلواریں کھالیاں ہیں
جب لگ گئے جھمکنے رخسارِ یار دونوں — تب مہر و مہ نے اپنی آنکھیں چھپالیاں ہیں
صبحِ چمن کا جلوہ ہندی بتوں میں دیکھا — صندل بھری جبیں ہیں ہونٹھوں کی لالیاں ہیں
ان گل رخوں کی قامت لہکے ہے یوں ہوا میں — جس رنگ سے لچکتی پھولوں کی ڈالیاں ہیں
اُس آفتاب بن یاں اندھیر ہو رہا ہے
دن بھی سیاہ اپنے جوں راتیں کالیاں ہیں

۸۳۷

رفتگاں میں جہاں کے ہم بھی ہیں — ساتھ اس کارواں کے ہم بھی ہیں
شمع ہی سر نہ دے گئی برباد — کُشتہ اپنی زباں کے ہم بھی ہیں
جس چمن زار کا ہے تو گلِ تر — بلبل اس گلستاں کے ہم بھی ہیں
بوسہ مت دے کسو کے در پہ نسیم — خاک اس آستاں کے ہم بھی ہیں
وجہِ بیگانگی نہیں معلوم
تم جہاں کے ہو واں کے ہم بھی ہیں

۸۳۸

متاعِ حسن یوسف سی کہاں اب
تجسس کرتے ہیں ہر کارواں میں

قسمت اس بزم میں لائی کہ جہاں کا ساقی — دے ہے مے سب کو ہمیں زہر پلاتا ہے میاں
جھگڑا اس حادثے کا کوہِ گراں سنگ کو بھی — جوں پرِ کاہ اڑائے لیے جاتا ہے میاں

کیا پری خواں ہے جو راتوں کو جگا دے ہے میرؔ
شام سے دل و جگر و جان جلاتا ہے میاں

۸۵۱

جائے ہے جی نجات کے غم میں — ایسی جنّت گئی جہنّم میں
پر کے تھی بے کلی قفس میں بہت — دیکھیے اب کے گُل کے موسم میں

۸۵۲

جس کا خوباں خیال لیتے ہیں — دل، کلیجا نکال لیتے ہیں
کیا نظر گاہ ہے کہ شرم سے گل — سر گریباں میں ڈال لیتے ہیں

۸۵۳

دور اس سے جی چکے ہیں ہم اس روزگار میں — دن آج کا بھی سانجھ ہوا انتظار میں
بوسہ لبوں کا مانگتے ہی تم بگڑ گئے — بہتیری باتیں ہوتی ہیں اخلاص و پیار میں

کس کس ادا سے ریختے میں نے کہے ولیک
سمجھا نہ کوئی میری زباں اس دیار میں

۸۵۴

گھبرا کے یوں لگے ہے سینے میں دل تڑپنے
جیسے اسیرِ تازہ بے تاب ہو قفس میں

۸۵۵

مرنا ہے خاک ہونا، ہو خاک اڑتے پھرنا — اس راہ میں ابھی تو درپیش مرحلے ہیں
کس دن چمن میں یا رب ہوگی صبا گل افشاں — کتنے شکستہ پر ہم دیوار کے تلے ہیں
پست و بلند دیکھیں کیا میرؔ پیش آئے — اس دشت سے ہم اب تو سیلاب سے چلے ہیں

۸۵۶

بگولے کی روش وحشت زدہ ہم — لیے ہے برچیدہ دامن اس سفر میں
سماں یاں سانجھ کا سا ہو نہ جاتا — اثر ہوتا اگر آہِ سحر میں

۸۴۴

تھا شوق مجھے طالبِ دیدار ہوا میں سو آئینہ سا صورتِ دیدار ہوا میں
جب دور گیا قافلہ تب چشم ہوئی باز کیا پوچھتے ہو دیر خبردار ہوا میں

۸۴۵

عشق وہ خانماں خراب ہے میاں جس سے دل آگ و چشم آب ہے میاں
زلف بل کھا رہی ہے گو اس کی دل کو اپنے تو پیچ و تاب ہے میاں
چاہیے وہ کہے سو لکھ رکھیں
ہر سخن میرؔ کا کتاب ہے میاں

۸۴۶

ہوا ہوں فرطِ اذیت سے میں تو سن اے میرؔ
تمیزِ رنج و خیالِ نشاط مجھ کو نہیں

۸۴۷

جوشِ غم اٹھنے سے اک آندھی چلی آتی ہے میاں
خاک سی منہ پر مرے اس وقت اُڑ جاتی ہے میاں
آگ غیرت سے قفس کو دوں ہوں چاروں اور سے
ایک دو گل برگ جب بادِ سحر لاتی ہے میاں

۸۴۸

ہم بھی تو فصلِ گل میں چل ٹک تو پاس بیٹھیں
سو جوڑ جوڑ کیسی کلیاں نکلتیاں ہیں

۸۴۹

کنواں دیکھا نہ کوئی غار میں نے شوق کے مارے
بعینہ راہ اندھا سا چلا اُس کی تمنا میں

۸۵۰

شہروں، ملکوں میں جو یہ میرؔ کہاتا ہے میاں دیدنی ہے پہ بہت کم نظر آتا ہے میاں
عالم آئینہ ہے جس کا وہ مصوّر بے مثل ہائے کیا صورتیں پردے میں بناتا ہے میاں

۸۶۹

جب کبھو ادھر سے نکلے ہے تو اک حسرت کے ساتھ
دیکھے ہے خورشید اُس کے سایۂ دیوار کو

۸۷۰

دریا سی آنکھیں بہتی ہی رہتی تھیں سو کہاں
ہوتی ہے کوئی کوئی پلک اب تو تر کبھو

ہم جستجو میں اُن کی کیے دست و پا بھی گم
افسوس ہے کہ آئے نہ ہو راہ پر کبھو

۸۷۱

یہ سرا سونے کی جاگہ نہیں بیدار رہو
ہم نے کر دی ہے خبر تم کو خبردار رہو

گرچہ وہ گوہر تر ہاتھ نہیں لگتا لیک
دم میں دم جب تئیں ہے اس کے طلبگار رہو

۸۷۲

ہجراں کی سرگزشت مری گفتنی نہیں
کیا کہیے تم سے قصۂ دور و دراز کو

۸۷۳

سر کاٹ کے ڈلوا دِیے انداز تو دیکھو
پامال ہے سب خلق جہاں ناز تو دیکھو

شب آنکھ مری لگنے نہیں دیتی ہے بُلبُل
اُس مرغ کی بے تابی آواز تو دیکھو

دل ایک تڑپنے میں پرے عرش کے پایا
اس طائرِ بے بال کی پرواز تو دیکھو

سب میر کو دیتے ہیں جگہ آنکھوں پر اپنی
اس خاکِ رہِ عشق کا اعزاز تو دیکھو

۸۷۴

درپئے خوں ہیں میرے خورد و کلاں
یہ وبال کوئی اپنے سر پر لو

۸۷۵

دل کو کہتے ہیں کہ اس گنجِ رواں کا گھر ہے
اس خرابے میں کرے ہے وہ کرم کاہے کو

۸۵۷

جیو خوش یا کوئی ناخوش ہمیں کیا
ہم اپنے محو ہیں ذوق فنا میں

۸۵۸

مجھ کو دماغ وصفِ گلِ یا سمن نہیں
مَیں جوں نسیم بادِ فروشِ چمن نہیں

۸۵۹

مدت ہوئی کہ کوئی نہ آیا اُدھر سے یاں — جاتی رہے گی جان اسی رہ گزر سے یاں
پوچھے کوئی تو سینہ خراشی دکھائیے — سو تو نہیں ہے حرف و حکایت ہنر سے یاں

آگے تو اشک پانی سے آجاتے تھے کبھو
اب آگ ہی نکلنے لگی ہے جگر سے یاں

۸۶۰

مصرع کوئی کبھو موزوں کروں ہوں میں
کس خوش سلیقگی سے جگر خوں کروں ہوں میں

۸۶۱

وہ تو نہیں کہ دیکھیں اس آئینہ رو کو صبح
ہم کس امید پر شبِ غم کو سحر کریں

و

۸۶۸

کرتے ہو تم نیچی نظریں یہ بھی کوئی مروّت ہے
برسوں سے پھرتے ہیں جدا ہم آنکھ سے آنکھ ملانے دو

اب کے بہت ہے شورِ بہاراں ہم کو مت زنجیر کرو
دل کی ہوس ٹک ہم بھی نکالیں دھومیں ہم کو مچانے دو

بات بنانا مشکل سا ہے شعر سبھی یاں کہتے ہیں
فکرِ بلند سے یاروں کو ایک ایسی غزل کہہ لانے دو

۸۸۳

ایسی جان کہاں ہے ہم میں رنج نہ دینا ہاتھوں کو
ایک ہی وار میں ہو چکیے گا دوسری ضربت مت کریو

ہ

۸۸۴

بلبل ہیں گل میں کیا خفگی آگئی ہے میرؔ
آمدِ شدِ نسیمِ سحر دم بہ دم ہے کچھ

۸۸۵

یہ کائنات اپنی آنکھوں میں سب نہیں کچھ یاں اعتبار کریے جو کچھ وہی ہے ظاہر
رونے کا لمحہ لمحہ ظاہر سبب نہیں کچھ یہ حال بے سبب تو ہوتا نہیں ہے لیکن

۸۸۶

آنکھ اُس منھ پہ کس طرح کھولوں
جوں پلک جل رہی ہے میری نگاہ

۸۶۷

دامنِ صحرا میں کیا وسعت ہے جو دل میں نہیں
موند کر آنکھیں گریباں میں کبھی ٹک سر ڈال دیکھ
گرچہ اُس مہ کی جدائی میں مجھے برسوں ہوئے
لیکن اے اختر شناس اب کا ہے کیسا سال دیکھ

۸۶۸

سر ہر کہیں جھکا کہ ہے مسجود ہر جگہ واقف ہو شانِ بندگی سے قیدِ قبلہ کیا
آبِ رواں سے ہم ہوئے نابود ہر جگہ پھرتی ہے اپنے ساتھ لگی متصل فنا

۸۶۹

ویکن قیامت روانی کے ساتھ کہے میں نے اشعار ہر بحر میں
بلا سوز تھا اس کہانی کے ساتھ جلا جی بہت قصۂ میرؔ سن

۸۷۶

تعجب ہے کہ دل اس گنجِ سرگشتہ میں رہتا ہے
خرابے جس سے یہ پاتے ہیں مالامال مت پوچھو

۸۷۷

بارے دنیا میں رہو غم زدہ یا شاد رہو
ایسا کچھ کرکے چلو یاں کہ بہت یاد رہو

۸۷۸

کیا آنکھ بند کرکے مراقب ہوئے ہو تم — جاتے ہیں کیسے کیسے سمیں چشم وا کرو
موقوفِ ہرزہ گردی نہیں کچھ قلندری — زنجیرِ سر اُتار کے زنجیرِ پا کرو

۸۷۹

سر پہ عاشق کے نہ یہ روزِ سیہ لایا کرو
جی اُلجھتا ہے بہت مت بال سلجھایا کرو

۸۸۰

نہ چشم کم سے مجھ درویش کی آوارگی دیکھو
تبرک کرتے ہیں کانٹے مرے پاؤں کے چھالوں کو

۸۸۱

پایا گیا وہ گوہرِ نایاب سہل کب — نکلا ہے اُس کو ڈھونڈنے تو پہلے جان کھو
سنتے نہیں کہے جو نہ کہیے تو دم رُکے — کچھ پوچھیے نہ قصہ ہمارا ہے گومگو

۸۸۲

برسے گی برف عرصۂ محشر میں دشت دشت
گر میری سرد آہوں کا واں ہو گیا جماؤ

۸۸۳

شہر میں زیرِ درختاں کیا رہوں میں برگ بند — ہو نہ صحرا نے مری گنجائشِ اسباب ہو
لطف سے اے ابرِ رحمت ایک دو بارش اِدھر — کشتِ زردِ ناامیداں بھی تو ٹک سیراب ہو

۸۷۷

دیکھیے کیا ہو سانجھ تلک احوال ہمارا ابتر ہے
دل اپنا تو بجھا سا دِیا ہے جاں چراغِ مضطر ہے

۸۷۸

آشوب چشم چشمہ راب کوہ و صحرا پر بھی ہے
طوفان سا شہروں میں ہے اک شور دریا پر بھی ہے

۸۷۹

کیا کیا ہوئے ہیں اہلِ زباں ڈھیر خاک کے — کیا کیا مکان دیکھتے ناگاہ ڈھہ گئے
تسبیحیں ٹوٹیں، خرقے مصلے پھٹے جلے — کیا جانیے خانقاہ میں کیا میر کہہ گئے

۸۸۰

عالم خاکی بھی بسمل گاہ ہے
ہو رہے ہیں ڈھیریاں سَو سَو جنے

۸۸۱

سیر قابل ہیں تنگ پوش اب کے — کُہنیاں پھٹتے چولیاں چستے
رنگ لیتی ہے سب ہوا اس کا — اس سے باغ و بہار ہیں رستے
اک نگہ کر کے اُن نے مول لیا — بک گئے آہ، ہم بھی کیا سستے
میر جنگل پڑے ہیں آج جہاں
لوگ کیا کیا نہیں تھے کل بستے

۸۸۲

جوں آئینہ سامنے کھڑا ہوں یعنی — خوبی سے ترے چہرے کی حیرانی ہے
سب شرم جبین یار سے پانی ہے — ہر چند کہ گل شگفتہ پیشانی ہے
دوزخ میں ہوں جلتی جو رہے ہے چھاتی
دل سوختگی، عذاب روحانی ہے

۸۸۳

جی کے لگنے کی میر کچھ کہہ بھی — ہے وہی بات جس میں ہو تہہ بھی

ی

۸۷۰

تدبیرِ غمِ دل کی بستی میں نہ ٹھہرائی
جنگل میں نکل آئے کچھ واں بھی نہ بن آئی

۸۷۱

لطف کہاں وہ بات کیے پر پھول سے جھڑنے لگ جاویں
سرخ کلی بھی گل کی اگرچہ یار کے لعلِ لب سی ہے

۸۷۲

چال زمانے کی ہے نظر میں شام و سحر کس کو ہے قیام — نو وارد ہم یاں کے نہیں پر لیل و نہار کو دیکھا ہے
باؤ سے بھی گر پتّا کھڑکے چوٹ پڑے ہے ظالم کی — ہم نے دامگہوں میں اُس کے ذوقِ شکار کو دیکھا ہے

۸۷۳

ہم خاک منھ کو مل کے نہ جوں آرسی پھرے — یاں پاس قرطِ آب اگر ہے سبیل ہے
جنگل میں خضر و کعبہ کا ہونا بری طرح — دونوں کی نارسائی کے اوپر دلیل ہے
آگے جنوں سے چھانوں میں تھے سرو و گل کی ہم — سر پر ہمارے سایہ فگن اب کریل ہے
آتے نہیں نظر میں میری جو ہاتھی کے سوا
کانوں میں جو فسانۂ اصحابِ فیل ہے

۸۷۴

ہم مرثیہ دل ہی کا اکثر کہا کرتے ہیں
اب کریے تخلّص تو شائستہ ضمیری ہے

۸۷۵

حرف غلط تھے کیا ہم صفحے پہ زندگی کے
جو صاف یوں قضا نے ہم کو مٹا دیا ہے

۸۷۶

ہم چمن میں گئے تھے وا نہ ہوئے — نکہتِ گل سے آشنا نہ ہوئے
کیسا کیسا قفس سے سر مارا — موسمِ گل میں ہم رہا نہ ہوئے

۸۹۲

گوش ہر یک کا اسی کی اور ہے   کیا قیامت کا قیامت شور ہے

۸۹۳

دم بس ہو آئینۂ عالم سیاہ   ایک اگر عاشق قلندر ہو کرے

۸۹۴

وا نسیمِ صبح سے ہوتا ہے گُل   تجھ کو اے مرغِ چمن غیرت بھی ہے
جی ہی دینے کا نہیں کڑھنا فقط   اُس کے در سے جانے کی حسرت بھی ہے

۸۹۵

چلے ہم اگر تم کو اکراہ ہے   فقیروں کی اللہ اللہ ہے
چراغانِ گل سے ہے کیا روشنی   گلستاں کسو کی قدم گاہ ہے

۸۹۶

جیسے گرداب ہے گردش مری ہر چار طرف   شوق کیا جانیے مجھ کو کدھر جاتا ہے
زرد رخسار پہ کیوں اشک نہ آوے گل رنگ   آگے سے آنکھوں کے وہ باغ نظر جاتا ہے

۸۹۷

بے تابی جو دل ہر گھڑی اظہار کرے ہے   اب دیکھوں مجھے کس کا گرفتار کرے ہے
زنہار نہ جا پرورش دَورِ زماں پر   مرنے کے لیے لوگوں کو تیار کرے ہے

تصویر سے دروازے پہ ہم اس کے کھڑے ہیں
انسان کو حیرانی بھی دیوار کرے ہے

۸۹۸

محوِ زلفِ یار ہے عالم تمام   حسن کا بھی شہرہ جوشِ شام ہے
بزم میں پوچھا تو یوں انجان ہو   میؔر ان لوگوں میں کس کا نام ہے

۸۹۹

دل عجب نسخۂ تصوف ہے   ہم نہ سمجھے بڑا تاسّف ہے
مرگ کیا منزلِ مراد ہے میؔر   یہ بھی اک راہ کا توقّف ہے

حسن اے رشکِ مہ نہیں رہتا   چار دن کی ہے چاندنی یہ بھی

۸۸۴

دلیل گمرہی ہے خضر جو ملتا ہے جنگل میں
پھرے ہے آپھی بھولا کیا ہمیں رستا بتا دیوے

۸۸۵

دیکھنا ہے تو ہے بہم پردہ   ہم سے آنکھوں کو کب ملاتا ہے
اپنا اپنا ہے ذائقہ ہم کو   بوسۂ کنجِ لب ہی بھاتا ہے

۸۸۶

پامال یوں کیا کہ برابر ہیں خاک کے
کیا ظلم ہو گیا جو طلب گار ہم ہوئے

۸۸۷

تعارف کیا رہا اہل چمن سے   ہوئی اک عمر میں اپنی رہائی
فراق یار کو آسان نہ سمجھو   کہ جان و تن کی مشکل ہے جدائی

۸۸۸

کچھ زخم کھل چلے ہیں کچھ داغ کھل رہے ہیں   اب کی بہار دیکھیں کیا کیا شگوفے لاوے
ہم جس زمیں پہ آئے واں آسماں یہی تھا   یارب جو کوئی جاوے تو کس طرف کو جاوے

۸۸۹

خدا جانے کہ دل کس خانہ آباداں کو دے بیٹھے
کھڑے تھے میر صاحب گھر کے دروازے پہ حیراں سے

۸۹۰

کم ہے کیا لذّتِ ہم آغوشی
سب مزے میر در کنار رہے

۸۹۱

غم مرگ سے دل جگر ریش ہے   عجب مرحلہ ہم کو در پیش ہے
دِلا اس کے ظاہر پہ مت جائیو   وہ خوش رُو تو ہے پر بد اندیش ہے

۹۰۹

دیوانگی ہے میری اب کی کوئی تماشا
رہتے ہیں گھیرے مجھ کو کیا اپنے کیا پرائے

۹۱۰

اپنی عُزلت رکھتی ہے عالم ہی اور
یہ سیہ رُو شہرۂ آفاق ہے
رنگ میں اس کے جھمک ہے برق کی
سطح کیا رخسار کا برّاق ہے

۹۱۱

ماہ و خورشید و ابر و باد سبھی اس کی خاطر ہوئے ہیں سودائی
چرخ زن اس کے واسطے ہے مدام ہو گیا دن تمام رات آئی

۹۱۲

کیا جو اُڑتی سی سنی آئے ہیں گُل ہم اسیروں کے تو بال و پر گئے
مجلسوں کی مجلسیں برہم ہوئیں لوگ وے پل مارتے کیدھر گئے
تھے لبِ جُو پر جو گرمِ دیدِ یار
سبزے کے سے رنگ فرگاں تر گئے

۹۰۰

اُس کا غضب سے نامہ نہ لکھنا تو سہل ہے — لوگوں کے پوچھنے کا کوئی کیا جواب دے
مژگان تر کو یار کے چہرے پہ کھول میر — اِس آب خستہ سبزے کو ٹک آفتاب دے

۹۰۱

سخن کرنے میں نستعلیق گوئی ہی نہیں کرتا
پڑھیں ہیں شعر کوئی ہم سو وہ بھی شد و مد سے

۹۰۲

چھاتی میں بھری آگ ہے کیا جس سے شب و روز — چنگاریاں گرتی ہیں مری پلکوں کی صف سے

۹۰۳

برنگِ طائرِ نو پر ہوئے آوارہ، ہم اُٹھ کر — کہ پھر پائی نہ ہم نے راہ اپنے آشیانے کی

۹۰۴

بگولا کوئی اٹھتا ہے کہ آندھی کوئی آتی ہے — نشانِ یادگاری ہے ہماری خاک اُڑانے کی

۹۰۵

کریہہ الشکل ہئیت آن کر ایسی نہیں یکھی — کہ صورت آسماں کی دیکھ کر میں نے زمیں یکھی

۹۰۶

تا چند یہ خمیازہ کشی تنگ ہوں یارب — آغوش مری ایک شب اُس شوخ سے بھر جائے
جاتا ہے جدھر منزلِ مقصود نہیں وہ — آوارہ جو ہو عشق کا بے چارہ کدھر جائے

بے طاقتی دل سے مری جان ہے لب پر
تم ٹھہرو کوئی دم تو مرا جی بھی ٹھہر جائے

۹۰۷

دل سوختہ ہوں مجھ کو تکلیفِ حرف مت کر
اک آگ کی لپٹ سی نکلے ہے ہر سخن سے

۹۰۸

اس کے بدن میں ہر جا دلکش ہے یوں و لیکن
یا سطح رخ جگہ ہے یا کنج لب جگہ ہے

حقیقت نہ میر اپنی سمجھی گئی
شب و روز ہم نے تامّل کیا

۹۱۷

لوگ جب ذکرِ یار کرتے ہیں دیکھ رہتا ہوں دیر منہ سب کا
مست رہتا ہوں جب سے ہوش آیا مَیں بھی عاشق ہوں اپنے مشرب کا

زلف سا پیچ دار ہے ہر شعر
ہے سخن میر کا عجب ڈھب کا

۹۱۸

کیا نور کا بُکا ہے چہرہ کہ شب مَہ میں منہ کھولے جو سو رہتا تو ماہ چھُپا جاتا

۹۱۹

کیا شوق کی باتوں کی تحریر ہوئی مشکل
تھے جمع قلم کاغذ پر کچھ نہ لکھا جاتا

۹۲۰

جستجو میں یہ تعب کھینچے کہ آخر ہو گئے ہم تو کھوئے بھی گئے لیکن نہ تو پایا گیا
جیسے پرچھائیں دکھائی دے کے ہو جاتی ہے محو میر بھی اس کام جاں کا وہیں تھا سایا گیا

۹۲۰

اُس آہوئے رمیدہ کی شوخی کہیں سو کیا دکھلائی دے گیا تو چھلاوا سا چھل گیا
تیور بدلنے سے تو نہیں اس کے بے حواس اندیشہ یہ ہے طَور ہی اُس کا بدل گیا

۹۲۱

ہم سے تو جز مرگ کچھ تدبیر بن آتی نہیں تم کہو کیا تم نے دردِ عشق کا درماں کیا
لکھنؤ دلّی سے آیا یاں بھی رہتا ہے اُداس میر کو سرگشتگی نے بے دل و حیراں کیا

۹۲۲

سحر جلوہ کیوں کر کرے کل ہو کیا یہ اندیشہ ہر رات ہر دم رہا

۹۲۳

جاں سوز آہ و نالہ سمجھتا نہیں ہوں مَیں یک شعلہ میرے دل سے اٹھا تھا جلا گیا

دیوان چہارم

۹۱۳

کرتا ہوں اللہ اللہ درویش ہوں سدا کا　　سرمایۂ توکّل یاں نام ہے خدا کا
آلودہ خوں سے ناخن ہیں شیر کے سے ہر سو　　جنگل میں چل بنے تو پھولا ہے زور ڈھاکا

۹۱۴

سب روم روم تن میں زردیٔ غم بھری ہے　　خاکِ جسد ہے میری کس کانِ زر کا خاکا
گل پھول فصلِ گل میں صد رنگ ہیں شگفتہ　　ہیں دل زدہ ہوں اب کی رنگینیٔ ہوا کا

۹۱۵

ان ہونٹھوں کا حریف ہو ظلمات میں گیا　　پردے میں روسیاہ ہے آبِ حیات کا
عالم کِسو حکیم کا باندھا طلسم ہے　　کچھ ہو تو اعتبار بھی ہو کائنات کا

۹۱۶

تجاہُل، تغافُل، تساہُل کیا　　ہوا کام مشکل توکّل کیا
نہیں تاب لاتا دلِ زار اب　　بہت ہم نے صبر و تحمّل کیا
زمینِ غزل مِلک سی ہو گئی　　یہ قطعہ تصرّف میں باکل کیا
نہ سوزِ دروں فصلِ گل میں چھپا　　سرو سینہ سے داغ نے گُل کیا

۹۳۱

ان آنکھوں کو نرگس لکھا تھا کہیں مرے ہاتھ دونوں قلم کر گیا
شب اک شعلہ دل سے ہوا تھا بلند تنِ زار میرا بھسم کر گیا
مرے مزرعِ زرد پر شکر ہے
کل اک ابر آیا کرم کر گیا

۹۳۲

ہنگامے سے جہاں میں ہم نے جنوں کیا ہے ہم جس طرف سے نکلے ساتھ اژدہام نکلا

ب

کیا گئی جان و دل سے تاب شتاب ۹۳۳ آنسو آتے ہیں اب شتاب شتاب

۹۳۴

لیتی ہے ہوا رنگ سراپا سے تمہارے معلوم نہیں ہوتے ہو گلزار میں صاحب
ہے چار طرف شور مری بے خبری کا کیا کیا خبریں آتی ہیں اخبار میں صاحب

۹۳۵

وہ دماغ ضعیف بھی نہ رہا بے دماغی ہی بیشتر ہے اب
کیا کہیں حالِ خاطر آشفتہ دل خدا جانیے کدھر ہے اب
عُزلتی میر جوں صبا اُس بن
خاک بر سر ہے در بدر ہے اب

۹۳۶

دور تک رسوا ہوا ہوں شہروں شہروں ملک ملک میرے شعر و شاعری کا تذکرہ گھر گھر ہے اب

ت

۹۳۷

رات کو جس میں چین سے سوویں سو تو اس کی جدائی میں
شمع نمط جلتے رہتے ہیں اور ہمیں کھاتی ہے رات

۹۳۸

بعد مرگ آنکھیں کھلی رہنے سے یہ جانا گیا
دیکھنے کی اس کے میرے جی میں تھی حسرت بہت

۹۲۴

یاں حادثے کی باؤ سے ہر اک شجر حجر
کیسا ہی پائیدار تھا آخر اُکھڑ گیا

۹۲۵

کون لیتا تھا نام مجنوں کا   جب کہ عہد جنوں ہمارا تھا
آستاں کی کسو کے خاک ہوا   آسماں کا بھی کیا ستارا تھا
موسم گل میں ہم نہ چھوٹے حیف
گشت تھا دید تھا نظارا تھا

۹۲۶

روندکے جور سے اُن نے ہم کو پاؤں اپنے حنائی کیے
خون ہمارا بسمل گہ میں کن رنگوں پامال کیا

۹۲۷

رسم اٹھ گئی دنیا سے اک بار مروّت کی   کیا لوگ زمیں پر ہیں کیسا یہ سماں آیا
بلبل بھی تو نالاں تھی پر سارے گلستاں میں   اک آگ سی پھنکی ہیں جب سرگرم فغاں آیا
طائر کی بھی رہتی ہے پھر جان چمن ہی میں
گل آئے جہاں وہ بھی جوں آب رواں آیا

۹۲۸

آنکھیں لگی رہتی ہیں اکثر چاکِ قفس سے اسیروں کی
جھونکا بادِ بہاری کا گل برگ کوئی یاں لاوے گا

۹۲۹

خاک ملا منھ ہوں آنکھوں میں چاکِ گریباں تا دامن
صورت حال اب اپنی اس کے خاطر خواہ بناؤں گا

۹۳۰

رہائی ہے اس صید افگن سے مشکل   گیا سانجھ تو صبح پھر آن مارا
نگاہ آتشیں نالۂ شب اپنے دل کو   اس انداز سے جیسے اک بان مارا

۹۴۶

جس طرح میں دکھائی دیا اُس سے لگ پڑے ہم کُشت وخوں کے ہیں گے سزاوار ہر طرح

د

۹۴۷

وحشی اب گرد باد سے ہم ہیں عمر افسوس کیا گئی برباد

ر

۹۴۸

اُس کامِ جاں کے جلووں کا میں ہی نہیں ہلاک آفت عجب طرح کی ہے سارے جہان پر

۹۴۹

لکھا جو گیا اس کو کیا نقل کریے سخن خونچکاں تھے زبانِ قلم پر

۹۵۰

تجھ کو ہے سوگند خدا کی میری اور نگاہ نہ کر چشم سیاہ ملا کر یونہی مجھ کو خانہ سیاہ نہ کر

۹۵۱

فلک نے باغ سے جوں غنچۂ نرگس نکالا ہے کہیں کیا جانو کیا دیکھوں گا چشمِ بستہ کو وا کر

۹۵۲

سو رہا بال منھ پہ کھول کے وہ ہم شب اپنی سحر کریں کیونکر

ز

۹۵۳

گردش سے اس کی خاک برابر ہوئی ہے خلق استادہ روئے خاک پہ ہے آسماں ہنوز
مدت ہوئی کہ خوار ہو گلیوں میں مر گئے قصہ ہمارے عشق کا ہے داستاں ہنوز

۹۵۴

دیوانگی کی ہے وہی زور آوری ہنوز ہر دم نئی ہے میری گریباں دری ہنوز
سر سے گیا ہے سایۂ لطف اس کا دیر سے آنکھوں ہی میں پھرے ہے مری وہ پری ہنوز
مبہوت ہو گیا ہے جہاں اک نظر کیے جاتی نہیں ان آنکھوں سے جادو گری ہنوز
ابرِ کرم نے سعی بہت کی پہ کیا حصول ہوتی نہیں ہماری زراعت ہری ہنوز

۹۳۹

دل کے دل ہی میں رہ گئے ارمان　　کم رہا موسم شباب بہت

۹۴۰

تھی بحر کی سی لہر کہ آئی چلی گئی
پہنچی ہے اس سرے تئیں طبع رواں کی بات

ح

۹۴۱

شیشہ، صراحی، ساغر و مینا سب کل تک بھی حاضر تھے
کوئے بادہ فروشاں میں یہ میری حرمت کیا ہے آج

چ

۹۴۲

آگے تو رسم دوستی کی تھی جہاں کے بیچ　　اب کیسے لوگ آ گئے زمیں آسماں کے بیچ
تحریک چلنے کی ہے جو دیکھو نگاہ کر　　ہئیت کو اپنی موجوں میں آب رواں کے بیچ

۹۴۳

دوش و آغوش و گریباں دامنِ گلچیں ہوئے　　گل فشانی کر رہی ہے چشم خوں باری کے بیچ
ایک کو اندیشۂ کار ایک کو ہے فکر یار　　لگ رہے ہیں لوگ سب چلنے کی تیاری کے بیچ
روتے ہی گزری ہمیں ہے شب نشینی باغ کی
اوس سی پڑتی رہی ہے رات بھر کیاری کے بیچ

۹۴۴

ستھراؤ کر دیا ہے تمنائے وصل نے　　کیا کیا عزیز مر گئے اس آرزو کے بیچ
ہم ہیں قلندر آکر اگر دل سے دم بھریں　　عالم کا آئینہ ہے سیہ ایک ہو کے بیچ

ح

۹۴۵

دل کو جو خوب دیکھا تو ہُو کا مکان ہے　　ہے اس مکاں میں ساری وہی لامکاں کی طرح
کل دیکھ آفتاب کو رویا ہوں دیر تک　　غصے میں ایسی ہی تھی مرے مہرباں کی طرح

ک

۹۶۱

رہا پھول سا ہار نزہت سے اب تک نہ ایسا کھلا گل نزاکت سے اب تک

لبالب ہے وہ حسن معنی سے سارا نہ دیکھی کوئی ایسی صورت سے اب تک

گ

۹۶۲

شہر میں گھر خراب ہے اپنا آتے ہیں یاں اب اس نشاں سے لوگ

ایک گردش میں ہیں برابر خاک کیا جھگڑتے ہیں آسماں سے لوگ

ل

۹۶۳

دل لوٹنے پہ مرغ چمن کے نہ کی نظر بے درد گل فروش سبد بھر کے لائے گل

حیف آفتاب میں پسِ دیوار باغ ہیں جوں سایہ واکشیدہ ہوئے ہم نہ ہائے گل

۹۶۴

حال فکر سخن میں کچھ نہ رہا شعر میرا شعار ہے تا حال

م

۹۶۵

کم پائی اس قدر ہے منزل ہے دور اتنی طے کس طرح کرو گے یارو یہ مرحلے تم

۹۶۶

میں کیا دیکھو ادھر تک تم تو میں بھی جان دوں

ہنس کے بولے یہ تیری باتیں ہیں پر دیکھیں گے ہم

راہ تکتے تکتے اپنی آنکھیں بھی پتھرا چلیں

یہ نہ جاتا تھا کہ سختی اس قدر دیکھیں گے ہم

۹۶۷

سوز دروں نے ہم کو پردے میں مار رکھا

جوں شمع آپ ہی کو کھا کھا کے رہ گئے ہم

۹۵۵

بے قراری میں ساری عمر گئی — دل کو آتا نہیں قرار ہنوز
خاک مجنوں جہاں ہے صحرا میں — واں سے اٹھتا ہے اک غبار ہنوز
عشق کرتے ہوئے تھے بے خود میر
اپنا ان کو ہے انتظار ہنوز

۹۵۶

خاک ہو کر اڑے بس ہیں یار ہنوز — دل کا بیٹھا نہیں غبار ہنوز
نہ جگر میں ہے خوں، نہ دل میں حواس — درپئے خوں ہے روزگار ہنوز

ش

۹۵۷

نکلے پردے سے روئے یار اے کاش — منہ کرے ٹک ادھر بہار اے کاش
کچھ وسیلہ نہیں جو اس سے ملوں — شعر ہو یار کا شعار اے کاش
کہیں اس بحرِ حسن سے بھر جائے
موج ساں میری بھی کنار اے کاش

ط

۹۵۸

عشق کے دو گواہ لا یعنی
زردیِ رنگ و چشم تر ہے شرط

ف

۹۵۹

نظر کیا کروں اس کے گھر کی طرف — نگاہیں ہیں میری نظر کی طرف
بڑی دھوم سے ابر آئے گئے — نہ کوئی ہوا چشم تر کی طرف

ق

۹۶۰

نزدیک عاشقوں کے زمیں ہے قرارِ عشق — اور آسماں غبار سرِ رہ گزار عشق

۹۸۶

کیا کیا جھک گئے ہیں رخسارِ یار دونوں ۔ رہ رہ گئے مہ و خور آئینہ دار دونوں

تصویرِ قیس و لیلیٰ ٹک ہاتھ لے کے دیکھو ۔ کیسے ہیں عاشقی کے حیرانِ کار دونوں

دستِ جنوں نے اب کے کپڑوں کی دھجیاں کیں

داماں و جیب میرے ہیں تار تار دونوں

و

۹۸۷

دیتی ہے طول بلبل کیا سوزشِ فغاں کو ۔ اک نالہ حوصلے سے بس ہے وداعِ جاں کو

نالاں تو ہیں مجھی سے پر وہ اثر کہاں ہے ۔ گو طائرِ گلستاں سیکھے مری زباں کو

کیا جانیے کہ کیا کچھ پردے سے ہووے ظاہر ۔ رہتے ہیں دیکھتے ہم ہر صبح آسماں کو

میری نگاہ میں تو معدوم سب ہیں وے ہی

موجود بھی نہ جانا اس راہ سے جہاں کو

۹۸۸

آلودہ خونِ دل سے صد حرف منہ پر آئے ۔ مرغِ چمن نہ سمجھا اندازِ گفتگو کو

۹۸۹

مصروف احتیاط رہا کرتے رات دن ۔ دینے میں دل کے اپنا جو کچھ اختیار ہو

دل میں کدر سے آندھی سی اٹھنے لگی ہے اب ۔ نکلے گلے کی راہ تو رفعِ غبار ہو

اے آہوانِ کعبہ نہ اینڈو حرم کے گرد

کھاؤ کسو کی تیغ کسو کے شکار ہو

۹۹۰

دل اس کے منہ سے لگ کے پریشاں ہوا نہ تو ۔ اس رو کا مثلِ آئینہ حیراں ہوا نہ تو

ہوتا ہے میر روئے سخن آدمی کی اور ۔ افسوس اے ستم زدہ انساں ہوا نہ تو

۹۹۱

کھول آنکھیں صبح سے آگے کہ شیر اللہ کے

دیکھتے رہتے ہیں غافل وقت گرگ و میش کو

۹۷۹

جی مارا بے تابیٔ دل نے اب کچھ اچھا ڈھنگ نہیں
رنگ طپیدن کی شوخی سے منھ پر میرے رنگ نہیں

۹۸۰

کچھ تفاوت نہیں ہستی و عدم میں ہم بھی   اُٹھ کے اب قافلۂ رفتہ کو جا لیتے ہیں
نازکی ہائے رے طالع کی نکوئی سے کبھو   پھول سا ہاتھوں میں ہم اس کو اٹھا لیتے ہیں
چاک سینے کے ہمارے نہیں سینے اچھے
انھیں زخموں سے دل و جان ہوا لیتے ہیں

۹۸۱

بخود جستجو میں نہ اُس کی رہے   ہم آپ بھی ہیں گُم کس کو پیدا کریں
کہیں دل کی مرغانِ گلشن سے کیا   یہ بے حوصلہ ہم کو رسوا کریں

۹۸۲

صورتوں سے خاکداں یہ عالمِ تصویر ہے   بولیں کیا اہلِ نظر خاموش ہیں حیرت سے یاں
فہم حرفوں کے تنافر کا بھی یاروں کو نہیں   اس پہ رکھتے ہیں تنفّر سب مری صحبت سے یاں

۹۸۳

داغِ فراق سے کیا پوچھو ہو آگ لگائی سینے میں   چھاتی سے وہ مہ نہ لگا ٹک آ کر اس کم جینے میں
چاک ہوا دل ٹکڑے ہے جگر ہے لوہو روتے آنکھوں سے   عشق نے کیا کیا ظلم دکھائے دس دن کے اس جینے میں
گوندھ کے گویا پتّی گل کی وہ ترکیب بنائی ہے
رنگ بدن کا تب دیکھو جب چولی بھیگے پسینے میں

۹۸۴

ہائے لطافت جسم کی اس کے مر ہی گیا ہوں پوچھو مت
جب سے تنِ نازک وہ دیکھا تب سے مجھ میں جان نہیں

۹۸۵

شعر ہمارے عالم کے ہر چار طرف کیا دوڑے ہیں   کس وادی آبادی میں یہ حرف و سخن مشہور نہیں
ہم دیکھیں تو دیکھیں اسے پھر پردہ بہتر ہے یعنی   اور کریں نظارہ اس کا ہم کو یہ منظور نہیں

عشق نے دے کر آگ یکایک شہرِ تن کو پھونک دیا
دل تو جلا ہے دماغ جلا ہے اور جلا ہے کیا کیا کچھ

ی

۹۹۹

دیکھ ہوا کو طائرِ گلشن کس حسرت سے کہتے تھے
گل ہی چلے جاتے نہیں یاں سے چلنے کو بیٹھے ہیں ہم بھی

۱۰۰۰

یک معنی شگفتہ سو رنگ بندھ گئے ہیں — الوانِ گل ہیں ہر سو اب کے بہار سے بھی
کیا جیب و آستیں ہی سیلاب خیز ہے یاں — دریا بہا کریں ہیں میرے کنار سے بھی
راہ اس کی برسوں دیکھی آنکھیں غبار لائیں
نکلا نہ کام اپنا اس انتظار سے بھی

۱۰۰۱

خوار پھرایا گلیوں گلیوں سر مارے دیواروں سے
کیا کیا اُن نے سلوک کیے ہیں شہر کے عزت داروں سے
خستہ ہوا اپنا کیسا ہی کوئی پھر بھی گلے سے لگاتے ہیں
وحشت ایک تمہیں کو دیکھی اپنے سینہ فگاروں سے

۱۰۰۲

کچھ نہیں اور دیکھیں ہیں کیا کیا — خواب کا سا ہے یاں کا عالم بھی

۱۰۰۳

باغ میں سیر کبھو ہم بھی کیا کرتے تھے — روشِ آبِ رواں پھیلے پھرا کرتے تھے

۱۰۰۴

آنکھیں مل کر کھولیں اُن نے عالم میں آشوب اُٹھا
بال کھلے دکھلائی دیا سو ہر کوئی سودائی ہے
قصہ ہم غربت زدگان کا کہنے کے شائستہ نہیں
بے صبری کم پائی ہے پھر دُور اس سے تنہائی ہے

۹۹۲

جی رُکا رُکنے سے، برے کچھ تو — آسماں آگیا ورے کچھ تو

جینا کیا ہے جہانِ فانی کا — مرتے جلتے ہیں کچھ، مرے کچھ تو

طالع و جذب و زاری و زر و زور — عشق میں چاہیے ارے کچھ تو

سہمے سہمے نظر پڑیں ہیں میر

اُس کے اطوار سے ڈرے کچھ تو

۹۹۳

خون کے سیلاب میں ڈوبے ہوؤں کا کیا شمار — ٹک بہے وہ جدولِ شمشیر تو ستھراؤ ہو

گریۂ خونیں سے ہیں رخسار میرے لعلِ تر — دیدۂ خوں باریوں ہیں جیسے منھ پر گھاؤ ہو

۹۹۴

ایک سماں تھا وصل کا اس کے سیج پہ سوئے پھولوں کی

اب ہے زمانِ فراق، بچھونے خار و خسک کے بچھا بیٹھو

ہ

۹۹۵

وہ آرسی کے آگے پہروں ہے بے تکلف — منھ سے ہمارے اس کو آتی نہیں حیا کچھ

حرف و سخن کی اُس سے اپنی مجال کیا ہے — اُن نے کہا ہے کیا کیا میں نے اگر کہا کچھ

۹۹۶

قمری کا لو ہو پانی ہوا ایک عشق میں — آتا ہے اس کا خون جگر آبِ جو کے ساتھ

دم میں ہے دم جہاں تئیں گرمِ تلاش ہوں — سو پیچ و تاب رہتے ہیں ہر ایک مو کے ساتھ

۹۹۷

وحشت چمن میں ہم کو کل صبح بیش تر تھی

بے اُس کے پھول گل سے جی ایک دم یگانہ

۹۹۸

حسرتِ وصل، اندوہِ جدائی، خواہش، کاوش، ذوق و شوق

یوں تو چلا ہوں اکیلا لیکن ساتھ چلا ہے کیا کیا کچھ

رنگ ہوا سے یوں ٹپکے ہے جیسے شراب چواتے ہیں　　آگے ہو میخانے کے نکلو عہد بادہ گساراں ہے
عشق کے میدان داروں میں بھی مرنے کا ہے وصف بہت　　یعنی مصیبت ایسی اُٹھانا کارِ کار گزاراں ہے
دل ہے داغ، جگر ہے ٹکڑے آنسو سارے خون ہوئے　　لوہو پانی ایک کرے یہ عشق لالہ عذاراں ہے

کوہ و کن و مجنوں کی خاطر دشت و کوہ میں ہم نہ گئے
عشق میں ہم کو میرؔ نہایت پاسِ عزّت داراں ہے

۱۰۱۳

ہم اس مرتبہ پھر بھی شکر گئے　　تعب ایسی گزری کہ مر مر گئے
لہو میری آنکھوں میں آتا نہیں　　جگر کے مگر زخم سب بھر گئے

۱۰۱۴

جنگل جنگل شوق کے مارے ناقہ سوار پھرا کی ہے　　مجنوں جو صحرائی ہوا تو لیلےٰ بھی سودائی ہوئی

۱۰۱۵

موسم ہے نکلے شاخوں سے پتّے ہرے ہرے　　پودے چمن میں پھولوں سے دیکھے بھرے بھرے
آگے کسو کے کیا کریں دستِ طمع دراز　　وہ ہاتھ سو گیا ہے سرہانے دھرے دھرے
کیا سمجھے اس کے رتبۂ عالی کو اہلِ خاک　　پھرتے ہیں جوں سپہر بہت ہم ورے ورے

گلشن میں آگ لگ رہی تھی رنگِ گل سے میرؔ
بلبل پکاری دیکھ کے صاحب پرے پرے

۱۰۱۶

صبر کہاں بے تابیٔ دل سے چین کہاں بے خوابی سے
سو سو بار گلی میں نکلتے گھر سے باہر آؤ گے

۱۰۱۷

فرہاد و قیس گذرے اب شور ہے ہمارا　　ہر کوئی اپنی نوبت دو دن بجا گیا ہے
بے جا ہوتے بہت دل رفتار دیکھ اس کی　　عزلت گزینوں سے بھی کم ہی رہا گیا ہے
اے میرؔ شعر کہنا کیا ہے کمالِ انساں　　یہ بھی خیال سا کچھ خاطر میں آگیا ہے

شاعر نہیں جو دیکھا تو تو ہے کوئی ساحر
دو چار شعر پڑھ کر سب کو رِجھا گیا ہے

۱۰۰۵

کیا ضعف تن میں ہے جگر و دل دماغ بن　　پوچھے جو اس قشون میں سردار ہو کوئی
چپکے ہیں ہم تو حیرتِ حالاتِ عشق سے　　کرے بیاں جو واقفِ اسرار ہو کوئی
یکساں ہوئے ہیں خاک سے پامال ہو کے ہم　　کیا اور اس کی راہ میں ہموار ہو کوئی
وہ رہ سکے ہے دل زدہ کچھ منتظر کھڑا
حیرت سے اس کے در پہ جو دیوار ہو کوئی

۱۰۰۶

عشق میں دم مارا نہ کبھو تم چپکے میر کھپے
لوہو منھ سے مل کر اب فریاد کرو تو بہتر ہے

۱۰۰۷

پانی کی سی بوندیں تھیں سب شک نے میں جانا　　کپڑوں پہ گریں گے تو وے آگ جلادیں گے
سرگشتہ سا پھرتا ہے کہتے ہیں بیاباں میں　　گر خضر ملے گا تو ہم راہ بتادیں گے

۱۰۰۸

جنگل میں چشم کس سے بستی کی رہبری کی　　صاحب ہی نے ہمارے یہ بندہ پروری کی
اللہ رے کیا نمک ہے آدم کے حسن میں بھی　　اچھی لگی نہ ہم کو خوش صورتی پری کی

۱۰۰۹

اس غیرتِ قمر کی خجلت سے تابِ رخ کی　　آئینہ تو سراسر ہوتا ہے پانی پانی
یوں میر تو اپنا برسوں کہا کریں گے　　اب رات کم ہے سو بس ہو چکی کہانی

۱۰۱۰

اگر وہ رشک بہار سمجھے کہ رنگ اپنا بھی ہے اب ایسا
ورق خزاں میں جو زرد ہوں گے غم دل اس پہ لکھا کریں گے

۱۰۱۱

سنو سرگذشت اب ہماری زبانی　　سنی گرچہ جاتی نہیں یہ کہانی

۱۰۱۲

چلتے ہو تو چمن کو چلیے کہتے ہیں کہ بہاراں ہے　　پات ہرے ہیں پھول کھلے ہیں کم کم باد و باراں ہے

راہِ جاناں سے ہے گزر مشکل　　جان ہی سے کوئی مگر گزرے
سر کا جانا ہی ہر قدم ہے میر　　کیا کوئی اُس کی راہ پر گزرے

۱۰۲۷

عالم ہئیت مجموعی سے ایک عجیب مرقّع ہے　　ہر صفحے میں ورق ہیں اس کے دیکھیے تو عالم دیکھیے

۱۰۲۸

بوئے گل یا نوائے بلبل تھی　　عمر افسوس کیا شتاب گئی
نمکِ حسن سبز سے اے میر　　ساری کیفیت شراب گئی

۱۰۲۹

حیرتِ گل سے آب جو ٹھٹھکا　　بہے بہتیرا ہی بہا بھی جائے
کیا کوئی اس گلی میں آوے میر　　آوے تو لوہو میں نہا بھی جائے

۱۰۳۰

اس دشت سے غبار ہمارا نہ ٹک اُٹھا　　ہم جاناں خراب نہ جانا کدھر رہے

۱۰۳۱

پھر اب چلو چمن میں کھلے غنچے رک گئے　　شاخوں سمیت پھول نہالوں کے جھک گئے
چندیں ہزار دیدۂ گل رہ گئے کھلے　　افسوس ہے چمن کی طرف تم نہ ٹک گئے
بھڑکی تھی جب کہ آتشِ گل پھول پڑ گیا　　بال و پرِ طیورِ چمن میر پھک گئے

۱۰۳۲

آج ہمیں بے تابی ہی ہے صبر کی دل سے رخصت تھی
چاروں اور نگہ کرنے میں عالم عالم حسرت تھی
بدنامی کیا عشق کی کہیے، رسوائی سی رسوائی ہے
صحرا صحرا وحشت بھی تھی، دنیا دنیا تہمت تھی
راہ کی کوئی سنتا نہ تھا یاں رستے میں مانندِ جرس
شور سا کرتے جاتے تھے ہم، بات کی کس کو طاقت تھی
جو اُٹھتا ہے یاں سے بگولا ہم سا ہے آوارہ کوئی
اس وادی میں میر مگر سرگشتہ کسو کی تربت تھی

۱۰۱۸

ہے برافروختہ خو چشم سے وہ   آتشِ شعلہ زن کو آب کرے
ہے تو یک قطرہ خون ہی لیکن   قہر ہے دل جو اضطراب کرے

۱۰۱۹

آنکھوں کی خونابہ فشانی دیکھیں میرؔ کہاں تک یہ
زرد ہمارے رخساروں پر ہر دم خون بہا جاوے

۱۰۲۰

مسافرانہ ملے تو کہا شرارت سے   غریب کہتے ہیں لوگ ان کو یہ بھی نادر ہے
کسو سیاق سے تحریر طویل شوق نہ ہو   زبانِ خامۂ لسّان اس میں قاصر ہے

۱۰۲۱

ہوتی نہیں تسلّیِ دل گلستاں سے بھی   تسکیں نہیں ہے جان کو آبِ رواں سے بھی
لشکر میں ہے نقیب اسی بات کے لیے   کہتے ہیں لوگ کوچ ہے کل صبح یاں سے بھی

۱۰۲۲

شورِ جرس شب گیر کا غافل تیاری کا تکیہ ہے
یعنی آنکھ نہ لگنے پاوے، قافلہ صبح کو چلتا ہے

۱۰۲۳

کیا اُمیدِ رہائی رکھے ہم سا رفتہ وارفتہ   دل اپنا تو زنجیری اُس زلفِ خم در خم کا ہے

۱۰۲۴

آگے ایسا نکھرا کاہے کو میں پھرتا تھا   جب سے آنکھ لگی اس مہ سے رنگ مرا مہتابی ہے
ابر کوئی رویا ہے شاید برسوں وادیِ دلّی میں   سیر کیا وہ قطعہ زمیں کا اب تک بھی سیرابی ہے

۱۰۲۵

دل کی بات کہی نہیں جاتی چپکے رہنا ٹھانا ہے   حال اگر ہے ایسا ہی تو جی سے جانا جانا ہے
فرصت کم ہے یاں رہنے کی بات نہیں کچھ کہنے کی   آنکھیں کھول کے کان جو کھولو بزمِ جہاں افسانا ہے

۱۰۲۶

جوئے خوں آنکھوں سے بہی شاید   خون سے میرے بھی وے درگزرے

۱۰۳۷

فن شعر میں میرؔ صناع ہے وہ
دل اُس کا کوئی تو ہُنر کرے گا

۱۰۳۸

رہے ہم عالمِ مستی میں اکثر رہا کچھ اور ہی عالم ہمارا

۱۰۳۹

ریگستاں میں جاکے رہیں یا سنگستاں میں ہم جوگی
رات ہوئی جس جاگہ ہم کو ہم نے وہیں بسرام کیا

۱۰۴۰

گر پڑیں گے ٹوٹ کر اکثر ستارے چرخ سے ہِل گیا جو صبح کو گو ہر کسی کے کان کا
ہر ورق ہر صفحے میں اک شعر شور انگیز ہے عرصۂ محشر ہے عرصہ میرے بھی دیوان کا

۱۰۴۱

ہائے جوانی کیا کیا کہیے شور سروں میں رکھتے تھے
اب کیا ہے وہ عہد گیا وہ موسم وہ ہنگام گیا

۱۰۴۲

وصل میں رنگ اُڑ گیا میرا کیا جُدائی کو منھ دکھاؤں گا

۱۰۴۳

پہلو سے اُٹھ گیا ہے وہ نازنیں ہمارا جز ورد اب نہیں ہے پہلو نشیں ہمارا
ہوں کیوں نہ سبز اپنے حرف غزل کہ ہے یہ دَے زرع سیر حاصل قطع زمیں ہمارا
حرف و سخن تھے اپنے یاد استاں جہاں میں مذکور بھی نہیں ہے یا اب کہیں ہمارا
لختِ جگر بھی اپنا یاقوت ناب سا ہے
قطرہ سرشک کا ہے دُرِّ ثمیں ہمارا

۱۰۴۴

وہ جان بیچ کر بھی خریدار ہو گیا
ہے حسن کیا متاع کہ جس کو نظر پڑی

دیوان پنجم

۱۰۳۳

ادراک کو ہے ذاتِ مقدس میں دخل کیا
اودھر نہیں گذار گمان و خیال کیا

۱۰۳۴

دور بہت بھاگو ہو ہم سے سیکھے طریق غزالوں کا
وحشت کرنا شیوہ ہے کیا اچھی آنکھوں والوں کا
سرو لبِ جو لالہ و گل، نسرین سمن ہیں شگوفہ ہے
دیکھو جدھر اک باغ لگا ہے اپنے رنگیں خیالوں کا

۱۰۳۵

بشارت اے صبا دیجو اسیرانِ قفس کو بھی
تسلّی کو تمھاری سر پہ رکھ دو پھول لاؤں گا

۱۰۳۶

رسوائے شہر ہے یاں حرف و سخن ہمارا
کیا خاک میں ملا ہے افسوس فن ہمارا
میرؔ اس کی آنکھیں دیکھیں ہم نے سفر کو جاتے
عینِ بلا ہوا ہے سواب وطن ہمارا

۱۰۵۳

بہت کی جستجو اس کی نہ پایا ہمیں درپیش ہے اب جی کا کھونا
تماشا دیکھنے ہنستا چلا آ کرے ہے شیشہ بازی میرا رونا

وصیت میر نے مجھ سے یہی کی
کہ سب کچھ ہونا تو عاشق نہ ہونا

۱۰۵۴

چپ سی مجھ کو لگ گئی تھی تب سے میر شوران شیریں لبوں کا جب سے تھا

۱۰۵۵

کیا شہر خوش عمارتِ دل سے ہے گفتگو لشکر نے غم کے آن کے مارا چلا گیا
تنہائی بیکسی مری یک دست تھی کہ میں جیسے جرس کا نالہ جرس سے جُدا گیا

کیا تم سے اپنے دل کی پریشانی میں کہوں
دریائے گریہ جوش زناں تھا بہا گیا

۱۰۵۶

غربت ہے دلآویز بہت شہر کی اس کے آیا نہ کبھو ہم کو خیال اپنے وطن کا
جب زمزمہ کرتی ہے صدا چبھتی ہے دل میں بلبل سے کوئی سیکھ لے انداز سخن کا

ب

۱۰۵۷

یارب کدھر گئے جو آدمی روش تھے اوجڑ دکھائی دے ہیں شہر و دہ و نگر سب
حرف سخن سے مطلق یاں گفتگو نہیں ہے پیادے سوار ہم کو آئے نظر نفر سب
عالم کے لوگوں کا ہے تصویر کا سا عالم ظاہر کھلی ہیں آنکھیں لیکن ہیں بے خبر سب

میر اس خرابے میں کیا آباد ہووے کوئی
دیوار و در گرے ہیں ویراں پڑے ہیں گھر سب

۱۰۵۸

عشق و جنوں کی کیا اب تدبیر ہے مناسب زنجیر ہے مناسب شمشیر ہے مناسب
جلدی نہ قتل میں کر پچھتاوے گا بہت تو خوں ریزی میں ہماری تاخیر ہے مناسب

۱۰۴۵

آج ہمارا دل تڑپے ہے کوئی اُدھر سے آوے گا
یا کہ نوشتہ اُن ہاتھوں کا قاصد ہم تک لاوے گا

۱۰۴۶

سمندر کا میں کیوں احساس سہوں گا نہیں کیا سیل اشک اس پر بہوں گا

۱۰۴۷

پھرتے پھرتے اس کے لیے میں آخر دست نورد ہوا
دیکھ آنکھیں وہ سُرمہ آگیں میں پھر دنبالہ گرد ہوا

۱۰۴۸

اب یاں سے ہم اٹھ جائیں گے خلقِ خدا ملک خدا
ہرگز نہ اِدھر آئیں گے خلقِ خدا ملک خدا

۱۰۴۹

اس کی سی جو چلے ہے راہ تو کیا آسماں پر گیا ہے ماہ تو کیا
کب رخ بدر روشن ایسا ہے ایک شب کا ہے اشتباہ تو کیا
میر کیا ہے فقیر مُستغنی
آوے اُس پاس بادشاہ تو کیا

۱۰۵۰

مر گئے پر بھی سنگسار کیا نخل ماتم مرا یہ پھل لایا
یہ شب ہجر ہے کھڑی نہ رہے ہو سفیدی کا جس جگہ سایا

۱۰۵۱

نہ گیا اس طرف کا خط لکھنا ہاتھ جب تک مرا قلم نہ ہوا

۱۰۵۲

ورک کیا اس درس گہ میں میر عقل و فہم کو
کس کے تئیں اُن صورتوں میں معنی کا ادراک تھا

ج

۱۰۶۵

اب جو نسیمِ معطر آئی شاید بال کھلے اُس کے ۔۔۔ شہر کی ساری گلیاں ہو گئیں گویا عنبر سارا آج
میر ہوئے ہو بے خود کب کے آپ میں بھی تو ٹک آؤ ۔۔۔ ہے دروازے پر انبوہ اک رفتۂ شوق تمہارا آج

۱۰۶۶

خوب جو آنکھیں کھول کے دیکھا شاخِ گل سا نظر آیا
اِن رنگوں، پھولوں میں ملا کچھ محوِ جلوۂ یار ہے آج

۱۰۶۷

رنگ پہ ہے دیدۂ گریاں ہے آج ۔۔۔ لوہو ٹپکتا ہے گریباں سے آج
سر بہ فلک ہونے کو ہے کس کی خاک ۔۔۔ گرد یک اٹھتی ہے بیاباں سے آج

۱۰۶۸

سواری اس کی ہے سرگرمِ گشتِ دشت مگر ۔۔۔ کہ خیرہ تیرہ نمودار یک غبار ہے آج

ح

۱۰۶۹

جی بچنے کی طرح نظر آتی نہیں کوئی ۔۔۔ کرتا ہے میرے خون پہ اصرار بے طرح
لوہو میں ڈوبے دیکھو داماں و جیبِ میر ۔۔۔ بپھرا ہے آج دیدۂ خونبار بے طرح

د

۱۰۷۰

اس کارواں سرائے کے ہیں لوگ رفتنی ۔۔۔ حسرت سے ان کا کرتے ہیں نظّارہ دردمند

ر

۱۰۷۱

سوارانِ شائستہ کشتے ہیں تیرے ۔۔۔ نہ تیغِ ستم کر علم ہر نفر پر

۱۰۷۲

دل کا راز کیا ہیں ظاہر بلبل سے گلزار میں لیک
اس بے تہ نے صحنِ چمن میں جان دی چلّا چلّا کر

۱۰۵۹

تاب عشق نہیں ہے دل کو جی بھی بے طاقت ہے اب
یعنی سفر ہے دُور کا آگے اور اپنی رخصت ہے اب

۱۰۶۰

موسم گل کا شاید آیا داغ جنوں کے سیاہ ہوئے
دل کھنچتا ہے جانبِ صحرا جی نہیں لگتا گھر میں اب
نقش نہیں پانی میں اُبھرتا یہ تو کوئی اچنبھا ہے
صورتِ خوب اُس کی ہے پھرتی اکثر چشمِ تر میں اب
ایک جگہ پر جیسے بھنور ہیں لیکن چکّر رہتا ہے
یعنی وطن دریا ہے اس میں چار طرف ہیں سفر میں اب

۱۰۶۱

ہم تو تمھارے حسن کی حیرت سے ہیں خموش　　تم ہم سے کوئی کرتے نہیں بات کیا سبب

۱۰۶۲

ملنے والو پھر ملیے گا ہے وہ عالمِ دیگر میں
میرؔ فقیر کو سکر ہے یعنی مستی کا عالم ہے اب

ت

۱۰۶۳

دل کی تہ کی کہی نہیں جاتی نازک ہے اسرار بہت
انچھر فقیر تو عشق کے دو ہی لیکن ہے بستار بہت
منھ کی زردی تن کی نزاری چشمِ تر پر چھائی ہے
عشق میں اس کے یعنی ہم نے کھینچے ہیں آزار بہت

۱۰۶۴

چشم رہتی ہے اب پُر آب بہت　　دل کو میرے ہے اضطراب بہت
دیکھیے رفتہ رفتہ کیا ہووے　　تابِ دل کم ہے پیچ و تاب بہت

سال میں ابرِ بہاری کہیں آکر برسا — لوہو برسا رہے ہیں دیدۂ خوں بار ہنوز
اب کی بالیدنِ گلہا تھا بہت، دیکھو نہ میر
ہمسرِ لالہ ہے خارِ سرِ دیوار ہنوز

س

۱۰۸۲

مجھ کو کرنا تھا احتراز اُس سے — ہائے افسوس کیا کیا افسوس

۱۰۸۳

گرد سے ہے ناقۂ سلمیٰ کو مشکل رہروی — خاک کس کی ہے کہ مشتاق آتی ہے محمل کے پاس
ملیے کیونکر نے کفِ افسوس جی جاتا ہے میر — ڈوبتی ہے کشتی ورطے سے نکل ساحل کے پاس

۱۰۸۴

ایک ہی گردش میں اس کی آنکھوں کی — پھر گیا ہم سے روزگار افسوس
نہ معرّف نہ آشنا کوئی — ہم ہیں بے یار و بے دیار افسوس

ش

۱۰۸۵

رنج و غم آئے بیش تر درپیش — راہِ رفتن ہے اب مگر درپیش
یار آنکھوں تلے ہی پھرتا ہے — میری مدّت سے ہے نظر درپیش
خانہ روشن پتنگوں نے نہ کیا
ہے چراغوں کو بھی سحر درپیش

۱۰۸۶

ادھر آتا بھی وہ سوار اے کاش — اس کا ہو جاتا دل شکار اے کاش
راہ تکتے تو پھٹ گئیں آنکھیں — اس کا کرتے نہ انتظار اے کاش

۱۰۸۷

آباد اجڑا لکھنؤ چغدوں سے اب ہوا
مشکل ہے اس خرابے میں آدم کی بود و باش

۱۰۷۳

زور ہوا ہے چل صوفی ٹک تو بھی رباطِ کہنہ سے　　ابرِ قبلہ بڑھتا بڑھتا آیا ہے مے خانے پر

۱۰۷۴

پیش از سحر اُٹھے ہے آج اُس کے منھ کا پردا　　نکلے گا اس طرف سے اب آفتاب کیونکر

۱۰۷۵

پانی کے دھوکے پیاسے کیا کیا عزیز مارے
سر پر نہ خاک ڈالے اپنے سراب کیوں کر

۱۰۷۶

لاوے جھمکتے رُخ کی آئینہ تاب کیونکر　　ہو چہرہ اُس کے لب سے یاقوتِ ناب کیونکر
ہے شعر و شاعری گو کب سے شعار اپنا　　حرف و سخن سے کریے اب اجتناب کیونکر

۱۰۷۷

سیاحت خوب مجھ کو یاد ہے پیر کی کبھی وحشت کی
پڑا اپنا پانو پھیلے دشت کے سر تیز خاروں پر

۱۰۷۸

اک آدھ دن نکل مت اے ابر اُدھر سے ہوکر　　بیٹھا ہوں میں ابھی ٹک سارا جہاں ڈبوکر
ہے نظم کا سلیقہ ہر چند سب کو لیکن　　جب جانیں کوئی لاوے یوں موتی سے پِروکر

۱۰۷۹

رنگ ہوا سے ٹپکنے لگا ہے سبزے میں کوئی پھول کھلا
یعنی چشمک گُل کرتا ہے فصلِ بہار کے آنے پر

ز

۱۰۸۰

تیشے سے کوہکن کے دلِ کوہ جل گیا
نکلے ہے سنگ سنگ سے اکثر شرر ہنوز

۱۰۸۱

وہ مہِ چاردہ اس شہر سے کب کا نکلا　　ہر گلی جھانکتے پھرتے ہیں طلب گار ہنوز

۱۰۹۶

تین دن گور میں بھی بھاری ہیں یعنی آسودگی نہیں تہِ خاک
ہاتھ پہنچا نہ اس کے دامن تک میں گریباں کروں نہ کیوں کر چاک

۱۰۹۷

میں چل بسا تو شہر ہی ویران سب ہوا اس نیم جاں کے بدلے ہوا ایک جہاں ہلاک

۱۰۹۸

تھا اگر دبوئے گل سے بھی دامن ہوا کا پاک کیا اب کے اس چمن سے گئی ہے بہار الگ
پاس اس کا بعدِ مرگ ہے آدابِ عشق سے بیٹھا ہے میری خاک سے اُٹھ کر غبار الگ

ل

۱۰۹۹

دل دِل لوگ کہا کرتے ہیں تم نے جانا کیا ہے دل
چشمِ بصیرت وا ہووے تو عجائب دید کی جا ہے دل
اوج و موج کا آشوب اس کے لے کے زمیں سے فلک تک ہے
صورت میں تو قطرۂ خوں ہے معنی میں دریا ہے دل

۱۱۰۰

ہر لحظہ ہے کدورتِ خاطر سے بارِ دل آندھی سی آوے نکلے کبھو جو غبارِ دل

م

۱۱۰۱

آگے تو کچھ اُس کے آہیں گرمِ شعلہ فشانی تھیں
اب تو ہوئے ہیں میر اک ڈھیری خاکستر کی جل کر ہم

۱۱۰۲

سو طرف لے جاتی ہے ہم کو پریشاں خاطری یاں کسے ڈھونڈو ہو تم کیا جانیے کِدھر ہیں ہم

۱۱۰۳

نظر دُزدیدہ کرتے ہو جھکی رکھتے ہو پلکوں کو
لگی ہوتیں نہ آنکھیں تو نہ آنکھوں کو چھپاتے ہم

ط

۱۰۸۸

گل ہو کے برگ برگ ہوئے پھر ہوا ہوئے　　رکھتے ہیں اس چمن کے جو غنچے صبا سے ربط

۱۰۸۹

خام رہتا ہے آدمی گھر میں　　پختہ کاری کے تئیں سفر ہے شرط

ع

۱۰۹۰

فروغ اس کے چہرے کا تھا پردہ در　　ہوا کیا جو ہم نے بجھائی تھی شمع

۱۰۹۱

آتی ہے مجلس میں تو فانوس میں آتی ہے شمع　　وہ سراپا دیکھ کر پردے میں جل جاتی ہے شمع

ف

۱۰۹۲

آوارگی کے محو ہیں ہم خانماں خراب　　مطلق نہیں نظر ہمیں گھر بار کی طرف

۱۰۹۳

نہ دیکھو کبھی موتیوں کی لڑی　　جو دیکھو مری گفتگو کی طرف

اسے دیکھنے میر کھوئے گئے　　کوئی دیکھے اس جستجو کی طرف

ک

۱۰۹۴

پیچ و تاب سے خاک بھی میری جیسے بگولا پھرنے لگی

سر میں ہوا ہی اس کے بہت تھی تب تو ہوئی ہے ہوائی خاک

نعمت رنگارنگ حق سے بہرہ بخت سیہ کو نہیں

سانپ رہا گو گنج کے اوپر کھانے کو تو کھائی خاک

۱۰۹۵

تا مدِ نظر چھا رہے ہیں لالۂ صد برگ　　جنگل بھرے ہیں سب گلِ تریاک سے اب تک

گو خاک سی اُڑتی ہے مرے منہ پہ جنوں ہیں　　ٹپکے ہے لہو دیدۂ نمناک سے اب تک

۱۱۱۱

عشق نے ہم کو مار رکھا ہے جی میں اپنے تاب نہیں
دل کو خیالِ صبر نہیں آنکھوں کو میلِ خواب نہیں
کوئی سبب ایسا ہو یارب جس سے عزت رہ جاوے
عالم میں اسباب کے ہیں پر پاس اپنے اسباب نہیں
خط کا جواب نہ لکھنے کی کچھ وجہ نہ ظاہر ہم پر ہوئی
دیر تلک قاصد سے پوچھا منھ میں اس کے جواب نہیں

۱۱۱۲

نظیر اس کی نظر نہ سیّاحانِ عالم کو   سیاحت دُور تک کی ایک وہ بے نظری ہیں

۱۱۱۳

دل کی تہ کی کہی نہیں جاتی کہیے تو جی ماریں ہیں
رس رس پھوٹ بہیں جو آنکھیں رُود کی سی دو دھاریں ہیں
عشق کے دیوانے کی سلاسل ہلتی ہے توڑ دیں ہیں ہم
بگڑے پیلِ مست کی سی زنجیروں کی جھنکاریں ہیں
بڑے بڑے گھر جن کے یاں آثار ان کے ہیں یہ اب
میر شکستہ دروازے ہیں گری پڑی دیواریں ہیں

۱۱۱۴

حسن کیا جنس ہے جی اس پہ لگا بیٹھے ہیں   غزلتی شہر کے بازار میں آ بیٹھے ہیں
قافلہ قافلہ جاتے ہیں چلے کیا کیا لوگ   میر غفلت زدہ حیران سے کیا بیٹھے ہیں

۱۱۱۵

عشق کوئی ہمدرد کہیں مدت میں پیدا کرتا ہے   کوہ رہیں گو نالاں برسوں لیکن اب فرہاد نہیں

۱۱۱۶

طالع نہ ذائقے کے اپنے کھلے کہ ہم بھی   ان شکّریں لبوں کے ہونٹھوں کا کچھ مزا لیں

۱۱۱۷

کوئی ناکام یوں رہے کب تک   میں بھی اب ایک کام کرتا ہوں

ن

۱۱۰۴

سنتا نہیں ہے شعر بھی وہ حرف ناشنو — دل ہی میں خوں ہوا کہیں مری نکتہ دانیاں

۱۱۰۵

درا میں کہاں شور ایسا دھرا تھا — کسو کا مگر دل رکھا تھا جرس میں
بہت روئے پردے میں جب دیدۂ تر — ہوئی اچھی برسات تب اس برس میں

ہوا ہی کو دیکھیں ہیں اے میرؔ اسیراں
لگا دیں مگر آنکھیں چاکِ قفس میں

۱۱۰۶

شگفتہ خاطری اُس بن کہاں تھی — چمن میں غنچہ پیشانی رہا میں

۱۱۰۷

جان کیا گو ہر گرامی ہے — بدلے اس کے جہان دیتے ہیں
یہ عجب گم ہوئے ہیں جس کے لیے — نہیں اس کا نشان دیتے ہیں

۱۱۰۸

جب سے جُدا ئیں ان سے ہوا ہوں حال عجب ہے روز و شب
چشمِ تر سے ٹپکے ہیں آنسو خشک لبوں پر آہیں ہیں

۱۱۰۹

راہ عجب پیش آئی ہم کو یاں سے تنہا جانے کی
یار و ہمدم، ہمراہی ہر گام بچھڑتے جاتے ہیں
ضعفِ دماغ سے افتاں خیزاں چلتے ہیں ہم راہ ہوس
دیکھیں کیا پیش آوے اب تو گرتے پڑتے جاتے ہیں

۱۱۱۰

محمل کے تیرے گرد ہیں محمل کئی ہزار — ناقہ ہے ایک لیلےٰ کا سو کس قطار میں
شور اب چمن میں میری غزل خوانی کا ہے میرؔ — اک عندلیب کیا ہے کہوں مَیں ہزار میں

ھ

۱۱۲۶

کس آوارۂ عشق و جنوں کی اک مٹھی اب خاک اڑی
اڑتی پھرے ہے پس محمل جو راہ کے گرد و غبار کے ساتھ

۱۱۲۷

آنکھیں ملا کبھو تو کب تک کیا کروں میں — دنبالہ گردی تیری اے آہوئے رمیدہ
آنکھیں ہی بجھ رہی ہیں اہل نظر کی یکسر — چلتے ہوئے زمیں پر رکھ پانوں دیدہ دیدہ
چل سیر کرنے تو بھی تا صبح آنکھیں کھولیں — منھ پر ترے چمن میں گل ہائے نو دمیدہ

اشعار میر سب نے چن چن کے لکھ لیے ہیں
رکھیں گے یاد ہم بھی کچھ بیتیں چیدہ چیدہ

۱۱۲۸

مستی میں شیخ شہر سے صحبت عجب رہی — سر پھوڑتے رہا کیے اکثر سبو کے ساتھ
تھا عکس اس کی قامتِ دلکش کا باغ میں — آنکھیں چلی گئیں ہیں لگی آبِ جو کے ساتھ

۱۱۲۹

گل گل شگفتہ مے سے ہوا ہے نگار دیکھ — یک جرعہ ہمدم اور پلا پھر بہار دیکھ
محتاجِ گل نہیں گریبانِ غم کشاں — گلزار اشکِ خونیں سے جیب و کنار دیکھ

۱۱۳۰

ملتا رہا کشادہ جبیں خوب و زشت سے — کیا آئینہ کرے ہے بسر یاں حیا کے ساتھ
کیا جانوں میں چمن کو ولیکن قفس پہ میر — آتا ہے برگِ گل کبھو کوئی صبا کے ساتھ

۱۱۳۱

آنکھوں میں آشنا تھا مگر دیکھا تھا کہیں — نو گل کل ایک دیکھا تھا میں نے صبا کے ساتھ

ی

۱۱۳۱

دیکھ کے دست و پائے نگاریں چپکے سے رہ جاویں نہ کیوں
منھ بولے ہے یار و گویا مہندی اس کی رچائی ہوئی

و

١١١٨

ان اجڑی ہوئی بستیوں میں دل نہیں لگتا   ہے جی میں وہیں جا بسیں ویرانہ جہاں ہو
وحشت ہے خردمندوں کی صحبت سے مجھے میر   اب جا رہوں گا واں کوئی دیوانہ جہاں ہو

١١١٩

شہرِ دل کی کیا خرابی کا بیاں باہم کریں   اس کو ویرانہ نہ کہیے جو کبھی معمور ہو

١١٢٠

عاشق ہو تو اپنے تئیں دیوانہ سب میں جانتے رہو
چکر مارو جیسے بگولا خاک اُڑاتے آتے رہو
شاعر ہو مت چپکے رہو اب چپ میں جانیں جاتی ہیں
بات کرو ابیات پڑھو کچھ بیتیں ہم کو بتاتے رہو

١١٢١

دل اتنا ہے آشفتہ خورشید رُو کا   کہ اپنے بھی سائے سے وحشت ہے مجھ کو

١١٢٢

گرچہ ہم پربستہ طائر ہیں برائے گلہائے تر   کچھ ہمیں پروا نہیں ہے تم اگر پروا کرو

١١٢٣

موسم گل آیا ہے یارو کچھ میری تدبیر کرو   یعنی سایۂ سروِ گل میں اب مجھ کو زنجیر کرو
شعر کہے موزوں تو ایسے جن سے خوش ہیں صاحبِ دل   رُو دیں کڑھیں جو یاد کریں اب ایسا تم کچھ میر کرو

١١٢٤

نہریں چمن کی بھر رکھی ہیں گویا بادۂ لعلیں سے   ہے عکسِ گل و لالہ الٰہی ان جویوں میں آب نہ ہو
تہ داری کچھ دیدۂ تر کی میر نہیں کم دریا سے   جوشاں شور کناں آجاوے یہ شعلہ سیلاب نہ ہو

١١٢٥

رہیں رُکے پر اس سے ملاقات ہو تو ہو   خاموش ان لبوں سے کوئی بات ہو تو ہو
نومید وصل دل نہیں شب ہائے ہجر میں   ان راتوں ہی میں ملنے کی بھی بات ہو تو ہو

۱۱۳۸

پتا پتا بوٹا بوٹا حال ہمارا جانے ہے
جانے نہ جانے گل ہی نہ جانے باغ تو سارا جانے ہے
لگنے نہ دے بس ہو تو اُس کے گوہرِ گوش کو بالے تک
اس کو فلک چشمِ مہ و خور کی پُتلی کا تارا جانے ہے
مہر و وفا و لطف و عنایت ایک سے واقف ان میں نہیں
اور تو سب کچھ طنز و کنایہ رمز و اشارا جانے ہے

۱۱۳۹

صد رنگ بہاراں میں اب کی جو کھلے ہیں گل — یہ لطف نہ ہو ایسی رنگینی ہوا کی ہے
داماں دراز اس کا جوں صبح نہیں کھینچا — اے میر یہ کوتاہی شب دستِ دعا کی ہے

۱۱۴۰

شکایت کروں ہوں تو سونے لگے ہے — مری سرگزشت اب ہوئی ہے کہانی
بسنتی قبا پر تری مر گیا ہے — کفن میر کو دیجیو زعفرانی

۱۱۴۱

آ کر بکھیرے پھول مری مشتِ خاک پر — مرغِ چمن اگر حقِ صحبت ادا کرے

۱۱۴۲

عالم عالم عشق و جنوں ہے دنیا دنیا تہمت ہے — دریا دریا روتا ہوں میں صحرا صحرا وحشت ہے

۱۱۴۳

آبِ حیات وہی نہ جس پر خضر و سکندر مرتے رہے
خاک سے ہم نے بھرا وہ چشمہ یہ بھی ہماری ہمت ہے

۱۱۴۴

ہاتھ لیے آئینہ تجھ کو حیرت ہے رعنائی کی
ہے بھی زمانہ ہی ایسا ہر کوئی گرفتاری میں ہے
صورتیں بگڑیں کتنی کیوں نہ اس کو توجہ کب ہے
سامنے رکھے آئینہ مصروف طرح داری میں ہے

۱۱۳۲

آنکھوں کی طرف گوش کی دریپردہ نظر ہے　　کچھ یاد کے آنے کی مگر گرم خبر ہے
کیا پھیل پڑی مدّتِ ہجراں کو نہ پوچھو　　مہ سال ہوا ہم کو گھڑی ایک پہر ہے
شب شور و فغاں کرتے گئی مجھ کو تو اب تو　　دم کش ہو ٹک اے مرغ چمن وقت سحر ہے
ہر بیت میں کیا میرؔ تری باتیں گتھی ہیں
کچھ اور سخن کر کہ غزل سلک گہر ہے

۱۱۳۳

کیا خانہ خرابی کا ہمیں خوف و خطر ہے　　گھر ہے کہ کسو گوشے میں تو مکڑے کا سا گھر ہے
میلان نہ آئینہ کا اس کو ہے نہ گل کا　　کیا جانیے اب روئے دلِ یار کدھر ہے
اے شمع اقامت کدہ اس بزم کو مت جان　　روشن ہے ترے چہرے سے تو گرمِ سفر ہے
کیا آگ کی چنگاریاں سینے میں بھری ہیں
جو آنسو مری آنکھ سے گرتا ہے شرر ہے

۱۱۳۴

کیا کہیے کچھ بن نہیں آتی جنگل جنگل ہو آئے　　چھانہ میں جا کر بوبوں کی ہم عشق و جنوں کو رلائے

۱۱۳۵

وحش اور طیر آنکھیں ہر سو لگا رہے ہیں　　گرد رہ اس کی دیکھیں اٹھ چلتی ہے کدھر سے

۱۱۳۶

بزم میں سے اب تو چل اے رشکِ صبح　　شمع کے اوپر پھری ہے مُردنی
میں چراغِ صبح گاہی ہوں نسیم!　　مجھ سے اک دم کے لیے کیا دشمنی
کچھ گدا شاعر نہیں ہوں میرؔ میں
تھا مرا سر مشق، دیوانِ غنی

۱۱۳۷

یوں پھرتا ہوں دشت و در میں دُور اُس سے میں سرگشتہ
غم کا مارا آوارہ جوں راہ گیا ہو بھول کوئی

۱۱۵۳

راہ ہے پُرخار میرے پاؤں میں ہیں آبلے　　تیر طے ہوگا بیابانِ محبت کس طرح

۱۱۵۴

کیسی سعی و کشش کوشش سے کعبے گئے بتخانے سے
اس گھر میں کوئی بھی نہ تھا شرمندہ ہوئے ہم جانے سے

۱۱۵۵

ایسے گئے کہ ان کی پھر کچھ خبر نہ آئی　　کیا کہیے ویسی صورت گاہے نظر نہ آئی

۱۱۵۶

داد فریاد جا بجا کریے　　شاید اس کے بھی دل میں جا کریے
اب سلگنے لگی ہے چھاتی بھی　　یعنی مدّت پڑے جلا کریے
کچھ کہیں تو کہے ہے یہ نہ کہو　　کیوں کر اظہارِ مدّعا کریے
راہ تکنے کو بھی نہایت ہے　　منتظر کب تلک رہا کریے

سو تو ہر روز ہے بُرا احوال
متحیّر ہیں آہ کیا کریے

۱۱۵۷

جنگل جنگل شوق کے مارے ناقہ سوار پھرا کی ہے
مجنوں جو صحرائی ہوا تو لیلیٰ بھی سودائی ہوئی

۱۱۵۸

کارواں گاہِ جہاں میں نہیں رہتا کوئی　　جس کے ہاں دیکھتے ہیں چلنے کی تیاری ہے
آئینہ روبرو رکھنے کو بھی اب جائے نہیں　　صورتوں سے اسے ہم لوگوں کی بیزاری ہے

آنکھ مستی میں کسو پر نہیں پڑتی اس کی
یہ بھی اس سادہ و پرکار کی ہُشیاری ہے

۱۱۵۹

کب تلک چاکِ قفس سے جھانکیے
برگِ گل یاں بھی صبا کوئی تو لائے

۱۱۴۵

عشق و محبت کیا جانوں ہیں لیکن اتنا جانوں ہیں
اندر ہی سینے میں میرے دل کو کوئی کھاتا ہے
عاشق اپنا جان لیا ہے اُن نے شاید میر ہمیں
دیکھ بھری مجلس میں اپنی ہم ہی سے شرماتا ہے

۱۱۴۶

یمنِ تجرّد سے میں اپنے روز جہاں سے گزرتا ہوں
وحشت ہے خورشید نمط اپنے بھی مجھ کو سائے سے

۱۱۴۷

بیمار امیدوار سے بستر پہ اپنے ہم — دروازے ہی کی اُور تکیں ہو جیسے پڑے ہوئے

۱۱۴۸

عہدِ جنوں ہے موسمِ گل کا اور شگوفہ لایا ہے
ابر بہاری وادی سے اٹھ کر آبادی پر آیا ہے
دکھن، اُتر، پورب، پچھم ہنگامہ ہے سب جاگہ
اُودھم میرے حرف و سخن نے چاروں اور مچایا ہے

۱۱۴۹

وے زور ور جواں جنھیں کہیے پہاڑ تھے — جب آئی موجِ حادثہ تنکے سے بہہ گئے

۱۱۵۰

ہائے جوانی وصل میں اس کے کیا کیا لذت پاتے تھے
بوسۂ کنجِ لب سے پھر بھی ذائقے اپنے بتاتے تھے

۱۱۵۱

بات ہماری یاد رہے جی بھولا بھولا جاتا ہے — وحشت پر جب آتا ہے تو جیسے بگولا جاتا ہے
گام کی صورت کیا ہے اس کی راہ چلے ہے میر اگر — دیکھنے والے کہتے ہیں یہ کوئی ہیولا جاتا ہے

۱۱۵۲

اس کی روئے خوئے کردہ پر نقاب ہے وہ صورت ہے — جیسے یکایک سطح ہوا پر بدلی آئی تارے گئے

۱۱۶۶

گردن کشِ زمانہ تو تیرا اسیر ہے — سلطانِ عصر تیری گلی کا فقیر ہے

۱۱۶۷

اِن بلاؤں سے کب رہائی ہے — عشق ہے فقر ہے جُدائی ہے
استخواں کانپ کانپ جلتے ہیں — عشق نے آگ یہ لگائی ہے
دل کو کھینچے ہے چشمک انجم — آنکھ ہم نے کہاں لڑائی ہے
مَیں نہ آتا تھا باغ میں اُس بِن — مجھ کو بلبل پکار لائی ہے
اور کچھ مشغلہ نہیں ہے ہمیں — گاہ و بے گہ غزل سرائی ہے
توڑ کر آئینہ نہ جانا یہ — کہ ہمیں صورت آشنائی ہے

بیستوں کو ہکن نے کیا توڑا
عشق کی زور آزمائی ہے

۱۱۶۸

خاموش رہے کب تک زندانِ جہاں میں ہم — ہنگامہ قیامت کا شورش سے اُٹھا جاوے
افسوس کی جاگہ ہے یاں بازپسیں دم میں — ہو روبرو آئینہ وہ منہ کو چھپا جاوے

۱۱۶۹

ترے بندے ہم ہیں خدا جانتا ہے — خدا جانے تو ہم کو کیا جانتا ہے
گہے زیرِ برقع گہے گیسوؤں میں — غرض خوب وہ منہ چھپا جانتا ہے

نہیں اتحادِ تن و جان سے واقف
ہمیں یار سے جو جدا جانتا ہے

۱۱۶۰

مقصود کو دیکھیں پہنچے کب تک　　گردش میں تو آسماں بہت ہے
گو خاک سے کور ہووے یکساں　　گم گشتے کا یہ نشاں بہت ہے

۱۱۶۱

آشوب بحر ہستی کیا جانیے ہے کب سے　　موج و حباب اٹھ کر لگ جاتے ہیں کنارے
کوئی تو تھا پر آواز دی نہ ہم کو　　ہم بے قرار ہو کر چاروں طرف پکارے

۱۱۶۲

شاید لمبے بال اس مہ کے بکھر گئے تھے باؤ چلے
دل تو پریشاں تھا ہی میرا رات سے جی بھی بکھرتا ہے
صورت اس کی دیدۂ تر میں پھرتی ہے ہر روز و شب
ہے نہ اچنبھا یہ بھی کہیں پانی میں نقش ابھرتا ہے
کیا دشوار گزار ہے عشقِ مسافر کش یارو
جی سے اپنے گزر جاتا ہے جو اس راہ گزرتا ہے

۱۱۶۳

سب مزے درکنار عالم کے　　یار جب ہم کنار ہوتا ہے
جبر ہے، قہر ہے، قیامت ہے　　دل جو بے اختیار ہوتا ہے
راہ تکتے ہی بیٹھیں میں آنکھیں
اس کا جب انتظار ہوتا ہے

۱۱۶۴

مثل صورت ہیں جلوہ کے حیراں　　ہائے کیا شکل کیا شمائل ہے
میرؔ کب تک بحالِ مرگ جئیں　　کچھ بھی اس زندگی کا حاصل ہے

۱۱۶۵

دیدۂ گریاں ہمارا نہر ہے　　دل خرابہ جیسے دلّی شہر ہے
آندھی آئی ہو گیا عالم سیاہ　　شور نالوں کا بلائے دہر ہے

۱۱۷۳

رکھا تھا منہ کبھو اس کنجِ لب پر   ہمارے ذوق میں اب تک مزا تھا
ملے برسوں وہی بیگانگی تھی   ہمارے زعم میں وہ آشنا تھا
بدن میں صبح سے تھی سنسناہٹ   انھیں سناہٹوں میں جی جلا تھا
چڑھی تیوری چمن میں میر آیا
گلِ حسن آج شاید کچھ خفا تھا

۱۱۷۴

کیا کہوں مشکل ہوئی تحریرِ حال   خط کا کاغذ رونے سے نم ہو گیا
باغ جیسے راغ وحشت گاہ ہے   یاں سے شاید گل کا موسم ہو گیا

۱۱۷۵

وہ دیکھنے ہمیں ٹک بیماری میں نہ آیا   سو بار آنکھیں کھولیں بالیں سے سر اُٹھایا
گلشن کے طائروں نے کیا بے مروّتی کی   یک برگِ گل قفس میں ہم تک نہ کوئی لایا

۱۱۷۶

باتیں ہماری یاد رہیں پھر باتیں ایسی نہ سنیے گا
پڑھتے کسو کو سنیے گا تو دیر تلک سر دُھنیے گا

۱۱۷۷

گرد و غبار دشت و وادی گریے سے میرے یک سو ہیں
رُونے کے آگے اُن کے تو دریا بھی میر اب گرد ہوا

۱۱۷۸

غیر از خدا کی ذات سے مرے گھر میں کچھ نہیں   یعنی کہ اب مکاں مرا لامکاں ہوا
وے تو کھڑے کھڑے مرے گھر آ کے پھر گئے   میں بے دیار و بیدل و بے خانماں ہوا
مرغِ چمن کی نالہ کشی کچھ خنک سی تھی   میں آگ دی چمن کو جو گرم فغاں ہوا
سر کھینچا دودِ دل نے جہاں تیرہ ہو گیا
دم بھر میں صبح زیرِ فلک کیا سماں ہوا

دیوان ششم

۱۱۷۰

زمانے میں مرے شورِ جنوں نے　　قیامت کا سا ہنگامہ اُٹھایا
حقِ صحبت نہ طیروں کو رہا یاد　　کوئی دو پھول اسیروں تک نہ لایا

۱۱۷۱

کارواں ہائے صبح ہوتے گیا　　مَیں ستم دیدہ محو خواب رہا
گھر سے آئے گلی میں سو باری　　یار بن دیر اضطراب رہا
سوزشِ سینہ اپنے ساتھ گئی
خاک میں بھی ہمیں عذاب رہا

۱۱۷۲

دروازے پر کھڑا ہوں کئی دن سے یار کے　　حیرت نے حسن کی مجھے دیوار کر دیا
سائے کو اس کے دیکھ کے وحشت بلا ہوئی　　دیوانہ مجھ کو جیسے پری وار کر دیا
دن رات اسکو ڈھونڈے ہے دل شوق نے مجھے
نایاب کس گہر کا طلب گار کر دیا

۱۱۸۷

مجھ سے لینے لگے ہیں عبرت لوگ　　عاشقی میں یہ اعتبار ہوا

۱۱۸۸

اب یار دوپہر کو کھڑا ٹک جو یاں رہا　　حیرت سے آفتاب جہاں کا تہاں رہا
جو قافلے گئے تھے انھوں کی اٹھی بھی گرد　　کیا جانیے غبار ہمارا کہاں رہا
سوکھی پڑی ہیں آنکھیں میری دیر سے جواب　　سیلاب ان ہی رخنوں سے مدت رواں رہا
اعضا گدازِ عشق سے ایک ایک بہہ گئے　　اب کیا رہا ہے مجھ میں جو میں نیم جاں رہا
اُس کے فریبِ لطف پہ مت جا کہ ہم نشین
وہ دیر میرے حال پر بھی مہرباں رہا

۱۱۸۹

سخن مشتاق ہے عالم ہمارا　　بہت عالم کرے گا غم ہمارا
پڑھیں گے شعر رو رو لوگ بیٹھے　　رہے گا دیر تک ماتم ہمارا
نہیں ہے مرجع آدم اگر خاک
کِدھر جاتا ہے قدِ خم ہمارا

ب

۱۱۹۰

ہر خانہ کیوں نہ صبح جہاں میں ہو ہر فروغ　　پھرتا ہے جھانکتا اسی کو گھر گھر آفتاب
نازک مزاج ہے تو کہیں گھر سے مت نکل　　ہوتا ہے دوپہر کے تئیں سر پر آفتاب
پیدا ہے روز مشرقِ نو کی نمود سی　　آئے ہے کوئے یار سے بچ بچ کر آفتاب
ہو پست اُس کے نور کا زیر زمیں گیا　　ہر چند سب ستاروں سے تھا برتر آفتاب
اُس روح کی روشنی میں نہ معلوم کچھ ہوا　　مہ گم کدھر ہوا ہے گیا کدھر آفتاب
روشن ہے یہ کہ خوف ہے اُس غصہ ور کا میر
نکلے ہے صبح کانپتا جو تھر تھر آفتاب

۱۱۹۱

آئینہ سا جو کوئی یاں آشنا صورت ہے اب　　بے مروت اس زمانے میں ہمہ حیرت ہے اب

۱۱۷۹

حیرت زدہ میں عشق کے کاموں کا یار کے		دروازے پر کھڑے کھڑے دیوار ہو گیا

۱۱۸۰

بلبل کا شور سن کے نہ مجھ سے رہا گیا		میں بے دماغ باغ سے اُٹھ کر چلا گیا

لوگوں نے پائی راکھ کی ڈھیری مری جگہ		اک شعلہ میرے دل سے اُٹھا تھا چلا گیا

بادل گرج گرج کے سناتا ہے یعنی یاں

نوبت سے اپنی ہر کوئی نوبت بجا گیا

۱۱۸۱

سر جو نے دے مارتے گھر میں پھرے		رنگ دیگر ہے در و دیوار کا

۱۱۸۲

اس خزاں میں نہ طیر بھی بولا		میں چمن میں بہت پکار آیا

موسم آیا تو نخل دار میں میرؔ		سرِ منصور ہی کا بار آیا

۱۱۸۳

زمانہ ہجر کا آسان کیا بسر آیا		ہزار مرتبہ منھ تک مرے جگر آیا

ملا جو عشق کے جنگل میں خضر میں نے کہا		کہ خوفِ شیر ہے مخدوم یاں کدھر آیا

یہ لہر آتی گئی زور کا ہے پانی تک

محیط اس مرے رونے کو دیکھ تر آیا

۱۱۸۴

باغ کو بے لالہ و گل دیکھ کہتے تھے طیور		جھڑ گئے پت جھڑ میں اب کی ہائے کیا کیا آشنا

اب جو ہاتھ آئے ہیں ہم مت مفت کھو دیجو ہمیں		پھر نہ ہو گا تم کو ایسا کوئی پیدا آشنا

۱۱۸۵

جہاں کا دریائے بیکراں تو سراب پایانِ کار نکلا

جو لوگ تہ سے کچھ آشنا تھے انھوں نے لب تر کیا نہ اپنا

۱۱۸۶

دماغ اپنا تو اپنی فکر میں ہی ہو چکا یکسر		خیال اپنا کس کو ہے اے ہم نشیں نازک خیالی کا

کوئی بولا نہ قتل میں میرے
مُہر کی تھی مگر وہانوں پر

۱۱۹۹

برسات اب کی گذری خوف و خطر میں ساری
چشمک زناں رہی ہے برق آشیاں کے اوپر
عشق و ہوس میں کچھ تو آخر تمیز ہوگی
آئی طبیعت اس کی گر امتحاں کے اوپر

۱۲۰۰

تہ سے سخن کے لوگ نہ تھے آشنا عبث جاگہ سے تم گئے انھوں کی واہ واہ پر

۱۲۰۱

ہوں کوبہ کو صبا سا پر کچھ نہیں ہے حاصل شاید برات اپنی لکھی ہوا کے اوپر
کی

۱۲۰۲

قیامت ہے مشتاق لوگوں کی کثرت پہنچنا ہے مشکل ہمیں اس کے گھر تک
بہار آئی پر ایک پتّی بھی گل کی نہ آئی اسیرانِ بے بال و پر تک
بہت میر برہم جہاں میں رہیں گے
اگر رہ گئے آج شب کی سحر تک

۱۲۰۳

بر ریز جلوں اس کا سارا جہاں ہے یعنی ساری ہے وہ حقیقت جاوے نظر جہاں تک
واماندہ نقش پا سے یک دشت ہم ہیں بیکس دشوار ہے پہنچنا اب اپنا کارواں تک
ان جلتی ہڈیوں پر ہرگز ہُما نہ بیٹھے
پہنچی ہے عشق کی تب اے میر استخواں تک

۱۲۰۴

دل کا جگر کا لوہو تو غم نے سُکھا دیا
آنکھیں رہیں گی دیکھیے خوں بار کب تلک

ت

۱۱۹۲

اس کے سونے سے بدن سے کس قدر چسپاں ہے ہائے
جامہ کبرِیتی کسو جی کا جلاتا ہے بہت
کیا پس از چندے مری آوارگی منظور ہے
مو پریشاں اب جو شب مجھ پاس آتا ہے بہت

۱۱۹۳

چشمکِ گل کا لطف بھی نہ اُٹھا — کم رہا موسم شباب بہت
دیر بھی کچھ لگی نہ مرتے ہمیں — عمر جاتی رہی شتاب بہت
ڈھونڈتے اس کو کوچے کوچے پھرے — دل نے ہم کو کیا خراب بہت
چلنا اپنا قریب ہے شاید
جاں کرے ہے اب اضطراب بہت

۱۱۹۴

میرؔ کی بدحالی شب مذکور تھی — کڑھ گئے یہ حال سُن کر ہم بہت

چ

۱۱۹۵

اس غصیلے کی سرخ آنکھیں دیکھ — اُٹھے آشوب خانقاہ کے بیچ

۱۱۹۶

صاف میداں لامکاں سا ہو تو میرا دل کھلے — تنگ ہوں معمورۂ دنیا کی دیواروں کے بیچ

۱۱۹۷

رونق و آبادئ ملک سخن ہے اس تلک — ہوں ہزاروں دم الٰہی میرؔ کے اک دم کے بیچ

ر

۱۱۹۸

دل کی آفت ہے آئی جانوں پر — یہ فسانہ رہا زبانوں پر
عرش و دل دونوں کا ہے پایہ بلند — سیر رہتی ہے لامکانوں پر

۱۲۱۱

آزردہ، دل شکستہ خاطر کبیدہ مردم
وہ دیکھے ہم کو آکر جن نے نہ دیکھے ہوویں

۱۲۱۲

اجڑی اجڑی بستی میں دنیا کی جی لگتا نہیں
تنگ آئے ہیں بہت ان چار دیواروں میں ہم
دھوپ میں جلتے ہیں پھر آگے اس کے میر جی
رفتگی سے دل کی ٹھہرے ہیں گنہ گاروں میں ہم

ن

۱۲۱۳

ربط باہم ہے کوئی دن کا یاں
پھر زمانے میں کہاں تم ہم کہاں
گم ہوا ہوں یاں سے جا کر میں جہاں
کچھ نہیں پیدا کہاں میرا نشاں
تو کہے واں ناگہاں بجلی گری
وہ نگاہِ تند کرتا ہے جہاں
کیا چھپی ہیں باتیں میرے عشق کی
داستاں در داستاں ہے داستاں

۱۲۱۴

سعی دشمن کو نہیں دخل مری ایذا میں
رنج سے عشق کے میں آپ ہی کھپا جاتا ہوں
مجلسِ یار میں تو بار نہیں پاتا ہوں
در و دیوار کو احوال سنا جاتا ہوں
یک بیاباں ہے مری بے کسی و بیتابی
مثلِ آوازِ جرس سب سے جدا جاتا ہوں

۱۲۱۵

نہ سمجھو مجھے بے خبر اس قدر
نہ دل سے لوگوں کے آگاہ ہوں

۱۲۱۶

تماشا دیکھنا منظور ہو تو مل فقیروں سے
کہ چٹکی خاک کو لے ہاتھ میں اکسیر کرتے ہیں

۱۲۱۷

حزیں آواز ہے مرغ چمن کی کیا جنوں آور
نہیں خوش زمزمہ ویسا ہماری ہم صفیری میں

ل

۱۲۰۵

یک توجہ میں رہے ہے سیر اس کی عرش پر — عقل میں آتے نہیں ہیں طرفہ طرفہ کارِ دل
تنگی و وسعت سے اس کی ہے عبادت سازِ فہم — میرؔ کچھ سمجھے گئے نہ معنی اسرارِ دل

۱۲۰۶

موسم گئے نشاں بھی کہیں پتّے کا نہ تھا — کی شوق کشتگاں نے عبث جستجوئے گل
مدّت ہوئی کہ دیکھا تھا سیرِ چمن میرؔ — پھرتا ہے اب تلک مری آنکھوں میں روئے گل

۱۲۰۷

اسیری میں تو کچھ واشد کبھو تھی — رہا غمگیں ہوا جب سے رہا دل
خموشی مجھ کو حیرت سے ہے ورنہ — بھرے ہیں لب سے لے کر شکوے تا دل

م

۱۲۰۸

کھا گئے یاں کے فکر سو موہوم — واں گئے کیا ہو، کچھ نہیں معلوم
جب غبار اپنے دل کا نکلے ہے — دیر رہتی ہے آندھی کی سی دھوم
ہے عبث یہ تردّد و تشویش
پہنچے ہے وقت پر جو ہے مقسوم

۱۲۰۹

عشق کیا ہے اُس گل کا یا آفت لائے سر پر ہم
جھانکتے اُس کو ساتھ صبا کے صبح پھریں ہیں گھر گھر ہم
شعلہ ایک اٹھا تھا دل سے آہ عالم سوز کا میرؔ
ڈھیری ہوئی ہے خاکستر کی جیسی شب میں جل کر ہم

۱۲۱۰

بہلانے کو دل باغ میں آئے تھے سو بلبل
چلّانے لگی ایسے کہ بیزار ہوئے ہم

و

۱۲۲۶

زمانے نے دشمن کیا یار کو   سلایا مرے خوں میں تلوار کو
کھلی رہتی ہے چشم آئینہ ساں   کہاں خواب مشتاق دیدار کو
مرے منھ پہ رکھا ہے رنگ اب تلک
ہزار آفریں چشمِ خوں بار کو

۱۲۲۷

کن نے کہا کہ مجھ سے بہت کم ملا کرو   منت بھی میں کروں تو نہ ہرگز منا کرو
عنقا سا شہرہ ہوں پہ حقیقت میں کچھ نہیں   تم دور ہی سے نام کو میرے سُنا کرو
ہم بے خودانِ مجلسِ تصویر اب گئے
تم بیٹھے انتظار ہمارا کیا کرو

۱۲۲۸

تھا یہی سرمایۂ بحرِ بلا پچھلے دنوں   چشم کم سے دیکھو مت اس دیدۂ پُرآب کو
کیا سفیدی دیکھی اُس کی آستیں کے چاک سے   جس کے آگے رُو نہ تھا کچھ پرتوِ آب کو
دم بخود رہتا ہوں اکثر سر رکھے زانو پہ میر
حال کہہ کر کیا کروں آزردہ اور احباب کو

۱۲۲۹

فکر سے اپنے گزرتا ہے زمین کاوی میں دن   رات جاتی ہے ہمیں گِنتے ہوئے تاروں کو
زندگی کرتے ہیں مرنے کے لیے اہلِ جہاں   واقعہ میر ہے درپیش عجب یاروں کو

۱۲۳۰

روز دفتر لکھے گئے یاں سے   اُن نے یک حرف بھی لکھا نہ کبھو
گو شگفتہ چمن چمن تھے گل   غنچۂ دل تو وا ہوا نہ کبھو
طور کی سی تھی صحبت اس کی مری
جھمکی دکھلا کے پھر ملا نہ کبھو

۱۲۱۸

اب دیکھیں آہ کیا ہو ہم وے جدا ہوئے ہیں   بے یار و بے یار و بے آشنا ہوئے ہیں
اہل چمن سے کیوں کر اپنی ہو روشناسی   برسوں اسیر رہ کر اب ہم رہا ہوئے ہیں

۱۲۱۹

شاید بہار آئی ہے دیوانہ ہے جواں   زنجیر کی سی آتی ہے جھنکار کان میں
اب میرے اس کے عہد میں شاید کہ اُٹھ گئی   آگے جو رسم دوستی کی تھی جہان میں
تارے تو یہ نہیں مری آہوں سے رات کی
سوراخ پڑ گئے ہیں تمام آسمان میں

۱۲۲۰

آئے ہیں میر کافر ہو کر خدا کے گھر میں   پیشانی پر قشقہ زنار ہے کمر میں
عالم میں آب و گل کے کیوں کر نباہ ہوگا   اسباب گر پڑا ہے سارا مرا سفر میں

۱۲۲۱

آگ کا لائحہ ظاہر نہیں کچھ لیکن ہم   شمع تصویر سے دن رات جلا کرتے ہیں
واں سے یک حرف و حکایت کبھی نہیں لایا کوئی   یاں سے طومار کے طومار چلا کرتے ہیں

۱۲۲۲

ناآشنا کے اپنے جیسے ہم آشنا ہیں   اس طور اس طرح کے ایسے کم آشنا ہیں

۱۲۲۳

کیا جنوں ہے تم کو جو تم طالب ویرانہ ہو   جس کو فردوس بریں کہتے ہیں وا آدم کہاں

۱۲۲۴

کچھ ڈر نہیں جو داغِ جنوں ہو گئے سیاہ   ڈر دل کے اضطراب کا ہے اس بہار میں

۱۲۲۵

سب گئے دل دماغ تاب و تواں   میں رہا ہوں سو کیا رہا ہوں میں
برق میں نہ تھا کہ جل بجھتا   ابرِ تر ہوں کہ چھا رہا ہوں میں
اس کی بیگانہ وضعی ہے معلوم   برسوں تک آشنا رہا ہوں میں
اس کی گرد سمند کا مشتاق   آنکھیں ہر سو لگا رہا ہوں میں

۱۲۳۷

نظر آتا تھا صبح دور سے وہ　　　پھر چھپا خور سا اپنے نور سے وہ
خوش ہیں دیوانگیٔ میرؔ سے سب　　　کیا جنوں کر گیا شعور سے وہ

۱۲۳۸

دل ہے میری بغل میں صد پارہ　　　اور ہر پارہ اس کا آوارہ

ی

۱۲۳۹

آنکھ کھلتے ہی گھر گئے وے تو　　　ہم ستم دیدہ خانماں سے گئے

۱۲۴۰

عشق میں ہم نے جاں کنی کی ہے　　　کیا محبت نے دشمنی کی ہے
کیسی سرخ و سفید نکلی تھی　　　مے مگر دخترِ ارمنی کی ہے

۱۲۴۱

خضر دشتِ عشق میں مت جا کہ واں　　　ہر قدم مخدوم خوفِ شیر ہے
میں ہوں تو ہے درمیاں شمشیر ہے　　　سفک دم میں میرے اب کیا دیر ہے
کچھ نہیں جان ان کی پیشِ تارِ مو　　　گھر میں رنگوں رنگوں کے اندھیر ہے
طائروں نے گل فشاں کی میری گور　　　سامنے پھولوں کا گویا ڈھیر ہے

آنچل اس دامن کا ہاتھ آتا نہیں
میرؔ دریا کا سا اس کا پھیر ہے

۱۲۴۲

جو جنون و عشق کی تدبیر ہے　　　سوزیاں شمشیر نے زنجیر ہے
وصف اس کا باغ میں کرنا نہ تھا　　　گل ہمارا اب گریباں گیر ہے
رکھ نظر میں بھی خراب آبادیاں　　　اے کہ تجھ کو کچھ غمِ تعمیر ہے

دیکھ رہتا ہے جو دیکھے ہے اسے
دلربا آئینہ رو تصویر ہے

۱۲۳۱

آنکھیں غصے میں ہو گئی ہیں لال سر کو چھاتی پہ رکھ کے جواب کرو
فرصتِ بود و باش یاں کم ہے کام جو کچھ کرو شتاب کرو
محوِ صورت نہ آرسی میں رہو اہلِ معنی سے ٹک حجاب کرو
جھوٹ اس کا نشان نہ دو یارو ہم خرابوں کو مت خراب کرو
منھ کھُلے اس کے چاندنی چھٹکی
دوستو، سیرِ ماہتاب کرو

۱۲۳۲

بس اب بن چکے روے و موئے سمن بو گری ہو کے بے ہوش مشّاط یک سو
ہوا ابر و سبزے میں چشمک ہے گل کی کریں ساز ہم برگ عیش لب جو
بہار آئی گل پھول سر جوڑے نکلے
رہیں باغ میں کاش اس رنگ ہم تو

۱۲۳۳

لکھے ہے کچھ تو کج کر چشم و ابرو براتِ عاشقاں بر شاخ آہو

۱۲۳۴

آزاد پر شکستہ کو صد رنگ قید ہے یا رب اسیر ایسا قفس سے رہا نہ ہو
کھولے ہے آنکھ اس کے گل رو پہ ہر سحر غالب کہ میری آئینے کی اَب صفا نہ ہو

ہ

۱۲۳۵

لکنت سے کیا نکلتی نہیں اس کے منھ سے بات چپکا ہے صرف یار کے شیریں دہن کے ساتھ
جی پھٹ گیا ہے رشک سے چسپاں لباس کے کیا تنگ جامہ لپٹا ہے اس کے بدن کے ساتھ

۱۲۳۶

مدّت ہوئی موئے گئے ہم کو پر اب تلک اُڑتی پھرے ہے خاک ہماری صبا کے ساتھ
منھ اپنا اُن نے عکس سے اپنے چھپا لیا دیکھا نہ کوئی آئینہ رُو اس حیا کے ساتھ

۱۲۴۸

ویرانیٔ بدن سے مزاجی بھی ہے اداس منزل خراب ہووے تو مہمان کیا رہے
جب سے جہاں ہے تب سے خرابی یہی ہے میرؔ تم دیکھ کر زمانے کو حیران کیا رہے

۱۲۴۹

رکنے سے میرے رات کے سارا جہاں رکا آئے نسیم صبح کہ اک دم ہوا کرے

۱۲۵۰

نکلی جو تھی تو بنت عنب عاصمہ ہی تھی اب تو خراب ہو کے خرابات بھی گئی
پھرتے ہیں میرؔ خوار کوئی پوچھتا نہیں اس عاشقی میں عزت سادات بھی گئی

۱۲۵۱

گل نے بہت کہا کہ چمن سے نہ جائیے گلگشت کو جو آئیے آنکھوں پہ آئیے
میں بے دماغ کر کے تغافل چلا گیا وہ دل کہاں کہ ناز کسو کے اٹھائیے

۱۲۵۲

دل میں مسودے تھے بہت پر حضورِ یار نکلا نہ ایک حرف بھی میری زبان سے
اول زمینیوں میں ہو مائل مری طرف جو حادثہ نزول کرے آسمان سے

زنبور خانہ چھاتی غم دوری سے ہوئی
وے ہم تلک نہ آئے کبھو کسرِ شان سے

۱۲۵۳

کہو سو کریے علاج اپنا طپیدنِ دل بلائے جان ہے
نہ شب کو مہلت نہ دن کو فرصت دمادم آنکھوں سے خوں رواں ہے

۱۲۵۴

سر راہ چندے انتظاری رہے بھلا کب تلک بے قراری رہے
رہا ہی کیے آنسو پلکوں پہ شب کہاں تک ستارہ شماری رہے

شب وصل تھی یا شب تیغ تھی
کہ لڑتے ہی وے رات ساری رہے

۱۲۴۳

بال و پر بھی گئے بہار کے ساتھ اب توقع نہیں رہائی کی
خندۂ یار سے طرف ہو کر برق نے اپنی جگ ہنسائی کی
کچھ مروّت نہ تھی ان آنکھوں میں دیکھ کر کیا یہ آشنائی کی
کوہکن کیا پہاڑ توڑے گا عشق نے زور آزمائی کی
اک نگہ میں ہزار جی مارے
ساحری کی کہ دل رُبائی کی

۱۲۴۴

زمیں اور ہے آسماں اور ہے تب آنا فانا سماں اور ہے
نہ وے لوگ ہیں اب نہ اجماع وہ جہاں نہیں یہ جہاں اور ہے
نہ ان لوگوں کی بات سمجھی گئی یہ خلق اور ان کی زباں اور ہے
ہوا رنگ بدلے ہے ہر آن میرؔ
زمین و زماں ہر زماں اور ہے

۱۲۴۵

ہم آپ سے جو گئے ہیں گئے ہیں موت سے الٰہی اپنا ہمیں کب تک انتظار رہے
ہوس اسیروں کے ٹک دل کے نکلے کچھ شاید کوئی دن اور اگر موسم بہار رہے
اٹھا جو باغ سے میں بے دماغ تو نہ پھرا ہزار مرغ گلستاں پکار رہے
تکوں ہوں ایک سا میں گرد راہ کو اُس کی
نہ کیونکہ دونوں مری آنکھوں میں غبار رہے

۱۲۴۶

جس آنکھ سے دیا تھا ان نے فریب دل کو اس آنکھ کو جو دیکھا اب آشنا نہیں ہے
میں برگ بند اگرچہ زیر شجر رہا ہوں فقر مکب سے لیکن برگ و نوا نہیں ہے

۱۲۴۷

جو لوگ چلتے پھرتے یاں چھوڑ کر گئے تھے دیکھا نہ ان کو اب کے آئے جو ہم سفر سے
چھاتی کے جلنے سے ہی شاید کہ آگ سلگی اٹھنے لگا دھواں اب میرے دل و جگر سے

۱۲۶۰

پھرتے ہو کیا درختوں کے سائے میں دور دور ۔۔۔ کر لو موافقت کسو بے برگ و ساز سے
کرتا ہے چھید چھید ہمارا جگر تمام ۔۔۔ وہ دیکھنا ترا مژۂ نیم باز سے

۱۲۶۱

تم کرو شاد زندگی کہ مجھے ۔۔۔ دل کے خوں ہونے کا بہت غم ہے
جب سے عالم میں جلوہ گر ہے تو ۔۔۔ جھلکے میں تمام عالم ہے

۱۲۶۲

رہنے کی کوئی جاگہ شاید نہ تھی انھوں کی ۔۔۔ جو یاں سے اٹھ گئے ہیں وے پھر کبھو نہ آئے

۱۲۶۳

ہم کبھو غم سے آہ کرتے تھے ۔۔۔ آسماں تک سیاہ کرتے تھے
کیا زمانہ تھا وہ جو گزرا میر ۔۔۔ ہم دگر لوگ چاہ کرتے تھے

۱۲۶۴

کیونکہ راہِ فنا میں بیٹھے گا ۔۔۔ جرم بے حد سے ہے گراں باری
میر چلنے سے کیوں ہو غافل تم ۔۔۔ سب کے ہاں ہو رہی ہے تیاری

۱۲۶۵

وصل و فراق دونوں بے حالی ہی میں گزرے ۔۔۔ اب تک مزاج کی میں پاتا نہیں بحالی

۱۲۶۶

چھوڑ کر معمورۂ دنیا کو جنگل جا بسے ۔۔۔ ہم جہانِ آب و گل میں خانہ سازی خوب کی

۱۲۶۷

اس سخن رس سے اگر شب کی ملاقات لیے ۔۔۔ بات رہ جائے نہ یہ دن رہیں نے رات لیے

۱۲۶۸

میں اک نگاہ کا ہے خوش رو کوئی نہ دیکھا ۔۔۔ الفت رہی ہے جس سے اس ہی کا ڈر رہا ہے
یہ کارواں سرا تو رہنے کی گوں نہ نکلی ۔۔۔ ہر صبح یاں سے ہم کو عزمِ سفر رہا ہے
کیا پھر نظر چڑھا ہے اے میر کوئی خوش رو
یہ زرد زرد چہرہ تیرا اتر رہا ہے

۱۲۵۵

وہ دل نہیں رہا ہے نہ اب وہ دماغ ہے — جی تن میں اپنے بجھتا سا کوئی چراغ ہے

یارب رکھیں گے پنبہ و مرہم کہاں کہاں — سوز دروں سے ہائے بدن داغ داغ ہے

مدت ہوئی کہ زانو سے اٹھتا نہیں ہے سر — کڑھنے سے رات دن کے ہمیں کب فراغ ہے

گھر گھر پھرے ہیں جھانکتے ہم صبح جوں نسیم — پردے میں کوئی ہے کہ یہ اس کا سراغ ہے

صولت فقیری کی نہ گئی مر گئے پہ بھی

اب چشم شیر گور کا میری چراغ ہے

۱۲۵۶

طبیعت نے عجب کل یہ ادا کی — کہ ساری رات وحشت ہی رہا کی

گیا تھا رات دروازے پہ اس کے — فقیرانہ دعا کر جو صدا کی

۱۲۵۷

ہم رو روکے درد دل دیوانہ کہیں گے — جی میں ہے کہو حالِ غریبانہ کہیں گے

سودائی و رسوا و شکستہ دل و خستہ — اب لوگ ہمیں عشق میں کیا کیا نہ کہیں گے

ویرانے کو مدت کے کوئی کیا کرے تعمیر — اُجڑی ہوئی آبادی کو ویرانہ کہیں گے

موقوف غم میرؔ کہ شب ہو چکی ہمدم

کل رات کو پھر باقی یہ افسانہ کہیں گے

۱۲۵۸

مدت سے پلائے چنار رہے ہیں مدت گلخن تابی کی

برسوں ہوئے ہیں گھر سے نکلے عشق نے خانہ خرابی کی

جام گلوں کے خزاں میں نگوں ہیں نکہت خوش بھی چمن سے گئی

مے شاید کہ تمام ہوئی ہے ہر غنچے کی گلابی کی

۱۲۵۹

اب نہ حسرت رہے گی مرنے تک — موسم گل میں ہم اسیر ہوئے

نہ ہوئے ہم نظیری سے یوں تو — شعر کے فن میں بے نظیر ہوئے

قصائد

۱۲۶۹

چرخ پر اپنا مدار دیکھیے کب تک رہے
ایسی طرح روزگار دیکھیے کب تک رہے

لب پہ مرے آن کر بارہا پھر پھر گئی
جان کو یہ اضطرار دیکھیے کب تک رہے

اس سے تو عہد و قرار کچھ بھی نہیں درمیان
دل ہے مرا بے قرار دیکھیے کب تک رہے

آنکھیں تو پتھرا گئیں تکتے ہوئے اس کی راہ
شام و سحر انتظار دیکھیے کب تک رہے

روئے سخن سب کا ہے میری غزل کی طرف
شعر ہے میرا شعار دیکھیے کب تک رہے

گیسو و رخسارِ یار آنکھوں ہی میں پھرتے ہیں
میرؔ یہ لیل و نہار دیکھیے کب تک رہے

۱۲۷۰

گئے ان قافلوں سے بھی اٹھی گرد
ہماری خاک کیا جانیں کہاں ہے

۱۲۷۱

شکر و گلہ صنم کدے کا حرف حرف میرؔ
کعبے کے رہنے والوں کو ارقام چاہیے

۱۲۷۲

آنکھیں پتھرائیں چھاتی پتھر ہے
وہ ہی جانے جو انتظار کرے

۱۲۷۳

گل بکھرے لال میرے قفس پر خزاں کے بعد
شاید کہ اب بہار کے ایّام بھی چلے

سایہ سی اُس کے پیچھے لگی پھرتی ہے پری
وہ کیا جو آگے یار کے دو گام بھی چلے

یہ راہِ دورِ عشق نہیں ہوتی میرؔ طے
ہم صبح بھی چلے گئے ہیں شام بھی چلے

۱۲۷۴

اب دشتِ عشق میں ہیں ہم تنگ آئے جان سے
آنکھیں ہماری لگ رہی ہیں آسمان سے

پڑتا ہے پھول برق سے گلزار کی طرف
دھڑکے ہے جی قفس میں غمِ آشیان سے

یک دست جوں صدائے جرس بیکسی کے ساتھ
میں ہر طرف گیا ہوں جُدا کاروان سے

۱۲۷۵

گلبرگ سی زباں سے بلبل نے کیا فغاں کی
سب جیسے اڑ گئی ہے رنگینی گلستاں کی

...

قصیدہ در منقبت حضرت علی مرتضیٰ

جب سے خورشید ہوا ہے چمن افروزِ حمل
رنگِ گل جھمکے ہے ہر پات ہرے کے اوجھل
وقت وہ ہے کہ زبس شوق سے چشم بلبل
خوبی دل کش گل دیکھنے کو ہو احول
جوشِ گل یہ ہے جہاں تک کرے ہے کام نظر
لالہ و نرگس گل سے ہیں بھرے دشت و جبل
لطفِ روئیدگی مت پوچھ کہ میں شبہے میں ہوں
سبزہ غلطاں ہے لبِ جُو پہ کہ خواب مخمل
چشم رکھتا ہے تو چل فیضِ ہوا کو ٹک دیکھ
نرگس اگتی ہے جہاں بوئی تھی دہقاں نے فصل
سیر کر تازگی و خرمی و شادابی
خشک بھی شاخ نے اب سبز نکالی کوپل
خون خمیازہ کش عاشقی و پنجۂ گل
دونوں نکلے ہیں تہ خاک سے اب دست و بغل
برگ گل فیض ہوا کرتا ہے ہرا اخگر کو
آگ کی گر کہیں سلگا کے رکھے ہیں منقل

بیت بخشی کے تئیں مرغِ چمن آئے ہزار
کسو گل بن کے تلے آپ بھی اب پڑھیے غزل

مطلعِ ثالث

اے کہ اک تو ہی ہوا عالمِ اسرارِ ازل
اے کہ سو جان سے عاشق ہے ترا حسنِ عمل
تری وہ ذات مقدس ہے کہ لیتے ہوئے نام
منھ سے ناخواستہ کبھی صل علےٰ جائے نکل
تیری درگاہ میں جبریل کے پر کیوں نہ جلیں
یہیں ہے نورِ جلالی خدائے عزّ و جل
مرحبا شاہی تیری صل علےٰ جاہ ترا
کہ ہوا تخت ترا دوشِ نبیؐ مرسل
جی میں گزرے بھی تو نکلے ہے ترے درس کے بیچ
معنیٔ تازہ سے بدلا ہوا لفظِ مہمل
رفعِ بدعت پہ جب آوے تری طبعِ اقدس
کیا عجب شعلۂ آواز سے جل جائے رسل
حالتِ نزع میں گر نام زباں پر ہو ترا
یک رمق جاں حیاتِ ابدی سے ہو بدل
بس کہ غالب ہے ترا سعد ستارا ہے عجیب
پہنچے گر حشر تلک نوبتِ شاہی زحل
کیا ترے کشفِ بیاں کرنے کی کہیے تاثیر
طبع گو ہندہ پہ یاں حال ہوا مستقبل
حبّذا حق سے یہ نسبت کہ رہی بھی موقوف
تجھی پر مصلحتِ کارِ خداوند اجل

مطلعِ اربع

میان سے جب کہ گھسیٹی اُدھراں سے تلوار
باعثِ تیرگیِ چشم تھی وہ برقِ اجل

مطلع ثانی

نکلے ہے لالہ زبس چاک کر اب سینۂ تل
آتشِ گل سے جلا کرتا ہے سارا جنگل
تیرگی اپنے ستارے کی ہے سب پر روشن
آفتاب آوے ہے یاں دن کو جلا کر مشعل
آمدِ گریہ قیامت ہے اگن میں جی کی
مارے ڈالے ہے یہ برسات ہماری کی کہل
غنچۂ خام کو جوں پھونک سے کھولے ہے طفل
یوں بھی کر دیکھا ہے پہ دل عقدہ ہے مالا نحل
تو یونہی کھینچے ہے یہ نقش بر آب اے منعم
کیسی محبوب گئیں صورتیں اس خاک میں رل
کیا ہیں اندھیر فلک کے کہ نہیں ملتی داد
روز خورشید نکلتا ہے جلا کر مشعل
جو ہے سو دست بہ دل خاک بسر ہے اس سے
میں بھی نکلوں ہوں سدا منھ پہ کفِ خاک کو مل
پنجۂ خور کو زر اندوز کیا اُن نے جسے
مرتعش باندھے ہیں اکثر شعرا بعضے شل
سرخ رہتی ہے مژہ خط شعاعی سی ہنوز
چشمِ خورشید سے کھوئی نہ کبھو ان نے سبل
دردِ سر یں ہے جو موجود ہے درد اس کے ہیں
صبح نکلے ہے سدا ماتھے کو مل کر صندل

قصیدہ در مدح علی مرتضیٰ[1]

مر گیا فراق میں پر اب یہ کیا ہے ظلم — جیتی گڑی ہے ساتھ مرے حسرت وصال

آیا ہے یاد قیس بہت اب کہ ہوں بتنگ — اس کے بھلاوے مجھ کو نہیں چھوڑتے غزال

رنگ اڑ گیا تبھی کہ ہوا تجھ سے چہرہ گل — رکھے ہے اب نسیم کی سیلی سے مجھ کو لال

خوش قامتی کے آہ کو کب پہنچتا ہے سرو — ہے یہ تو باغ رنگِ شکستہ کا نونہال

حسرت بسا ہی جان کو اپنی تمام عمر — ٹک چشم آئینہ سے دیکھ کر جمال

یک روز بے نقاب ہوا تھا تو صبح کو — اب تک ہے آفتابِ جہاں تاب پر زوال

تھی سیر ترے کوچے میں عشاق کی معاش — کتنے شکستہ دل تھے بہت تھے خراب حال

جتنے غرض تھے سب کو یقین تھا کہ مر چکے — کوئی نہ تھا کہ جس کو ہو جینے کا احتمال

کب تک صفت بتوں کی خدا سے تو خوف کر — اے طبع راہ نہ اتنی بھی پابندِ خط و خال

بخشش سے جس کی حرف طلب محو ہو گیا
کم اس کے وقت میں ہے بہت، نوبتِ سوال

مطلع ثانی

شاہا ترا غلام ہو اک اور اک طرف — سنگیں ہو فوجِ دشمن اگر کوہ کی مثال

تیر و کماں کو ہاتھ میں لے جب ہو سامنے — ہے اس کو اپنے زورِ شجاعت سے یہ کمال

جس دم کہ زورِ بازو سے آ کر لگا وے تیر — پھوٹیں وہ سارے ہو ویں اگر آہنی خیال

در ہی آ گئی یک بار صف اعدا میں
ایک دو ہاتھ کے چلنے میں پڑی یہ ہل چل
جمع ہو آیا تھا اس ایک پر جم غفیر
اکثر اس میں سے گئے مارے کچھ ایک بھاگے دہل
کرکے سرگوشی جسے پوچھتے ہیں بھاگے ہوئے
آتی ہے غیب سے آواز ہوا وہ فیصل
رہے یا خالی ہے میدان مگر اس کی تیغ
اژدہا تھی کہ گئی خلق کو یک دم میں نگل
چھوٹے ہے زخم سے ہر ایک کے فوّارۂ خوں
ہر طرف دشت میں جاری ہے لہو کی جدول
کیا لکھوں اسپ سبک سیر کی اس کے تعریف
ادہم خامہ بھی لکھتے ہوئے جاتا ہے اچھل
اس فلک سیر کا میدان مقرر ہے گا
تگ و پو یہ کے لیے اثنائے ابد از ازل
آ گیا اس میں نظر جانا کسو شخص کو تو
مارتے پل کے گیا اس کو چھلاوا سا چھل
جان یہ ہے ترے گھوڑے میں کہ تا روزِ جزا
گرد کو اس کے نہ پہنچے گی کبھی اس کی اجل
آبلے جیسے ستارے ہیں مرے دل کے بیچ
بس کہ اس چرخ سیہ رو سے رہا ہوں میں جل

قصیدہ در مدح علی مرتضیٰ رضؓ

دل میں نہیں ہے قطرۂ خوں آنکھیں ہیں گی تر
خالی پڑا ہے شیشۂ مے بھر رہے ہیں جام

ناکامیوں سے کام رکھا ہے تمام عمر
گو کامِ دل حصول نہ ہو مجھ کو کیا ہے کام

اے رشکِ ماہِ عید نہ کر انتظار کش
مکھڑا دکھاوے چاند سا ٹک آکے پشتِ جام

زنجیر پا ہے اس کی تری زلف غالباً
مدت ہوئی نسیم نہیں کرتی اتہام

چلتا ہے تو تو جاتے ہیں کتنوں کے جی چلے
آب کسو کی مان، لے موقوف کر خرام

آوارگی سے دل ہی کی آسودگی کو چھوڑ
ناموسِ عافیت کو اڑا کیسا ننگ و نام

گر جانتا مژہ کو تری تیغ کیں تو میں
دو چار جانیں اور بھی کر لاتا قرضِ دام

رونے کا تار باندھ تفرج نہیں ہے خوب
ہے آنسوؤں کا سلک گوہر کا سا انتظام

اک دم تری گلی میں گیا تھا میں سیر کو
لبریز بوئے خوں سے ہے اب تک مرا مشام

صیاد نے اسیر کیا مجھ کو پر عبث
میں ٹک جیا نہ فرطِ تپیدن سے زیرِ دام

آنکھوں سے اس کی چشمِ وفا میر ہے غلط
وحشی ہیں یہ غزال، نہ ہوں گے کسی کے رام

اے طبع اتنی ہرزہ درائی جرس کی طرز
اس گفتگو کا فائدہ کہ ہے حاصلِ کلام

یعنی امیر شاہ نجف کی صفت پر آ
وہ شاہ جس پہ سارے کمالات ہیں تمام

وہ شاہ ہے کہ بعد نبیؐ کے وہی ہے پھر
وہ شاہ ہے کہ حق ہے وہی اولیں امام

گر چاہے دل گرفتہ جہاں میں نہ ہو کوئی
کر دے یہ ننگ غنچۂ پیکاں کو ابتہام

ورنہ شگفتگی یہ بلائے عظیم ہے
چھوڑے نہ زخم سینۂ عاشق تک القیام

یوں دیکھ ایک دو کو کنارا کرے شتاب — میدانِ کارزار سے رستم بہ رنگِ زال
شیر و فلک کو راہ بھلادیوے وہ دھمک — اس زلزلے میں گاؤ زمیں سیکھ جاوے چال
نعرے سے اس کے لیویں بہت یوں رہِ گریز — بھاگے ہیں جیسے شیر کی آواز سے شغال
زخم اس کے ہاتھ کا جو لگے یہ نہ ہو کبھی — مٹ جائے کائنات مگر تب ہو اندمال
تر ہو گئی ہے بس کہ لہو میں گل زمیں — گر خشک ہووے خاک کہیں بعد ماہ و سال
ہو پھر گزار باد صبا سے یہ واں کا رنگ
اڑتا ہے جیسے ہولی کے ایام میں گلال

مطلع ثالث

لائق تری صفت کے صفت میری ہے محال — آشفتہ طبع شاعر خستہ کی کیا مجال
تو وہ درِ مدینۂ علم علیم ہے — جس شخص کو نہ آوے الف بجتے دال ذال
آوے تری جنابِ مقدس میں ایکدم — کرتے ہیں واں تو وقف سبھی طرز کے مقال
عالم ہو اس قدر کہ بیاں کیا کرے کوئی — پھر بحث اس سے عقلِ فلاطون پہ ہے دال
پھر بعد مرگ حوض پہ کوثر کے یا علیؓ — جا گہ میری ہو حشر کی تیری صفِ نعال
جب ہوں میں گرم راہ ترے سائے میں شہا — ہو جاوے سرد آتشِ دوزخ کی اشتعال
جب تک جیے گا محو ثنا ہی رہے گا میرؔ — ہے تیری منقبت سے نپٹ اس کو اشتغال
ہو وے حرام تیرے محبّوں کو دردِ غم
شمشیر دوستاں پہ ہو خونِ عدو حلال

قصیدہ در مدح حضرت امام حسینؑ

خراب کوہ و بیابان بے کسی ہوں میں
بہ رنگ صوت جرس ہر طرف ہے میر اگذار

بغیر خوردنِ خوں کب نہار ٹوٹے ہے
سوائے گریۂ صبح اب کہاں ہے آب خمار

لگیں نہ داغ سو کیوں پھیکے میرے سینے پر
نمک نہیں نظر آتا بجز رُخِ دلدار

سو وہ بھی دیکھنا ملتا نہیں ہے گھر بیٹھے
مگر ہوں ہند میں رسوائے کوچہ و بازار

سوائے نالۂ جاں سوز کون ہے دلسوز
بغیر آہِ سحر گاہ کون ہے غم خوار

جنوں میں جب سے خوش آیا لباس عُریانی
نہیں ہے دامن صحرا میں تب سے مجھ کو قرار

عجب ہے مجھ کو جو تُو دیکھنے نہیں آتا
رہا ہوں ایک تری انکھڑیوں کا میں بیمار

ہوا ہوں جورِ فلک سے نپٹ ہی زار و نزار
پہنچیو یا خلف الصدق حیدر کرّار

کرے ہے فخر بہت اوج پر فلک شاہا
رضا جو ہو تو کروں تیرے روضے کا بستار

کہ انفعال ہو لاف و گزاف سے اس کو
زمیں ہے صحن کی جس کے یہ گنبد دوّار

کہے ہے جو ہر اوّل نگاہ جس ساعت
تو ایک ہاتھ سے تھانبے سر او پر دستار

امام ہر دو جہاں جس کی آستاں کی خاک
رکھے ہے رتبۂ کحل جواہر الابصار

زہے وہ روضہ جہاں دیدۂ ملک میں فرش
قدم کو رکھتے ہوئے اُن پہ آتے ہیں زوّار

اگر طلوع ہو خور سامنے اس کے
ہر ایک ذرّے کو واں کے ہے یہ لبِ گفتار

کوئی کہے یہ کیا شوخ چشم شپّر ہے
کوئی کہے کہ یہ ہے مُوش کور ناہموار

لیا ہے روز سیہ نے بہت اسے گھیرا
چلی ہے چھوڑ کے حیراں ہو رخنۂ دیوار

مطلع ثانی

شاہا ترے گدا کا ہے مشہور احتشام
شاہانِ سرفراز ہیں سب اس کے پائے نام

ہو اسپ پر سوار کرے عزم جنگ اگر
میدان کار زار میں ادنیٰ ترا غلام

جولاں کرے جدھر کو ہے اس طرف نہ خاک
اڑ جائے خاک ادھر کی جدھر کو پھرے لگام

پامال اس قدر ہوں کہ معلوم بھی نہ ہوں
افراسیاب کون ہے، رستم ہے یاں کدام

شمشیر اس کی خرمنِ اعدا کی ہے جو برق
آوے جو اس کے ہاتھ میں یک لحظہ بے نیام

شاہا ترے غلام کے حملے کی کس کو تاب
گو پہلواں ہزاروں لیے آئے اس پہ سام

وہ سام بن نریماں کہ اب تک جہاں کے بیچ
افسانے اس کے زور کے کرتے ہیں دھوم دھام

ایک ایک کو زمین میں دے گاڑ اس سمیت
تحت الثریٰ کو جائے مع اپنے اژدہام

طبقہ زمیں کا جائے اکھڑ اس کے زور سے
چنداں عجب نہیں کہ ہوا ہووے تیرہ فام

از بس اڑے ہے خاک جدھر دیکھو تس طرف
جاتے ہیں کور چشم تماشائی ہو عوام

مطلع ثالث

تو ہے کہ تجھ کو ذات خدا سے ہے ربط خاص
تو ہے کہ ساری خلق پر تیرا ہے فیضِ عام

تو ہے کہ تیرے مہر کے سائے ہیں روزِ حشر
محفوظ آفتابِ قیامت سے ہوں انام

ہیں سہل تیرے چشم کے آگے خرابیاں
مشکل یہ ہے کہ ہووے فلک کا نہ انہدام

چاہے تو اعتدالِ زمانہ ٹک ایک اگر
ایک ہی ہوا ہے پھر تو جہاں میں علی الدوام

ہے اگر تو یہ کہ نہ روپوش ہووے روز
تر کر کے شب اٹھا ہی رکھے پردہ ظلام

گرمی کرے تنک بھی اعانت تری تو پھر
آجائے پختگی پہ مرا یہ خیالِ خام

یعنی کہ دیکھوں حضرتِ دہلی کی جا نواح
معلوم ہے سوائے ترے حاصل کلام

بہ سینہ کوبیِ زخمِ جگر بہ ماتمِ میر
بہ جاں کنی و گلوگیر و حسرتِ دیدار

قسم ہے میرے تئیں ان تمام قسموں کی
کہ تجھ کو علم ہے ان سب کا کیا کروں میں شمار

یہ آرزو ہے مرے دل میں مدتوں سے شہا
رہے نہ بعد مرے ہند میں یہ مشتِ غبار

اڑا دے اس کو صبا یاں تلک کہ یہ پہنچے
تجھ آستاں کے آگے کہ ہے فلک کردار

رہے ہمیشہ ترے دوستوں کے ساتھ اقبال
عدو کو تیرے نہ دے فرصت ایکدم ادبار

شعاعِ روضے کے قبّے کی ہے گی عالمگیر — بھرے گا سایۂ شب اب جہاں میں ہو تا خوار
بہ صانعے کہ یہ نقّاشیاں ہیں سب اس کی — زمیں ہو یا ہو فلک یا حجر ہوں یا اشجار
بہ احمدے کہ نبوّت ہوئی ہے اس پر ختم — بہ فاطمہ کہ وہ ہے بنتِ سیدِ مختار
بہ مرتضیٰ کہ ولایت مسخّر اُن نے کی — بہادری ہے غلاموں کی جس کے فن و شعار
بہ آں امام کہ کشتہ ہے زہر قاتل کا — گرے ہیں لختِ دل اس کے زمیں پہ کٹ کے ہزار
بہ آں شہید کہ تشنہ لب و شکستہ دل — ہوا ہے دشتِ بلا میں ہیں اب تلک آثار
کہ جب ہلالِ محرّم نمود ہوتا ہے — جہاں ہیں کرتے قیامت ہیں اس کے ماتم دار
بہ سینہ سوزیِ داغ و بہ آتشِ ہجراں — بہ آہِ سردِ سحرگاہی بہ نالۂ زار
بہ سرد مہریِ شیریں بہ کینۂ خسرو — بہ گرم جوشیِ فرہاد و سختیِ کوہسار
بہ عشقِ دیر بہ طوفِ حرم بہ سعیِ تمام — بہ لوحِ مشہدِ عاشق بہ سوزِ شمعِ فرار
بہ آب و رنگِ گلستاں بہ بے کسیِ اسیر — کہ اس کو کنجِ قفس میں رہے ہے بادِ بہار
بہ ساغرِ مے گلگوں بہ توبۂ سنگین — بہ دل نوازیِ ساقی، بہ ابرِ دریا بار
بہ دستگیریِ چاک و بہ بے قراریِ جیب — بہ سینہ کاویِ دشنہ، بہ زخمِ دامن دار
بہ حیرتِ رُخِ جاناں، بہ چشمِ وا ماندہ — بہ سعیِ باطلِ ناخن بہ عقدۂ دل کار
بہ قلقل و بہ شُبو و بہ لغزشِ ہر دم — بہ مستیِ مے ناب و بہ خاطرِ ہشیار
بہ بوچ گوئی و بے تابی و بہ بے خوابی — بہ کم زبانی و صبر و بہ دیدۂ بیدار
بہ دیر و برہمن و کفر یا صنم گوئی — بہ شیخ و مسجد و تسبیح و رشتۂ زنّار
بہ سیل خانہ خراب و بہ وادیِ مجنوں — بہ جرگہ جرگہ غزالاں بہ دیدۂ خونبار
بہ خوشہ خوشہ سرشک و بہ داربستِ مژہ — بہ قطرہ قطرہ شراب و بہ جامِ دستِ یار
بہ ضعفِ جسمِ نزار و بہ طاقتِ سرکش — بہ جانِ عاشقِ مسکیں کہ یار پر ہے نثار
بہ خاکِ عاشقِ بے خانماں کہ بادِ صبا — نہیں دکھاتی اسے بعدِ مرگ کوچۂ یار
بہ اضطرابِ چراغے و بہ دشمنیِ نسیم — بہ خاطرِ دمِ آخر کہ اس سے ہے بیزار
بہ دَورگردیِ رنگِ قبول و یاسِ دُعا — بہ اعتزارِ اجابت بہ حلقۂ اذکار
بہ خیل خیل خرابی نہ گوشۂ صحرا — بہ خوش سوادیِ شہر و قریہ و بہ دیار
بہ شوقِ وصلِ نگار و بہ جانِ مایوسی — بہ آرزوئے ہم آغوشی و بہ بختِ کنار

جہاں میں اہل جہاں کو ہو کشمکش بن کیا — کہ ایک تنگ قفس اور جس میں اتنے اسیر
سفر ہے دور کا در پیش آٹک آئینہ رو — کہ زاد راہ عدم نگاہِ وقت آخیر
تمام نالہ ہوں اس بن مگر کہ روزِ نخست — کیا تھا تن کا مرے سودۂ جگر سے خمیر

مطلع ثالث

تمام قدرت و آصف صفت سلیماں جاہ — سوار دولت و گنجینہ بخش و دشمن گیر
فلک شکوہ و ستارہ حشم خدیو جہاں — ترے جلال کو کن لفظوں میں کروں تعبیر
زہے یہ حشمت و جاہ و جلال و قدرت و روز — کہ تیرے حکم کے آگے ہے سہل امرِ خطیر
ترے محرّر دفتر کا ہے سدا محتاج — جہاں میں شہرہ عطا جو ہے فلک کا دبیر
زہے علوّ مراتب کہ در پہ بار نہ پائے — ہزار بار اگر چرخ مارے چرخِ اسیر
شریک مشورۂ کارخانۂ عالم — کیا ہے تجھ کو، قضا و قدر ہیں تیرے مشیر
رواں ہو صبح کا گر مرکبِ ظفر پیکر — تو، تا بہ شام کرے روم و شام تک تسخیر
لکھوں سو کیا ترے خدام کی سخاوت کو — نہ پاوے وقت دہش رتبۂ قلیل و کثیر
ثبات حرف کو تیرے قلم کی کیا لکھیے — کہے تو خامۂ فولاد سے کیا تحریر
برات روزی کسو کی شرف کو دستخط کے — پہنچتی ہے تو نہیں مٹتی جوں خطِ تقدیر
نہیں ہے شہر میں نام و نشانِ منہیّات — رہی ہے نے کوئی جنگل میں سو برائے صفیر
مزاجِ رفع پہ بدعت کے ہو تو پھر نہ اُٹھے — صدائے نے کا کیا ذکر ہے قلم کی صریر
نسق کو کام تو فرماوے ایک آن اگر — تو پھر زمانہ قیامت تلک نہ پاوے تغیر
گیا ہے شور ترے عدل کا جو گردوں تک — کتاں سے آنکھ جھپکتا رہے ہے بدرِ منیر
جو چاہے تو کر رہے ہے فرشِ چاندنی دن کو — اٹھا کے نہ کرے پردے ظلام کے شب قیر
کرے ہے قطع امید آپ سے دو میں دشمن — سنے ہے مجھ سے تری جب کہ صولت شمشیر
نہیں ہے فیل کہ زربفت پوش کوہ ہے وہ — کروں ہوں شکوہ کو اس کے سو کس روش التطیر
رواں رکاب میں ہے آسمان زر گویا — ستارے جھول کے ایک ایک آفتاب نظیر
کسو کی آنکھ نہ پڑ سکتی تھی چھلاوے میں — پھرے تھا سطح زمیں پر وہ یوں سپہر مسیر

سن اس قماش کی مدحت کو مت سمجھیو یہ
کہ ہے غرض خز و دیبا و پرنیان و حریر

قصیدہ در مدح نواب آصف الدولہ بہادر

ہوا کیے ہیں زبس شکوۂ فلک تحریر — سیہ ہے کاغذِ مشقی کے رنگِ نوحِ ضمیر
کروں نہ شکرِ جفائے آسماں کیوں کر — مری خرابی میں ان نے نہ کی کبھو تقصیر
دیا ہزاروں کو دست اِن نے خانہ سازی کا — دلِ شکستہ کو میرے کیا نہ ٹک تعمیر
جو میں نے چاہا کہ جلد اپنا کام کریے تمام — تو روسیاہ نے اس کام میں بھی کی تاخیر
دماغ رفتہ شگفتن سے آشنا نہ ہوا — کہ اس چمن میں رکھا اُن نے غنچۂ دل گیر
درِ قبول سے نا اُمید پہنچی میری دعا — پھرایا عرش سے نالے کو میرے بے تاثیر
نہ دیکھا صفحۂ عالم کو میں کہ ان نے رکھا — ہمیشہ اپنا ہی حیرانِ کار جوں تصویر
برائے یک لب ناں مجھ ضعیف کو اُن نے — ہلال وار کیا سارے شہر میں تشہیر
فلک کے شکوے میں تھا میں کہ ہمنشیں بولا — کہ اے جواں ستم کشتۂ سپہر پیر
غزل نہ لطف کی اک تو نے میرؔ حیف کی — سنی نہ ہم نے کوئی آشیانہ سوزِ صغیر

مطلع ثانی

ہماری یار سے صحبت ہو کس طرح درگیر — گرہ میں نالۂ آتش فشاں سو بے تاثیر
سمجھ کے زلف کے کوچے میں پاؤں رکھیو نسیم — کہ نکلی ہے یہیں سے راہ خانہ زنجیر
ہزار قافلے یوں مصر سے چلے لیکن — کیا نہ ایک نے کنعاں کی سمت کو شب گیر
کھلا نہ منہ پہ ہمارے کہ ہے زبان پر آہ — بہ رنگِ خامۂ شنجرف خوں چکاں تقریر
جگر ہے رشک کی جا اُس شکار کا تیرے — کہ عیدگاہ میں پہلے ہی آگیا سر تیر

خرمن آسا جل گیا انبوہِ خصم　　چل پڑی جو اس کی تیغِ برق تاب
دیو تھے گو معرکے میں بے شمار
ایک ٹھہرا ہو مقابل کیا حساب

مطلع ثانی

مدعی کی صف ہے کونجوں کی قطار　　لشکری اس فوج کا ہر ایک عقاب
موجِ زن جیدھر ہو وہ دریائے فوج　　بستیاں اس سمت کی جیسے حباب
گرد اس لشکر کی گر ہووے بلند　　پھر زمین و آسمان میں ہے حجاب
جاوے دشمن جوں سگِ پا سوختہ　　وقت گرگ و میش لے منہ پر نقاب
داوری و منصفی من دلبراں　　چھوڑ دے عشاق پر کرنا عتاب
رفع بدعت چاہے تو پھر کیا مجال　　اُٹھ سکے جو نغمۂ چنگ و رباب
منع ے ہووے تو پھر قدرت ہے کیا　　جو گلے سے شیشے کے اُترے شراب
بحر کیا ہے جو کرے تجھ سے سوال　　کوہ تیرے علم کا کیا دے جواب
خوبیاں ہی خوبیاں سر تا قدم　　تب کہا صانع نے تجھ کو انتخاب
لطفِ طبع صاحبِ مجلس کہوں　　یا لکھوں پاکیزہ اس صحبت کا داب
نکلی مستعمل نہایت ورنہ شب　　چاندنی کی جائے بچھتی ماہتاب
گر نہ ہو ممدوح علمِ ظاہری　　پر نہیں ہوتی ہے یہ رائے صواب
جو کہے تو چاہیے وہ لکھ رکھیں　　حرف ہر اک تیرے منہ کا ہے خطاب
کر دعا پر میں اک ختمِ سخن　　تو کہے جو کچھ کرے حق مستجاب
دوست اس کے جوشِ زن جیسے محیط
خاک بر سر مدعی جیسے سراب

قصیدہ در مدح آصف الدّولہ بہادر

رات کو مطلق نہ تھی یاں جی کو تاب — آشنا ہوتا نہ تھا آنکھوں سے خواب
لوٹتا تھا سوزِ غم سے آگ میں — دل جگر سنکتے تھے دونوں جوں کباب
ہرزماں تھی ساتھ اپنے گفتگو — کیا کروں شہر اور ہیں دونوں خراب
تھا کرم شیوہ جنھوں کا اُٹھ گئے — بیٹھے بیٹھے کھینچیے کب تک عذاب
جائیے کس کے در او پر کون ہے — ملیے کس سے کون ملنے کا ہے باب
لے جوانی سے پھرے پیری تلک — امتحاں میں آگئے شب شیخ و شباب
ناگہاں مجھ سے لگا کہنے سروش — رہ گزر سے لطف کی کر کر خطاب
ہے کریم اب بھی وزیر ابنِ وزیر — آصف الدولہ فلک قدر و جناب
آسماں رتبہ ہے جس کا آستاں — ناز کر طالع پہ جو ہو باریاب
جم حشم انجم سپہ گردوں شکوہ — مرجعِ خورد و کلاں عالم مآب
دستِ ہمت اس کا گر دربار ہو — پانی پانی شرم سے ہووئے سحاب
مال کیا ہے ہفت گنج خسروی — اک ہی کو نوّاب بخشے ہے شتاب
فخرِ سام و رستم اس کی بندگی — داخل خدام یاں افراسیاب
جس سحر جرأت سے کھینچی ان نے تیغ — ڈھال رکھے منہ پہ نکلا آفتاب
رزم کے عرصے میں ہل چل پڑ گئی — آسماں کے خیمے کے کانپی طناب
مدعی گر کوہ تھا مارا اُکھاڑ — در زمیں تھا بے سکوں پایا شتاب

مطلع ثانی

ترے ہاتھ جب تک کہ تیر و کماں ہے
شکار زبوں کی بھی خاطر نشاں ہے

کہے تو کہ شکلِ مثالی ہوں اپنی
مرا جسم اس لطف سے ناتواں ہے

نہ پوچھ اس طلسمات عالم کی صنعت
کہ اس آشکارا میں کیا کیا نہاں ہے

خوشا مرگ بلبل کہ سائے میں گل کے
کہیں مشتِ پر ہے کہیں آشیاں ہے

لگے ہے نہ اب عطرواں اس کے منہ کو
نہ اس بوئے خوش سایۂ گل کا وہاں ہے

غرورِ خرابات چل شیخ دیکھیں
جو ترسا بچہ ہے سو پیرِ مغاں ہے

نہ کہہ خانوادے تھے یاں کیسے کیسے
خرابہ ہی ہے جب تلک یہ جہاں ہے

دمِ امتحاں میر ہم کیا کریں گے
ہماری گرہ میں تو اک نیم جاں ہے

چل اے طبع مشتاق وصفِ بُتاں پر
کہ غم ان کا دل میں مرے یک جاں ہے

یہی شغل ہیں خوب پیشِ فقیراں
کہ ذکرِ خدا ہے کہ وصفِ بُتاں ہے

نہ جا اُس کے خاموش رہنے پہ بُلبُل
زباں غنچۂ گل کے زیرِ زباں ہے

نہ دے جانِ شیریں سے تلخی کو ناحق
تری محنت اے کوہ کن رائیگاں ہے

میں پس ماندۂ قافلہ دل چلا ہوں
کہے تو کہ یہ آتشِ کارواں ہے

جو ہو راہ گم گشتہ یاں ہو کے جاوے
کہ مجھ پاس یک داغِ دل سوز یہاں ہے

سموم آوے ہے سایۂ برگِ گل میں
مگر خاک مُرغِ چمن پُر فشاں ہے

مری آہ کیا برچھیاں مارتی ہے
دلِ شب سے ہر دم صدا الاماں ہے

جگر پُر جو ہیں داغِ ہجراں پریشاں
یہ گویا خزاں دیدہ اک گلستاں ہے

رُخِ زرد پر اشک سرخ آ گئے ہیں
ادھر بھی اک ابرِ بہاری سماں ہے

خط و زلف و کاکل میں دل جا کے اُلجھا
نہ سمجھا یہ ناداں کہ ہندوستاں ہے

چمن زارِ عالم کی خوبی پہ مت جا
دل اس بے ثباتی پہ خندہ زناں ہے

کہ یک رنگ یاں کا نہیں ہے قراری
بہار آئی ایدھر کو فصلِ خزاں ہے

خیال اور مت کر کہ مجھ میں نہیں کچھ
مری جاں ترا وہم ہے یا گماں ہے

اٹھی رسمِ صوم و صلوٰۃ اُس کے دیکھے
خرابی یہ مسجد پہ جو ہے اذاں ہے

قصیدہ مدحیہ شاہِ وقت

جو پہنچی قیامت تو آہ و فغاں ہے — مرے ہاتھ میں دامنِ آسماں ہے
کوئی آج سے ہے فلک مدعی کیا — ہمیشہ مرے حال پر مہرباں ہے
کدورت بیاں کیا کروں میں کہ ہے تو — یہ دل گردِ کلفت کا ایک کارواں ہے
جو روتا بھی ہوں میں غبارِ دلی سے — تو آنسو کا سیلابِ ریگ رواں ہے
جو دل میں آتا ہے کہنے میں وہ بھی — زباں میری دل کی مگر ترجماں ہے
عجب مخمصے میں ہوں جورِ فلک سے — حوادث کے تیروں کا سینہ نشاں ہے
سحر جام خوں ہے جو منہ دھو چکوں ہوں — یہ مفلوک ایسے کے گھر میہماں ہے
رمق ایک جی میں سو اک آدھ دم کا — اسے قصد اب تک مرا امتحاں ہے
اس احوال کا رنگ رو بس ہے شاہد — جو دل میں ہے میرے سو منہ پر عیاں ہے
یہ شکوہ تھا درپیش مجھ کو کہ ناگہ — مکاری خرد ہوش تیرا کہاں ہے
تو مر جائے گا یوں تو رکتے ہی رکتے — کہ اندوہ و غم آفت ناگہاں ہے
غزل لطف کر میر صاحب کی کوئی — کہ اُن کی زباں بیچ سحر بیاں ہے

کہا میں نے مطلع غزل کا یہ سن کر
کہ ہر طرف سے جس کے لوہو رواں ہے

کہ جو کوئی اس راہ نکلے سو دیکھے | یہ افسانہ ہر شہر کا ارمغاں ہے
اچک لے جہاں باگ کیا کیا مزے ہیں | یہ نامِ خدا اسپ کیا خوش عناں ہے
ازل سے ابد تک ہے جولاں گاہ اس کی | قدم ایک یاں اک قدم اس کا واں ہے
نہ پہنچے وہ ہونٹوں تلک اس کے ہرگز | کہ یہ بادہ پیما کہاں کا کہاں ہے

دعا پر کروں ختم اب یہ قصیدہ
کہاں تک کہوں تو چنیں ہے چناں ہے

گریباں کفن کا تو رہنے دے ثابت
مری خاک سے کیوں تو دامن کشاں ہے

رگِ گل رگِ جاں کمر سے نہیں ہے
تو کہتا ہے کیا یاں سخن درمیاں ہے

خط کنج لب گوشۂ چشم و کاکل
رہے شاد وہ غم زدہ دل جہاں ہے

نہیں فرصت واشدن اس چمن میں
گل اس غم سے اپنا گریباں دراں ہے

بہت ہرزہ خواں ہے گا اے تمیرؔ تو بھی
وظیفہ ترا کیا یہ ذکر بُتاں ہے

جو مرکوز خاطر ہے اُس پر بھی آ جا
فراغت کا عرصہ یہی اک زماں ہے

سن اے ہم نشیں شخص غائب کی خاطر
یہ مطلع کہ مطلب سے جو تواماں ہے

مطلع ثالث

قلم چل ابھی چلتی تیری زباں ہے
کہ پھر بات کہنے کی فرصت کہاں ہے

ترا عہد یک سرخوشی ہے جو ہے بھی
گنہ گار سا ایک غمِ مہوشاں ہے

ترے یاں ہے سب راستی و درستی
مگر یا صدق سچ کا یہ خانداں ہے

لکھے کیا شہا کوئی ہمت کو تیری
جہاں صبح اس خوان پر میہماں ہے

زیادہ ہو یہ وسعتِ رزق تیری
کہ مشرق سے تا غرب دستار خواں ہے

کرے ہم سری کیا وہ خورشید اوپر
فلک پاس کیا ہے یہی ایک ناں ہے

ترے ہاتھ کی ریزشِ جود آگے
خجالت سے یہ ابر قطرہ زناں ہے

تجھے مرجعِ کل کیا ہے جہاں کا
ترا دست ہے فرق خرد و کلاں ہے

مطلع رابع

مرے زور بازو کی طاقت عیاں ہے
کہ گرز جس کی قوت سے شیر زیاں ہے

ترے زور کا سکہ ہے اس چمن میں
گل اشرفی غنچہ مہرو کاں ہے

ترا ہاتھ پڑ جائے گر رستم اوپر
جہاں میں وہ مشہور کیا پہلواں ہے

اٹھاتا نہیں اس کو سن کوئی گردن
وہ اس عرصے میں اک سنگ گراں ہے

مثنویات

شعلۂ عشق

محبت نے ظلمت سے کاڑھا ہے نور　　نہ ہوتی محبت، نہ ہوتا ظہور
محبت مسبّب، محبت سبب　　محبت سے آتے ہیں کارِ عجب
محبت ہے آبِ رخِ کارِ دل　　محبت ہے گرمیِ آزارِ دل
محبت عجب خوابِ خوں ریز ہے　　محبت بلائے دل آویز ہے
محبت کی آتش سے اخگر ہے دل　　محبت نہ ہووے تو پتّھر ہے دل
محبت لگاتی ہے پانی میں آگ　　محبت سے ہے تیغ و گردن میں لاگ
اس آتش سے گرمی ہے خورشید میں　　یہی ذرّے کی جان نومید میں
کوئی شہر ایسا نہ دیکھا کہ واں　　نہ ہو اس سے آشوبِ محشر عیاں
کب اس عشق نے تازہ کاری نہ کی　　کہاں خون سے غازہ کاری نہ کی

زمانے میں ایسا نہیں تازہ کار
غرض ہے یہ اعجوبۂ روزگار

آغاز قصّہ

عجب کام پٹنے میں اس سے ہوا　　عجب اہلِ عالم کو جس سے ہوا
کہ واں اک جواں تھا پرس رام نام　　خوش اندام و خوش قامت و خوش خرام
کھلے بال چلتا تھا وہ سرو ناز　　قدم بوس کو آتی عمرِ دراز

ہمیں داغ وہ دُرّ تر دے گیا
بہت آب یہ ماجرا لے گیا

سُنا اُس کی ہمسر نے جب یہ سخن
ہوا موج زن بحرِ رنج و محن

نگہ اک طرف در کے مایوس کی
دمِ سرد کھینچا گیا ڈوب جی

موئی غم میں اس جملہ تن ناز کے
گئی جان ہمراہ سخن ساز کے

وہ آیا جو تھا وہ پریشاں گیا
کہ اس واقعے سے پشیماں گیا

خبر لے گیا اُس کنے زُود تر
جو تھا درپئے امتحاں بے خبر

کہ وہ رشک مہ امتحاں دے گئی
محبّت کے ناموس کو لے گئی

مُوا سُن پرس رام کے تئیں موئی
مرے اک سخن میں قیامت ہوئی

یہ سُن کر وہ نافہم حیراں ہوا
خجالت میں سر در گریباں ہوا

گیا ہوش سُن کر پرس رام کا
دوانہ ہوا عشق کے کام کا

اٹھا بے خود و بے خرد بے حواس
گرا آ کے اُس پیکرِ مُردہ پاس

زمیں پر سے آخر اٹھایا اسے
لبِ آب جا کر جلایا اسے

جب آگ اُس کے پیکر پہ سب چھا گئی
محبّت عجب داغ دکھلا گئی

یہ سرگرم فریاد و زاری ہوا
لہو اس کی آنکھوں سے جاری ہوا

گئے ہوش و صبر اس کے یکبارگی
طبیعت میں آئی اک آوارگی

سرِ شام اک روز دریا گیا
ہوئی رات، واں سے نہ آیا گیا

کنارے پہ رہتا تھا اک دام دار
رہا رات اس کے یہ قرب و جوار

کہا اُس کی عورت نے اُس رات کو
نہیں تجھ سے جی چاہتا بات کو

تجھے فکر کچھ اب ہماری نہیں
تو جاتا نہیں شام کو اب کہیں

نہیں طاقتِ صبر ہم کو تنک
بہت دیر ملتا ہے نان و نمک

وہ بولا کہ میں بھی پریشاں ہوں
بہت تنگ دستی سے حیراں ہوں

کہوں کیا کئی روز سے شام کو
اٹھاتا ہوں میں اس سبب دام کو

کہ یک شعلۂ تند پُر پیچ و تاب
فلک سے اترتا ہے نزدیک آب

کوئی دم تو رہتا ہے سرگرم گشت
کبھی سوئے دریا کبھی سوئے دشت

ٹھہرتا جو ہے پھر کنارے پہ واں
کہے ہے پرس رام تو ہے کہاں

جدھر کو وہ تک گرم رفتار ہو — قیامت اُدھر سے نمودار ہو
سیہ چشم اس کے دو بدمست تھے — نگاہوں سے شمشیر در دست تھے
دو لب لعل کو جن سے شرمندگی — دم صرف۔ سرمایۂ زندگی
دہن کی جو تنگی نظر کیجیے — تو آ گئے سخن مختصر کیجیے
نہ ہم تم زنخے دیکھ حیران رہیں — سبھی دست زیر زنخداں رہیں
سراپا میں اس کے جہاں دیکھیے — وہیں روئے مقصود جاں دیکھیے
فدا اُس پہ جی جان ہر ایک کا — کہ مقصودِ دل تھا بد و نیک کا
انھوں میں سے اک عاشق زار تھا — اُس آفت کو اُس سے سروکار تھا
کہ ناگہ وہ دلبر ہو کدخدا — رہا اپنے عاشق سے چندے جُدا
زن و شو سے اخلاص باہم ہوا — اُس آشفتہ سے رابطہ کم ہوا
وفا نے جو تکلیف کی ایک روز — گیا اپنے عاشق کے وہ دل فروز
کئی دن میں جاکر جو اُس سے ملا — کیا اُس نے حد سے زیادہ گلا
کہ اے نازنین آہ کس نے کہا — کہ تو حال سے میرے غافل رہا
کوئی زلف زنجیر پا ہو گئی — کہ مسدود راہِ وفا ہو گئی
کہا ان نے تھی کد خدائی مری — نہ تھی بے سبب یہ جدائی مری
نہ فرصت مجھے صبح ہے اب نہ شام — طرف اُس کے ہے دل کو میل تمام
اسے بھی مرے ساتھ اخلاص ہے — دلوں کو بہم رابطہ خاص ہے
یہ سُن کر کہا اس دل افگار نے — ستم کشتۂ دوریِ یار نے
کہ مجھ کو نہیں تیری باتیں قبول — یہ مکر زناں ہیں تو ان پر نہ بھول
جہاں میں فریب اُن کا مشہور ہے — زبانوں پہ یہ مکر ان کا مذکور ہے
پئے امتحاں عاقبت یک نفس — مقرر ہوا تا کہ جا اس کے گھر
کہے غرقِ دریا ہوا پرس رام — ہوئی زندگانی کی صبح اس کی شام
گیا تھا نہانے کو وقت سحر — مو ڈوبا وہ خورشید روشن سحر
کہا غرق دریا ہوا پرس رام — ہوا کام اُس رشکِ مہ کا تمام
کنارے پہ دریا کے اک شور ہے — بحالِ خراب ایک جمہور ہے

خبردار ہو اہل کشتی تمام — لگے کہنے باہم، نہیں پرس رام
گئے مضطرب حال سارے رواں — تڑپتا تھا وہ شعلہ آکر جہاں
یقینی ہوا یہ کہ وہ تیز آگ — اسی نیم کشتہ سے رکھتی تھی لاگ
لپٹ اس کو شعلہ ہی وہ لے گیا — عجب طور کا داغ یہ دے گیا
پھرے خوار ہو ہو کے ناچار سب — کسی کو تحیّر کسی کو عجب
خصوصاً وہ عاشق ہوا پر خجل — ندامت ہوئی یہ جسے متصل
تفکر کے دریا میں ڈوبا ہوا — کنارے پہ بیٹھا تھا روتا ہوا

کہ پوچھیں گے جو اس کے واماندگان
تو یہ واقعہ کیا کروں گا بیان

کیا عشق نے مجھ کو آتش کباب / نہ چھڑ کا مری آگ پر تو نے آب
گیا وہ یہ کہہ کر سوئے آسمان / رہے ہے مجھے رات دن خوفِ جاں
سُنا حال شعلے کا صیّاد سے / دھواں اک اٹھا جانِ ناشاد سے
محبّت نے کی اشتعالک کہ وہ / سراسیمہ آیا چلا اُس جگہ
جہاں سے اٹھتی تھی یہ آتش سلگ / پھر اس کے جگر کو لگی گھر کو لگ
تبسّم کناں واں یہ ان نے کہا / کہ کلفت میں غم کی بہت میں رہا
چلو سیر گشتی کو ہنگام شب / لب آب خالی کریں دل کو سب
ہوئے ناؤ پر شام گہ جو سوار / کہا ان نے یاں ایک ہے دام دار
اسے سات ہو تو بڑی بات ہے / کہ دریا میں پھرنا ہے اور رات ہے
لیا آخر الامر ہمرہ اسے / بٹھایا قریب اپنے یہ کہہ اسے
تنک دور چل کر کیا یہ سوال / مجھے ہے ترے حرف سب کا خیال
کہاں شعلۂ سرکش آتا ہے یاں / کدھر پیچ و تاب آکے کھاتا ہے یاں
یہ صیّاد سے تھا ہی محو سراغ / جگر آتشِ شوق رکھتی تھی داغ
کہ ہو کر فروغ اک سوئے آسماں / تڑپنے لگا جیسے آتش بجاں
لب آب دو شعلۂ جاں گوار / تڑپ کر بہت با زبانِ دراز
پکارا کہاں ہے پرس رام تو / محبّت کا ٹک دیکھ انجام تو
بھڑکتی ہے جب آگ دل کی مرے / لبِ آب اُترو ہوں غم میں ترے
یہ بے تاب سن کر ہوا بے قرار / سفینے سے اُترا بصد اضطرار
ہوا ہمدم اس آتش انگیز سے / کہا اُس بلائے دل آویز سے
کہ میں ہوں پرس رام خانۂ خراب / مرا دل بھی اس آگ سے ہے کباب
محبت تری برقِ خرمن ہوئی / تری دوستی جی کی دشمن ہوئی
سخن مختصر کچھ وہ شعلہ چلا / کچھ اک اپنی جاگہ سے یہ دل چلا
بہم گرم جوشی سے یک جا ہوئے / کہ گزری تھی مدّت بھی تنہا ہوئے
گیا پاس پانی کے آ کر صعود / رہی روشنی میں کوئی دم نمود
پھر آگے کسو پر نہ پیدا ہوا / نہ جانا کہ وہ شعلہ پھر کیا ہوا

گوش زد دایہ کے ہوئے یہ سخن
تھی وہ استاد کار حیلۂ و فن

پاس اس کو بُلا تسلّی کی
وعدۂ وصل سے تشفّی کی

کاے ستم دیدۂ غم دوری
ہو چکا اب زمانِ مہجوری

دل قوی رکھ نہ جی کو کاہش دے
چل کوئی دم کو داد خواہش دے

سخت دل تنگ تھی یہ غیرتِ ماہ
قطع تجھ بن نہ ہو سکی تھی رہ

دے کر اس کو فریب ساتھ لیا
دلِ عاشق کو اپنے ہاتھ لیا

لیک در پردہ ان نے یہ ٹھانی
کیجیے اس سے خصمئی جانی

وقت نزدیک تھا جو آ پہنچا
تا سرِ آب پا بہ پا پہنچا

آب کیسا کہ بحر تھا ذخّار
تُند و مواج و تیرہ و تہ دار

ہم کنارِ بلا ہر اک گرداب
لجّہ سرمایہ بخش تیرہ سحاب

گزرِ موج جب نہ تب دیکھا
ساحل اس کا نہ خشک لب دیکھا

کشتی اک آن کر ہوئی موجود
ہو فلک سے ہلال جیسے نمود

لی کنارے پہ لاکے استادہ
تھا محافہ رکوب آمادہ

اس سفینے میں جلد جا پہنچا
یہ بھی واں ساتھ ہی لگا پہنچا

بیچ دریا میں دایہ نے جاکر
کفش اس گل کی اس کو دکھلا کر

پھینکی پانی کی سطح پر اک بار
اور بولی کہ او جگر افگار

حیف تیرے نگار کی پاپوش
موجِ دریا سے ہووے ہم آغوش

غیرتِ عشق ہے تو لا اس کو
چھوڑ مت یوں برہنہ پا اُس کو

جس کفِ پا کو رنگِ گل ہو بار
منصفی ہے کہ خار سے ہو فگار

سُن کے یہ حرفِ دایۂ مکّار
دل سے اس کے گیا شکیب و قرار

بے خبر کارِ عشق کی تہ سے
جست کی اُن نے اپنی جاگہ سے

تھا سفینے میں یا کہ دریا میں
موج زنجیر ہو گئی پا میں

کہتے ہیں ڈوبتے اُچھلتے ہیں
لیکن ایسے کوئی نکلتے ہیں

ڈوبے جو یوں کہیں وہ جا نکلے
غرق دریائے عشق کیا نکلے

عشق نے آہ کھو دیا اس کو
آخر آخر ڈبو دیا اس کو

اِن بلاؤں میں کوئی کیونکر جیے
جان پر آ بنی ہے تیرے لیے

رفتہ رفتہ ہوا ہوں سودائی
دور پہنچی ہے میری رسوائی

سخت مشکل ہے سخت ہے بیداد
ایک میں خوں گرفتہ سو جلّاد

آہ جو ہم دمی سی کرتی ہے
اب تو وہ بھی کمی سی کرتی ہے

پس تغافل ہوا ترحّم کر
گوشِ دل جانبِ تظلّم کر

کون کہتا ہے رہ نہ محوِ ناز
پر نہ اتنا کہ جی سے جائے نیاز

دیکھ کر اس کو بے خور و بے خواب
جانا ہر ایک نے عاشقِ بے تاب

ہے نگاہ اس کی جس طرف مائل
اُس طرف ہی گیا ہے اس کا دل

جب ہوا ذکر اقل و اکثر میں
چاہ ثابت ہوئی اسے گھر میں

عشق بے پردہ جب فسانہ ہوا
مضطرب کد خدائے خانہ ہوا

گھر میں جا بہرِ دفعِ رسوائی
بیٹھ کر مشورت یہ ٹھہرائی

یاں سے یہ غیرتِ مہِ تاباں
جا کے چندے کہیں رہے پنہاں

شب محافے میں کرکے اس کو سوار
ساتھ دے ایک دایۂ غدّار

پار دریا کے جلد رخصت کی
اس طرح فکر رفعِ تہمت کی

گھر سے باہر محافہ جو نکلا
اس جواں ہی کے پاس ہو نکلا

طپشِ دل سے ہو کے یہ آگاہ
ہو لیا ساتھ اس کے بھر کر آہ

ہر قدم تھا زبان پر جاری
خواب ہے یا کہ ہے یہ بیداری

ہمسری اس کی تھی میسّر کب
ہے مجھے بخت واژگوں سے عجب

رفتہ رفتہ سخن ہوئے نالے
اڑنے لاگے جگر کے پرکالے

دل کے غم کو زبان پر لایا
آفتِ تازہ جان پر لایا

کاے جفا پیشہ و تغافل کیش
اک نظر سے زیاں نہیں کچھ بیش

منزلِ وصل دور، میں کم پا
تجھ کو اس مرتبے میں استغنا

نازنے یک نفس نہ رخصت دی
آئینے نے تجھے نہ فرصت دی

تُو تو واں زلف کو بنایا کی
جان یاں پیچ و تاب کھایا کی

تجھ کو تھی اپنے خالِ رُخ پہ نگاہ
دل مرا مبتلائے داغِ سیاہ

مکرّ میں گرچہ دایہ تھی کامل ایک تہ سے سخن کے تھی غافل
بیچ دریا کے جا کہا یہ حرف یاں ہوا تھا وہ ماجرائے شگرف
یاں وہ بیٹھا محتاب کے مانند پھر نہ تھا کچھ سراب کے مانند
سنتے ہی یہ کہاں کہاں کر کر گر گئی قصدِ ترکِ جاں کر کر
موج ہر اک کمند شوق تھی آہ لپٹی اس کو بہ رنگ مارِ سیاہ
دام گسترہ عشق تھا تہِ آب جس کے حلقے تمام تھے گرداب
حسن موجوں میں یوں نظر آوے نورِ مہتاب جیسے لہراوے
سر پہ جس دم کہ آب ہو کے بہا سطح پانی کا آئینہ سا رہا
کششِ عشق آخر اس مہ کو لے گئی کھینچتی ہوئی تہ کو
کودے غوّاص و آشنا سارے تا بہ مقدور دست و پا مارے
کھینچ کر کوفت سب ہوئے بیتاب نہ لگا ہاتھ وہ دُرِ نایاب
جا ہم آغوشِ مردہ یار ہوئی تہ میں دریا کے ہم کنار ہوئی
سر پٹکتی جو گھر گئی دایہ آفت اک تازہ لے گئی دایہ
خلق یک جا ہوئی کنارے پر حشر برپا ہوئی کنارے پر
دام داروں سے سب نے کام لیا آخر اُن کو اسیرِ دام کیا
نکلے باہم وے موئے نکلے دونوں دست و بغل ہوئے نکلے
جو نظر اُن کو آن کرتے تھے ایک قالب گمان کرتے تھے

حیرتِ کارِ عشق سے مردم
شکلِ تصویر آپ میں تھے گم

دایۂ حیلہ گر ہوئی دل شاد ‌ ‌ واں سے کشتی چلی بہ رنگِ باد
یہ نہ سمجھی کہ عشق آفت ہے ‌ ‌ فتنہ سازی میں اک قیامت ہے
وصل جیتے نہ ہو میسّر اگر ‌ ‌ لاوے معشوق کو یہ تربت پر
قصّہ کوتاہ بعد یک ہفتہ ‌ ‌ آئی وہ رشک مہ ز خود رفتہ
کہنے لاگی کہ اب تو اے دایہ ‌ ‌ ہوگیا غرق وہ فرومایہ
اب تو وہ ننگ درمیاں سے گیا ‌ ‌ آرزو مند اس جہاں سے گیا
دل تڑپتا ہے متصل میرا ‌ ‌ مرغِ بسمل ہے یا کہ دل میرا
بے دماغی کمال ہوتی ہے ‌ ‌ جان تن کے وبال ہوتی ہے
دل کوئی دم میں خون ہووے گا ‌ ‌ آج کل میں جنون ہووے گا
بے کلی جی کو تاب دیتی ہے ‌ ‌ طاقتِ دل جواب دیتی ہے
مصلحت ہے کہ مجھ کو لے چل گھر ‌ ‌ ایک دو دم رہیں گے دریا پر
دایہ بولی کہ اے سراپا ناز ‌ ‌ حسن کا در پہ تیرے روئے نیاز
اب تو میں فتنے کو سُلایا ہے ‌ ‌ اس بلا کے تئیں بٹھایا ہے
کون مانع ہے گھر کے چلنے کا ‌ ‌ سترِ رہ کون ہے نکلنے کا
یہ نہ سوچی کہ بد بلا ہے عشق ‌ ‌ گھات میں اپنی لگ رہا ہے عشق
جس کسو سے یہ پیار رکھتا ہے ‌ ‌ عاقبت اس کو مار رکھتا ہے
صبح گاہاں وہ غیرتِ خورشید ‌ ‌ اس جگہ سے رواں ہوئی نومید
پہنچی نصف النّہار دریا پر ‌ ‌ روئی بے اختیار دریا پر
حد سے افزوں جو بے قرار ہوئی ‌ ‌ دایہ کشتی میں لے سوار ہوئی
حرف زن یوں ہوئی کہ اے دایہ ‌ ‌ یاں گرا تھا کہاں وہ کم مایہ
موج سے تھا کدھر کو ہم آغوش ‌ ‌ تھا تلاطم سے کس طرف ہم دوش
تجھ کو آیا نظر کہاں آکر ‌ ‌ پھر جو ڈوبا تو کس جگہ جاکر
مجھ کو دیجو نشاں اُس جا کا ‌ ‌ میں بھی دیکھوں خروش دریا کا
ہوں میں ناآشنائے سیرِ آب ‌ ‌ ناشناساتے موجہ و گرداب
لجّہ کیا لطمہ کس کو کہتے ہیں ‌ ‌ گھر میں ہم نام سنتے رہتے ہیں

مناجات

مرا زخم یا رب نمایاں رہے — پس از مرگ صد سال خنداں رہے
رہے دشمنی جیب سے چاک کو — صبا دوست رکھے مری خاک کو
خموشی سے مجھ کو رہے گفتگو — اُڑے پَر لگا کر ہرا رنگِ رُو
ارے ساقی، اے غیرتِ آفتاب — کہاں تک ہمیں خونِ دل کی شراب
کبھو ساغرِ بادہ کا دید ہو
محرّم ہمارا کبھو عید ہو

در تعریف عشق خانماں آبادو آزادگاں برنا نہاد

زہے عشق نیرنگ سازی تری — کہ ہے کھیلنا جی پہ بازی تری
تجھی سے ہے آب رُخِ زرد زرد — تجھی سے مرے دل میں اٹھتا ہے درد
تمنّا کو تو نے کیا ہے شہید — تجھی سے نہ بر آئی میری اُمید
مجھے اس کے چھُپنے کا سودا رہا — و لیکن ترا راز رُسوا رہا
ترا ہی نمک خوار ہے زخمِ دل — کہ مرہم سے بیزار ہے زخمِ دل
کہاں تک کوئی خونِ دل کو پیے
کوئی کیونکہ اس رنگ، ظالم، جیے

زبانی درویش جگر ریش کہ ایں بلا در سر آمد

کسو معتبر سے روایت ہے اک — کہ درویش سے یہ حکایت ہے اک
اٹھا سیر کرنے کو میں ایک روز — پشیمانی اس کی ہے مجھ کو ہنوز
نظر جا پڑی جو مری ایک سُو — سرِ راہ بیٹھا تھا ایک خوب رُو
فقیروں کی سی جھولی ایک اس کے پاس — بدن پر نہایت مکلّف لباس
لقب اس کا دیوانۂ عشق تھا — کہ شہرت میں افسانۂ عشق تھا
وہ اک دودماں کا تھا روشن چراغ — جلاتے تھے سارے اسی پر دماغ

اعجاز عشق

ثنائے جہاں آفریں ہے محال ‌ ‌ ‌ زباں اس میں جنبش کرے کیا مجال
زمین و فلک سب ہیں اس کے حضور ‌ ‌ ‌ مہ و حور ہیں اس سے ہی لبریز نور
یہ صنعت گری اس ہی صانع سے آئے ‌ ‌ ‌ کفِ خاک کو آدمی کر دکھائے
نہ آوے کسی کے جو ادراک میں ‌ ‌ ‌ سو رکھ جائے وہ اس کفِ خاک میں
گل و غنچہ و رنگ و بو و بہار ‌ ‌ ‌ یہ سب رنگ اللہ ہی کے ہیں یار
اگرچہ سبھوں کی ہیں طرحیں جدا ‌ ‌ ‌ یہ سب طرحیں ہیں ایک نام خدا
سما ارض و خورشید یا ماہ ہے ‌ ‌ ‌ جدھر دیکھو اللہ ہی اللہ ہے
وجود و عدم اس کے دونوں ہیں شاد ‌ ‌ ‌ وہی ہے گا مبدا وہی ہے معاد

رکھے آپ میں جس کی آمد مجھے
کہ در پیش ہے نعت احمدؐ مجھے

در نعت سیّد المرسلینؐ

ثنا جانِ پاک محمدؐ کے تئیں ‌ ‌ ‌ درود تحیّات احمدؐ کے تئیں
رسولِ خدا و سرانبیار ‌ ‌ ‌ زہے حشمت و جاہ صلِّ علےٰ
سب اس صفحے میں ہیں ظہور خدا ‌ ‌ ‌ پر اس سے عبارت ہے نورِ خدا

یہ صورت اگر عبد مشہود ہے
حقیقت کو پہنچو تو معبود ہے

کیا سوزِ دل کو لبوں پر نمود
زباں تاب کھانے لگی جیسے دود

جو دل جوئی میری ہو مدِّ نظر
تو یاں اک محلہ ہے ٹک قصد کر

زبانی مری در پہ یہ جا کے کہہ
کہ احوال سے میرے غافل نہ رہ

تسلّی شکیبائی مطلق نہیں
پر اب تابِ تنہائی مطلق نہیں

کہے سے جواں کے غرض قصد کر
گیا بندہ ترسا کے دروازے پر

سن آواز دستک کی اک رشکِ حور
مہ چار دہ سی نپٹ باشعور

کہا میں نے پیغام جو آیا بن
یہ خوبی سی اس کی کروں کیا سخن

قد و قامت اس کا کروں کیا بیان
قیامت کا ٹکڑا ہوا تھا عیاں

وہ مردوں کو زندہ دوبارہ کرے
مسیحا جہاں سے کنارا کرے

خراماں خراماں جدھر آگئی
قیامت ہی گویا ادھر آگئی

گلی اس کی وہ قتل گاہ عجیب
شہادت وہاں خضر کو ہو نصیب

صبا گر اُڑا دے تنک واں کی خاک
تو نکلے زمیں سے دل چاک چاک

سُنا وہ جگر سوز پیغام جب
کیے آشنا حرف سے لعل لب

محبت کی رہ میں یہ پہلا ہے کام
کہ سر سے گزر جائیے شاد کام

نہیں شرطِ الفت میں چینِ جبیں
اگر پیش آوے دمِ واپسیں

نہ ہو جو سکے ہجر کا پائمال
تو بہتر ہے ہونا ہی اس کا وصال

گیا میں جواب اس سے لے کر ادھر
سرِ راہ تھا پامالِ غم وہ جدھر

حقیقت بیاں کی سب اس جائے کی
جواں نے یہ سنتے ہی اک ہائے کی

گئی ساتھ اس ہائے کے اس کی جان
گرا خاک پر ہو کے بے دم جوان

مری بات میں خونِ بلبل ہوا
دیا سا وہ جلتا جو تھا گل ہوا

میں یہ واقعہ دیکھ گھبرا گیا
کہ یوں یہ گلِ تازہ مُرجھا گیا

نہ سوجھا مجھے اور کچھ اس سوا
کہ کریے بیان طرفِ ثانی سے جا

ملامت کروں اس کو میں اک جہاں
کہ اے بے حقیقت گئی اس کی جان

یہ ٹھہرا ادھر، میں روانہ ہوا
ادھر مرنا اس کا فسانہ ہوا

درِ خانہ پر آئی اک پیرزن
لگی کرنے عشقِ جواں سے سخن

وے اس کے دل میں اک آتش نہاں
کہ دیجیے جلا اس سے سارا جہاں
شب و روز فریاد کرنا اسے
کئی بار اک دم میں مرنا اسے
سُنے نہ کسو کی نہ اپنے کہے
بیاں اس کا کچھ گومگو ہی رہے
کُھلا چاہتا ہے گل راز عشق
کہ پردے میں کب تک بجے ساز عشق

رفتن درویش پیش آں جواں

زن و مرد کی ہوں زباں سے بتنگ
ہوا ہوں میں سارے قبیلے کا ننگ
سدا خون دل میں طپیدہ ہوں میں
کہ آہِ بہ لب نا رسیدہ ہوں میں
تو جب سے درا و پر نظر آ گئی
رہیں آفتیں میرے سر پر نئی
نہ نامہ نہ پیغام نے رسم و راہ
یو نہی ہوتی جاتی ہے عالم تباہ
دل و دیدہ سب مدّعی ہو گئے
تماشائی مجھ پر بہت رو گئے
یہ حیران ہوں صبر آتا نہیں
تصور ترا جی سے جاتا نہیں
کہاں ہے تو محمل نشینِ حیا
سر راہ نالاں تھا مثلِ درا
کہہ اس طرز سے حال دل کا تمام
خموشی کو پھر اس نے فرمایا کام
گیا زہرۂ تاب دل آب ہو
کہا آگے جا کر میں بے تاب ہو
کہ اے ناز پُر دردِ مہر و وفا
کوئی اپنے جی پہ کرے ہے جفا
تلف یوں نہیں جان کرتا کوئی
نہیں اس سلیقے سے مرتا کوئی
تہہ دل ہو معلوم تا بول ٹک
تو مژگانِ خوں بستہ کو کھول ٹک
سخن حسرت آلود کہنے پہ آ
کچھ اک دل کی باتیں زباں پر بھی لا
وگرنہ تو رک رک کے مر جائے گا
یہ ہے عشق، کام اپنا کر جائے گا
ترا دردِ پنہاں ہے گو آشکار
یہ مجھ سے بیاں کر کہ ہوں راز دار
کہیں دل لگا ہو تو یہ مجھ سے کہہ
کہوں اس سے جا کر، غمیں تو نہ رہ
جو حور بہشتی بھی ہو تیری یار
کروں میں ملک کی طرح واں گزار
یہ سن کر جوانِ ز خود رفتہ نے
جگر سوختہ اور دلِ تفتہ نے

خواب وخیال

خوشا حال اس کا جو معدوم ہے — کہ احوال اپنا تو معلوم ہے
رہیں جانِ نمناک کو کاہشیں — گئیں دل سے نومید سو خواہشیں
زمانے نے رکھا مجھے متّصِل — پراگندہ روزی پراگندہ دل
گئی کب پریشانی روزگار — رہا میں تو ہم طالع زلفِ یار
وطن میں نہ اک صبح میں شام کی — نہ پہنچی خبر مجھ کو آرام کی
اٹھاتے ہی سر پر پڑا اتفاق — کہ دشمن ہوئے سارے اہل وفاق
زمانے نے آوارہ چاہا مجھے — مری بے کسی نے نباہا مجھے
رفیقوں نے دیکھی بہت کوتہی — غریبوں نے اک عمر کی ہمسری
مجھے یہ زمانہ جدھر لے گیا — غریبانہ چندے بسر لے گیا
بندھا اس طرح آہ بارِ سفر — کرے زادِ رہ کچھ نہ بارِ سفر
گرفتارِ رنج و مصیبت رہا — غریبِ دیارِ محبّت رہا
چلا اکبر آباد سے جس گھڑی — در و بام پر چشمِ حسرت پڑی
کہ ترکِ وطن پہلے کیوں کر کروں — مگر ہر قدم دل کو پتھر کروں
دل مضطرب اشکِ حسرت ہوا — جگر رخصتانے میں رخصت ہوا
پس از قطع رہ لائے دلّی میں بخت — بہت کھینچے یاں میں نے آزار سخت
جگر جورِ گردوں سے خوں ہوگیا — مجھے رکتے رکتے جنوں ہوگیا

کہ کیوں دوسری بار آیا ہے تُو
شگوفہ مگر اور لایا ہے تُو
بیاں کر جو کہنا ہو تجھ کو شتاب
کہ ہے منتظر غیرتِ آفتاب
کہا میں نے اے پیرِ زن کیا کہوں
عزادار اس نوجواں کا میں ہوں
پیام اس کا لایا تھا میں اس لیے
کہ وہ بے اجل مرتا ہے ٹک جیے
سو یاں سے گیا ایسا لے کر جواب
کہ جس سے نکلتا تھا ناز و عتاب
نہ سمجھی یہ رشکِ پری اس کے تئیں
دکھائی دی عشوہ گری اس کے تئیں
چڑھا اس نے تیوری اک انداز سے
کہا بے مزہ ہو کے اک ناز سے
کہ جس کو نہ ہو تاب لانے کی تاب
شتابی سے مرنا ہے اس کا صواب
جواں سنتے ہی کر کے ایدھر نگاہ
سفر کر گیا جان سے بھر کر آہ
یہی ماجرا کہنے آیا ہوں یاں
خبر اس کے مرنے کی لایا ہوں یاں
یہ کہہ دس قدم واں سے میں تھا چلا
کہ اک شور کانوں میں میرے پڑا
گزرنے لگی دل سے آوازِ آہ
لگا ہونے آنکھوں میں عالم سیاہ
صدا ایک نوحے کی آنے لگی
کہ یعنی وہ دختر ٹھکانے لگی

محبت نے کام اپنا پورا کیا
کہ ان دونوں لعلوں کو چورا کیا

مقولۂ شاعر

عجب کی نہیں جا، نہ کھا پیچ و تاب
یہ میراب جو ہے عشق خانہ خراب
بہت عشق کی آگ میں جل گئے
بہت اٹھتے جاتے ہیں شعلے نئے

گلے لگ کے مینا کے ٹک رویے
فسانہ بھی آخر ہے، اب سویے

کہیں دل بری اس کو در پیش ہے / کہیں مائلِ خوبیِ خویش ہے
کہیں جملہ تن مہر صرف سلوک / کہیں مجھ سے سرگرم حرفِ سلوک
کہیں جلوہ پرداز وہ عشوہ ساز / کہیں ایستادہ بصد رنگِ ناز
رہے سامنے اس طرح پر کبھو / رکھے وضع سے پاؤں باہر کبھو
بغل میں کبھو آرمیدہ رہے / کبھو اپنے بر خویش چیدہ رہے
کبھو صورت دل کش اپنی دکھائے / کبھو اپنے بالوں میں منہ کو چھپائے
کبھو گرم کینہ کبھو مہربان / کبھو دوست نکلے کبھو خصمِ جان
کبھو یک بہ یک یار ہو جائے وہ / کبھو دست بردار ہو جائے وہ
ہر اک رات چندے یہ صورت رہی / اسی شکل وہی سے صحبت رہی
دمِ صبح ہو گرم رہ سوئے ماہ / کہ در پیش آوے یہ روز سیاہ
کہ جھوما کروں بید مجنوں کی طرز / رہے یاد اس سرو موزوں کی طرز
رہوں زرد میں گاہ بیمار سا / پریشاں سخن گہ پری وار سا
پری خواں کو کوئی افسوں پڑھائے / کسو سے کوئی جا کے تعویذ لائے
طبیبوں کو آخر دکھایا مجھے / نہ پینا جو کچھ تھا پلایا مجھے
دوا جو لکھی سو خلافِ مزاج / کھنچا اس خرابی سے کارِ علاج
کہ سرگشتہ تدبیر کا گم ہوا / دل اوپر ہجوم توہم ہوا
دروں خود بخود بے حواسی رہی / پریشاں دلی اور اداسی رہی
قیامت جنوں کا رہے سر میں شور / کھنچا جائے دل کوہ و صحرا کی اور
سر آشفتہ زلفِ گرہ گیر کا / قدم حلقہ درگوشِ زنجیر کا
جنوں آہ در پے ہوا جان کے / مجوّز ہوئے یار زندان کے
کیا بند اک کوٹھری میں مجھے / کہ آتش جنوں کی مگر واں بجھے
لبِ نان اک بار دینے لگے / دمِ آب دشوار دینے لگے
کہاں علم کا کسب فرصت، نہ آہ / ہوا کا بھی واں گشت روزن کی راہ
نہ آوے کوئی در سے میرے کنے / کہ کیا جانیے کیسی صحبت بنے
وہ آشفتہ سر ہوش مندی سے دور / نہیں رابطِ مقتضائے شعور

ہوا خبط سے مجھ کو ربطِ تمام
لگی رہنے وحشت مجھے صبح وشام

کبھو کف بہ لب مست رہنے لگا
کبھو سنگ در دست رہنے لگا

کبھو غرقِ بحرِ تحیّر رہوں
کبھو سر بہ جیبِ تفکّر رہوں

یہ وہم غلط کاریاں تک کھچا
کہ کارِ جنوں آسماں تک کھچا

نظر رات کو چاند پر جا پڑی
تو گویا کہ بجلی سی دل پر پڑی

مہِ چاردہ کار آتش کرے
ڈروں یاں تلک میں کہ جی غش کرے

توہم کا بیٹھا جو نقش درست
لگی ہونے وسواس سے جان سُست

نظر آئی اک شکل مہتاب میں
کمی آئی جس سے خور و خواب میں

اگرچند پرتو سے مہ کے ڈروں
ولیکن نظر اس طرف ہی کروں

رہی فکر جاں میرے احباب کو
اڑا دیویں سب گھر کے اسباب کو

کوئی فرطِ اندوہ سے گریہ ناک
گریباں کسو کا مرے غم سے چاک

جو دیکھوں تو آنکھوں سے لوہو بہے
نہ دیکھوں تو جی پر قیامت رہے

کہے چشم بنائی کو ہر بار غیر
ولے منزلِ دل میں اس مہ کی سیر

وہی جلوہ ہر آن کے ساتھ تھا
تصوّر مری جان کے ساتھ تھا

اگر ہوش میں ہوں وگر بے خبر
وہ صورت رہے میرے پیشِ نظر

نگہ گردشِ چشم سے فتنہ ساز
مژہ آفتِ روزگارِ دراز

عجب رنگ پر سطحِ رخسار کا
مگر وہ تھا آئینہ گلزار کا

جو آنکھ اس کی بینی سے جا کر لڑے
دمِ تیغ پر راہ چلنی پڑے

مکاں کُنجِ لب خواہشِ جان کا
تبسّم سبب کاہشِ جان کا

دہن دیکھ کر کچھ نہ کہیے کہ آہ
سخن کی نکلتی تھی مشکل سے راہ

سزا ہے جگر اس کسو کے لیے
جو سیبِ ذقن اس کا بو کر جیے

گلِ تازہ شرمندہ اس رو سے ہو
خجل مشکِ ناب اس کے گیسو سے ہو

سراپا میں جس جا نظر کیجیے
وہیں عمر اپنی بسر کیجیے

کہیں مہ کا آئینہ در دست ہے
کہیں بادۂ حسن سے مست ہے

کہیں نقش دیوار دیکھا اسے
کہیں گرمِ رفتار دیکھا اسے

کہیں لب پہ وہ شکوۂ خوں چکاں — کہ ٹپکا کرے جس سے آزارِ جاں
کہیں وہ نگہ جس سے یہ پائیے — کہ یہ دردِ دل ہے تو مٹ جائیے
کہیں وہ سخن جو جگر خوں کرے — کہیں طرز ایسی کہ مفتوں کرے
کسو جا ہے جلوے میں اُس آن سے — کہے تو کہ بے زار ہے جان سے
کسو وقت اس کا یہ اسلوب ہے — کہ شرمِ محبت سے محجوب ہے
کبھو بے قراری ہے اس رنگ سے — کہ پھرتی ہے سر مارتی سنگ سے
کبھو بے ادائی و دشنام ہے — کبھو باد کے ہاتھ پیغام ہے
کہ اے بے وفا آہ دل نرم کر — محبّت کی بھی منہ سے کچھ شرم کر
کہ ظاہر میں میر اب توانا گیا — کہ وہ دوستی کا زمانہ گیا
غرض نا اُمیدانہ کر اک نگاہ — وہ نقشِ تو ہم گیا سوئے ماہ
نہ آیا کبھو پھر نظر اس طرح — نہ دیکھا اسے جلوہ گر اس طرح
مگر گاہ سایہ سا مہتاب میں — کبھو وہم سا عالمِ خواب میں
دلِ خو پذیرِ وصالِ تمام — رہے خواب میں روز و شب صبح و شام
اگر وصل خوابِ فراموش تھا — و لیکن وہی خواب کا جوش تھا
پلک سے پلک آشنا ہے وہی — زخود رفتگی کی ادا ہے وہی
کھڑا ہوں تو سوتا ہوں اک ذوق میں — رگِ خوابِ دل ہے کفِ شوق میں
جو بیٹھا ہوں خواب گراں ہے مجھے — وہ غفلت جہاں در جہاں ہے مجھے
خیال اس کا آوے کہ سن ہو رہوں — تلے سر کے پتھر رکھوں سو رہوں
مجھے آپ کو یوں ہی کھوتے گئی — جوانی تمام اپنی سوتے گئی
دکھایا نہ اُس مہ نے رو خواب میں — نہ دیکھا پھر اس کو کبھو خواب میں
بہت بے خود و بے خبر ہو چکا — ہم آغوش طالع بہت ہو چکا

نہ دیکھا کبھو میر پھر وہ جمال
وہ صحبت تھی گویا کہ خواب و خیال

وہ حجرہ جو تھا گور سے تنگ تر — در اُس کا نہ کھلتا تھا دوپہر
جو اس میں کبھو میں سنبھل بیٹھتا — تو باہر بھی اک دم نکل بیٹھتا
سرِ شام بیٹھا تھا میں ایک روز — افاقت نہ آئی تھی مجھ کو ہنوز
کہ یاروں نے برجستہ تدبیر کی — مرے خون میں کچھ نہ تقصیر کی
اگرچند کہنے کو خوں کم کیا — لیا لوہو اتنا کہ بے دم کیا
بڑی دیر تک خوں جاری رہا — میں بے ہوش وہ رات ساری رہا
جگایا سحر مجھ کو اک شور سے — کھلی آنکھ میری بڑے زور سے
وہی دست فصّاد میں نیشتر — وہی رنگ صحبت کا پیشِ نظر
وہی لوہو لینے کا ہنگامہ پھر — وہی تر لہو میں مرا جامہ پھر
ہوا خون سے دامن وجیب تر — رگِ جاں تلک زخم پہنچا مگر
سخن ضعف سے سخت دشوار تھا — پلک کا اٹھانا بھی اک بار تھا
کئی روز بالیں پہ یہ سر رہا — خمار ایک مدت تلک پھر رہا
کھڑا ہوں اگر، پاؤں لغزاں رہے — بدن بید کی طرح لرزاں رہے
پس از چند آنکھیں ٹھہرنے لگیں — نگاہیں بھی کچھ کام کرنے لگیں
بندھا ناتوانی کا رختِ سفر — کیا طاقتِ رفتہ نے منہ اِدھر
کسے تھا مری زندگانی کا دھیان — ولیکن نہایت تھا میں سخت جان
لگی جان سی آنے اعضا کے بیچ — کوئی روز رہنا تھا دنیا کے بیچ
پھرا ناتواں میں بہت دور سے — کہ نزدیک تھا عالم گور سے
غلط کاری وہم کچھ کم ہوئی — وہ صحبت جو رہتی تھی برہم ہوئی
وہ صورت کا وہم اور دیوانگی — لگی کرنے در پردہ بیگانگی
نہ دیکھے مری اور اس پیار سے — غریبانہ سر مارے دیوار سے
کہیں ٹک تسلّی کہیں بے قرار — کہیں شوق سے میرے بے اختیار
کہیں واسطے میرے روتی ہے خوں — کہیں دست زیر زنخ ہے ستوں
کہیں دل کو اپنے دکھاوے مجھے — مری بے وفائی جتاوے مجھے
کہیں بے دماغانہ، سرگرم ناز — کہیں آتشِ شوق سے جاں گداز

کہیں بادشہ اس سے درویش ہیں کہیں اس سے درویش دل ریش ہیں
کہیں پڑ گئے اس سے فتنے فساد رہے زیرِ شمشیر حد سے زیاد
ہوئے عشق میں زہد کیشاں خراب رہے دل شکستہ پریشاں خراب
کیا عشق میں ترکِ صوم و صلوٰت گئے اہلِ مسجد سوئے سومنات
مسلماں ہوئے عشق میں برہمن گئے کعبہ کو چھوڑ دینِ کہن
نہ سبحہ نہ زنّار نہ کفر و دیں جہاں سب ہے عشق اور کچھ بھی نہیں
کوئی ہوش میں اپنے رہتا نہیں ہر اک چپ ہے کچھ کوئی کہتا نہیں
نہیں عشق جس سے کہ حاصل ہے کام یہی عشق ہے جس سے نکلا ہے کام
یہی عشق ہے، عقدۂ دل ہے یہ یہی عشق، حلالِ مشکل ہے یہ

غرض عشق ہے طرفہ نیرنگ ساز
کہیں ناز یک سر کہیں ہے نیاز

حکایت

حکایت ہے عشقی حکایات میں کہ افغاں پسر ایک، گجرات میں
جواں خوش تھا پُر کار و پرہیزگار بہت حسن کا اُس کے واں اشتہار
بہ صورت، بہ طاعت، بہ دامانِ پاک نہ دامن پہ مانندِ گل گرد خاک
اگر ہوئے حورِ بہشتی دوچار وہ دریائے حسن اس کے ڈھونڈے کنار
وگر آگے سے ہو پری کا گزر حیا سے نہ اس پر کرے ٹک نظر
رہے محوِ پاکیزگی و صلوٰۃ نہ ہوں ترک سہواً کبھی واجبات
تناسب بہت اس کے اعضا سے خوب سراپا میں دیکھو تو ہر جا سے خوب
زباں نرم طالع وری و صلاح نہ طنز و کنایہ نہ رمز و مزاح
خوش اندام و خوش رو و پاکیزہ خو کسو وقت رہتا نہ تھا بے وضو
کہ ناگاہ اس راہ اک زن گئی جیوں پر خدا جانے کیا بن گئی
جواں کی نظر شرم گیں جا لڑی وہ شرمائی آنکھ اس کے اوپر پڑی
نہ دل مستقل ناشکیبا ہوا دلِ طرفِ ثانی بھی بے جا ہوا

عشقیہ

چمن سے عنایت کے بادام وار — الٰہی زباں دے مجھے مغز دار
صفت عشق کی تا کروں میں بیاں — رہوں عشق کہنے سے میں تر زباں
عجب عشق ہے ہر دکار آمدہ — جہاں دونوں اس کے ہیں برہم زدہ
جہاں جنگ صف کی یہ ظالم لڑا — صف الٹی جہاں ایک مارا پڑا
اگر لوگ مارے گئے سر بسر — ولے فتح اس کی ہے یہ طرفہ تر
کوئی کشتنی جو طرف ہو گیا — تہِ تیغ اس کے تلف ہو گیا
جہاں جس کسو سے اسے چاہ ہے — وہیں اس کے تا قتل ہمراہ ہے
کسو سے اگر ہو گئی لاگ سی — درونے میں اس کے لگی آگ سی
ہوا ملتفت یہ کسو سے کہیں — تو نام و نشاں اس کا پھر واں نہیں
جواں کیسے کیسے موئے عشق میں — بہت گھر خرابے ہوئے عشق میں
نہ مرغِ چمن ہی ہے نالاں و زار — گئے داغ کہسار سے لالہ زار
کسو کا جگر غم سے خوں ہو گیا — کسو کوہکن کو جنوں ہو گیا
کوئی زار باراں بہت ہو چکا — کوئی برق سا جل بجھا ہو چکا
بہت اہل اسلام کافر ہوئے — بہت اوّل عشق آخر ہوئے
ہوئے خانداں کیسے کیسے خراب — جواں جوں جوانی گئے کیا شتاب
دوا عشق کی سخت نایاب ہے — سرِ عاشقاں سنگ کا باب ہے

نہ آنکھیں لگی ہوتیں ناگاہ کاش
کہ چھاتی کی دل تک نہ جاتی خراش

ہوئی آتشِ عشق آخر بلند
جگر دل ہوئے اس کے دونوں سپند

ہوا ناگہاں شوہرِ زن مریض
نہایت ہوئی تپ طویل و عریض

تشتّت ہوا تپ کا دل کے تئیں
کھنچی رفتہ رفتہ دق وسل کے تئیں

نزاری سے دل ہو گیا زار تر
ہوا خشک ہو کر وہ بیمار تر

جلانے کی تیاری کرنے چلے
چلی زن بھی تا ساتھ اس کے جلے

لگی جلنے چھوڑا نہ اصرار کو
خبر پہنچی اس نوگرفتار کو

اٹھا واں سے بے تاب آیا چلا
اسے دیکھ جلتے بہت جی جلا

جھکا آگ کی اور کر اضطراب
کہ جی میں نہ طاقت تھی مطلق نہ تاب

کہا ہم کو کیا کہتی ہو اس گھڑی
نظر اس کی جلتے جو اس پر پڑی

کہا آئے ہو تو چلے آؤ تم
شتابی کرو جو ہمیں پاؤ تم

یہ بے تاب تھا آگ پر پھر پڑا
پتنگا تھا اس شعلے پر گر پڑا

لگے آتے تھے کتنے انفار ساتھ
وہیں کھینچ لائے اسے ہاتھوں ہاتھ

چلے ادھ جلا کے سب اس کو گھر
ہوا گرم ہنگامہ یہ اک ادھر

قدم کتنے چل کر وہ آتش بجاں
ہوا یوں سخن زن کہ اے دوستاں

لے آئے مجھے گرمی سے تم نکال
کیا گھر بھی لے چلنے کا اب خیال

نہیں متصل راہ چلنے کی تاب
کہ ہوں نیم سوز آگ کا میں کباب

کہیں مجھ کو سائے میں ٹھہرائیے
جو دم ٹھہرے تو آگے لے جائیے

کوئی دم مرا کھینچے انتظار
کہ گرمی سے ہوں بے خود و بے قرار

توقّف کیا سب نے زیرِ درخت
کہا واقعی رنج کھینچا ہے سخت

نہ آتش، نہ گرمی، نہ بے طاقتی
بہلنے میں سب جذب ہے اُلفتی

اگر آنکھیں کھلتیں تو اودھر نظر
ہوئی خاک معشوقہ جل کر جدھر

گیا منتظر اس کو وہ دن تمام
نظر کر کے کیا دیکھتا ہے کہ شام

خراماں چماں آتی ہے وہ پری
وہی ناز عشوہ وہی دلبری

اسی طرز و انداز و خوبی کے ساتھ
اٹھایا اسے ہاتھ میں لے کے ہاتھ

حیا دار تھی زن گئی اپنے گھر وفادار تھا نہ رہا دیکھ اُدھر
کئی دن میں ہندو زن آنے لگی لیے پانی اس راہ جانے لگی
نگاہیں ہوئیں ہم دگر آشنا محبت کا دونوں نے پانی بھرا
یہی مدتوں دیکھا دیکھی رہی دلوں کی کسو سے نہ ہرگز کہی
جیوں میں شب و روز مرتے رہے ولے پاس ظاہر کا کرتے رہے
رہے دیر تک دونوں ناکام عشق نہ آیا لبوں پر کبھی نامِ عشق
کہیں دردِ دل سو کبھو زیرِ لب وگر نہ سکوں ان کو تھا جب نہ تب
پیے جائیں آنکھیں بھری بہر ضبط کہ جانا نہ جاوے یہ آپس کا ربط
کبھو آہ اُٹھتی تو دم سرد ہو کہیں منکشف تا نہ یہ درد ہو
دلوں میں جو تھی جائے خوں ہو گئے گرفتہ رہے سو جنوں ہو گئے
صبا سے رہے دو طرف کے پیام کہ اے باد کہیو یہ بعد از سلام
خیالات ملنے کے جاتے نہیں قرار و سکوں دل تک آتے نہیں
شب و روز رہتا ہے یاں اضطراب کیا شوق نے کام کر کیا خراب
کوئی طور ملنے کا ایجاد کر نہ جو رحم سے ہو تو بیداد کر
پیام ایک کا یہ کہ اے بادِ نرم کہہ اس کو محبت سے کچھ بھی ہے شرم
تنِ زار بے جان کیوں کر جیے جگر میں نہ ہو خوں تو کیا خوں پیے
ملاقات کا رکھے کیوں کر خیال رہے کیوں کہ جاں ناامیدِ وصال
اسے دیکھنا ہی ہے ارمان بھی اُدھر ہی چل جاتے ہے جان بھی
کہہ اس سے کہ مرتے ہیں تیرے لیے کیا عشق یا جرم ہم نے کیے
نہیں ہے صبر آتا ترے بن ملے لبوں سے جگر تک بھرے ہیں گلے
کسو سے کسو کو نہ ہو جائے روگ کہے تو لگائی ہے سینے میں آگ
کسو لالہ رُخ کا نہ اُٹھے نقاب کہ ہوں داغ دونوں مہ و آفتاب
صبا چلتے اس سے یہ کہہ آئیو کہ غافل ہی ہم سے نہ ہو جائیو
کہیں یوں فراموش ہوتے ہیں یار ہمارا ترا عشق ہے یادگار
نہ کر یوں کہ افسوس باقی رہے گلِ تر پہ چند اوس باقی رہے

ہے مستی، بے خودی ضروری | کھل جائے مقام بے شعوری
دل غم سے بھرا ہے، زور میرا | تا عرش گیا ہے شور میرا
ہے دل میں کہ گل کی اور رُو ہو | شیشہ ہو بغل میں اور تو ہو
جب نکلے ستارۂ سحر گہ | کہہ نعرہ الصبوح یک رہ
ہے ذوق شراب صبح گاہی | بے لطف نہیں ہے روسیاہی
شیشہ مرے منہ کو تو لگا دے | کر ایسی نگاہ جو چھکا دے
جب بے خودی تمام آوے | سر پر مرے ہوش رو کے جاوے
رخصت ہے تجھے کہ میں نہ ہوں گا | بے ہوش و خرد ہی پھر رہوں گا

بیٹھا تو کروں گا شکر تیرا
ہو ورنہ قبول عُذر میرا

مقولۂ شاعر

کیا میر شراب تو نے پی ہے | بے ہودہ یہ گفتگو جو کی ہے
بس مے سے زبان اب نہ تر کر | مستیِ سخن پہ ٹک نظر کر

ہے نشّۂ سامعہ دوبالا
پھر حرف نہ جائے گا سنبھالا

ظالم مئے ناب دے، ہوا ہے / ایک جرعہ شراب دے، ہوا ہے
اطرافِ چمن کھِلا ہے لالہ / ہر پھول شراب کا ہے پیالہ
ابروں نے بھی کی ہے مے پرستی / اُٹھتے ہیں بصد سیاہ مستی
پرندوں کا جو لگ رہا ہے جھمکا / رنگِ گل و لالہ زور چمکا
ہے سروِ جوان نشہ در سر / لوٹے ہے روش پہ سبزۂ تر
چشمک کرے ہے حباب جو کا / یعنی کہ ہے دور اب سبو کا
ساقی قدحے کہ ذوقِ مُل ہے / مطرب غزلے کہ فصلِ گل ہے

ہو صرف شراب کاش ساقی / یہ شیشۂ عمر ہے جو باقی
بے ساغرِ مے خنک ہے جینا / رکھتا ہے شگوں شراب پینا
لا بادۂ کہنہ سالِ نو ہے / سجّادہ بھی بابت گرو ہے
دروازۂ مے کدہ کھُلا ہے / ہر پیر و جواں کو الصّلا ہے
ہر مُغ بچہ جامِ زیرِ سر ہے / ہر گوشے میں عالمِ دگر ہے
مستی نگاہ عقل دشمن / خوبی خرام مرد افگن
کہتے گئے صاحبِ کرامات / ہم ہی نہیں قابلِ خرابات
جو لوگ کہ اس جگہ سے اُٹھّے / کب حلقہ و خانقہ سے اُٹھّے
یاں پیتے ہیں جام بے خودی کا / ہے دَور تمام بے خودی کا
پہنچیں ہیں فنا کو بے خودی سے / پاتے ہیں خدا کو بے خودی سے
پی جرعہ و ہوش کو دعا کہہ / ہر بادہ فروش کو دعا کہہ
کھینچوں میں کہاں تنک دمِ سرد / ساقی وہ شراب شعلہ پُر درد
سرمایۂ عمرِ جاودانی / یعنی ہے وہ آبِ زندگانی
وہ رنگِ رُخِ بہار یعنی / وہ بادۂ خوش گوار یعنی
یاقوت گداز دادۂ عشق / یعنی وہ ہے جام بادۂ عشق

ســہ فتنہ

تھے بہت بیچ میں نشیب و فراز — پہنچے واں شام کھینچ رنج دراز
سو نہ جاگہ تھی نہ مکان بہیت — چار دو کانیں ایک چھوٹی مسیت
گھر ملا صاحبوں کو ایسا تنگ — جس سے بیت الخلا کو آوے ننگ
بیٹھنے دیں نہ جب کہ صاحب کو — کون پوچھے نفر مصاحب کو
ڈھونڈتے ڈھونڈتے سرا پائی — ویسے گھر چھوٹے ویسی جا پائی
رہنا بھٹیاری کے غنیمت جان — جو کہا ان نے ہم گئے سب مان
کچھ پکانے کا جب سوال کیا — میں نے اظہار اپنا حال کیا
یاں جو لائے ہیں مجھ کو اپنے ساتھ — زندگانی مری ہے ان کے ساتھ
پہنچے ہے ان کے روبرو سے طعام — صبح کا صبح مجھ کو شام کا شام
جو کچھ آیا سو کھا لیا میں نے — کچھ رہا سو اٹھا دیا میں نے
سن کے اک دل سے کھینچی ان نے آہ — اور بولی کہ واہ صاحب واہ
ہم تو جانا تھا آدمی ہو بڑے — چار پانچ آدمی ہیں پاس کھڑے
کچھ یہ کھاویں گے کچھ کھلاویں گے — ہم کچھ ان کے سبب سے پاویں گے
سو تو نکلے ہو کورے بالم تم — ہو گدا جیسے شاہِ عالم تم
کھانے پینے کی کچھ نہیں ہے بات — دیکھیے کس طرح سے گزرے رات
میں کہا بھٹیارنی جی کچھ تو — مجھ سے آزردہ دل نہ اتنی ہو
بارے جوں توں ہوئی وہ رات تمام — صبح کو صاحبوں کا ٹھہرا مقام
یہ بھی دن شب ہوا سحر تھا کوچ — غازی آباد کو گئے سب پوچ
صاحب اترے حویلی میں آکر — باغ میں اس کے سب نفر جا کر
اس میں منزل میں ایک روز رہے — گزرے جس طور کوئی کس سے کہے
لوگ جس دم سوار ہونے لگے — اور اسباب بار ہونے لگے
سو ہنی اس روا روی میں گئی — لوگ تھے مضطرب جگہ تھی نئی
وحشت اس کو بس کہ طاری ہوئی — سر پٹک کر کسی طرف کو موئی
مرگ تھی اس کی اس جگہ تقریر — بلّی تھی یا کہ گربۂ تصویر
رنگ جیسے کہ وقت گرگ و پیش — یعنی سرخی تھی کم سیاہی بیش

ننگ نامہ

چاؤ توفیق ٹک تو سرکو دھنو
یہ بھی اک سانحہ ہے میرؔ سنو!

ہم کو درپیش تب سفر آیا
جب کہ برسات سر ہی پر آیا

کیچ پانی میں کیڑے خوار ہوئے
وو ہیں گاڑی میں جا سوار ہوئے

آسماں آب سب، زمیں سب کیچ
خاک ہے ایسی زندگی کے بیچ

شب کہ دریا پہ ہو کے راہ پڑی
پانی کے سطح پر نگاہ پڑی

آب تہ دار اور تیرہ بہت
لہر اٹھتی جو تھی سو خیرہ بہت

پانی پانی تھا شور سے طوفان
دیکھ دریا کو سوکھتی تھی جان

ناؤ میں پاؤں ہم نے بارے رکھا
خوف کو جان کے کنارے رکھا

کیا کہیں ڈوب ہی چلے تھے ہم
نا خدائی خدا نے کی اس دم

بلّی لگتی نہ تھی نہ کچھ تھی تھاہ
عقل گم کردہ لوگ تھے ہمراہ

ریلا پانی کا جب کہ آتا تھا
خوف سے جی بھی ڈوبا جاتا تھا

بہتا پھرتا تھا خضر کشتی پاس
غوطے کھاتے تھے حضرتِ الیاس

کسو درویش کا تھا یمنِ قدم
جا کے پہنچے جو اس کنارے ہم

ورنہ اعمال نے ڈبویا تھا
گوہرِ جاں سے ہاتھ دھویا تھا

اس طرف آ ترے آب کے جاکر
میرؔ اور پیر صاحب وچا کر

پار کا گنج تھا جو شاہ درا
سب نے رہنا وہیں کا جی میں دھرا

وے بچارے بہلتے کرتے ہیں — رات دن لوگ چوکی بھرتے ہیں
کہتے ان سے تو یہ ملے ہے جواب — کس کے گھر سے بناویں لاکے شتاب
ہم کو کھانے ہی کا تردّد ہے — صبح بقّال کا تشدّد ہے
بنیا منہ کو چھپائے جاتا ہے — روٹی کا فکر کھائے جاتا ہے
حال کب پوچھنے کے ہے قابل — ہم فقیروں کے رنگ ہیں سائل
سوچیں ہیں جب تو بھول جاتے ہیں — بات کہتے ہیں بھول جاتے ہیں
تم کو دیوار پا کھے ہیں گے یاد — ہم کو کرتا نہیں خدا آزاد
کس کو موسیں کہاں سے کچھ لاویں — دال آٹا جو تم کو پہنچاویں
تم کہو دال ماش کی ہے زبوں — یاں بہم پہنچے ہے جگر ہو خوں
تم کہو آٹا کرکرا کھایا — یاں کلیجہ چھنا تو ہاتھ آیا
فصل ہونے ابھی نہیں پائی — پیشگی سب سے قرض لے کھائی
جس سے جھوٹے ہوئے ہیں ہم دس بار — چوٹٹا وہ کہے ہے ساہوکار
ماش کی دال کا نہ کریے گلا — گوشت یاں ہے کبھو کسو کو ملا
بکری لینے کو پیسے ہیں کس پاس — کھاؤ دال اور پادو بے وسواس
جی اگر چاہے کوئی ترکاری — گول کدّو ملے بہ صد خواری
بھنڈی بینگن کے ناؤں ڈھنڈس تھا — اروی توری بغیر جی بس تھا
دارو گولی کے کچھ نہ تھے اسباب — ماش کی دل کھلانے تھے احباب
گھاس ہی گھاس اس مکاں میں تمام — تس میں لسّاع جانور اقسام
جیسے زنبور زرد ایسے ڈانس — کاٹ کھاویں تو اچھلو دو دو بانس
پشّہ و کیک اور کتّی تھی — جن کے کاٹے اچھلتی بتّی تھی
ہاتھ پنڈوں پہ سب چلے جاتے — شب گزروں سے بدن جلے جاتے
دن کو وہ صورتِ طعام ہوتی — رات کو نیند یوں حرام ہوئی
کتّوں کے چاروں اور رستے تھے — کتّے ہی واں کہے تو بستے تھے
دو کہیں تھے کھڑے کہیں بیٹھے — چار لوگوں کے گھر میں ہیں بیٹھے
ایک نے چھوڑے باسن ایکو نے — کھود مارے گھروں کے سب کونے

جن سے مالوف تھی وہیں رہتی — ان سے کچھ کچھ لگا ہوں میں کہتی
کیا نفاست مزاج کی کہیے — ستھری اتنی کہ دیکھ ہی رہیے
خال جوں پھول گل کترتے ہیں — یا کہ نقشوں میں رنگ بھرتے ہیں
چوہے چڑیا پہ ان نے کب کی نظر — حج کا کرنا نہ فرض تھا اس پر
موہنی بھی تو تھی بہن اس کی — نسبت اس کی تھی وہ بہت گھس کی
پاوے جو کچھ سو مار کھاوے یہ — ایک کیا چار چار کھاوے یہ
جانور مارنا تو ہے یک سو — تیز پنجہ کیا نہ ان نے کبھو
کبک اس کی خرام کے عاشق — جانور اس کے نام سے عاشق
غرض افسوس کی جگہ بلّی — اب کہاں گو کہ چھانیے دِلّی
ایسی بیگم مزاج بلّی کھو — بیگم آباد ہو گئے بارو
واں سے میرٹھ سبھوں نے کی منزل — کیچ پانی اگرچہ تھا حائل
گرتے پڑتے پہنچ گئے سارے — ہم جفائے سپہر کے مارے
واں دلاور نسنگ پھر واں سے — جا کے واں تنگ آ گئے جاں سے
اک گھڑی بود و باش کو پائی — کچھ نہ کھانے کو جس میں نے کھائی
چھوٹی پھاٹی سی چار دیواری — اور میدان تھی گڑھی ساری
کھنڈر سے اس میں تین چار مکان — جن کا گرنے پہ سخت ہے میلان
وہ گڑھی سارے کھتّے ناج کے تھے — سرسوں سے تھے پڑے نہ آج کے تھے
خشتی پائے اگر نہ بنواتے — باؤ میں اس سمیت اُڑ جاتے
باؤ جنگل کی تُند کچھ نہ رکاؤ — مینھ میں پل پڑے تو کانپے جاؤ
اک گھڑی جس کی سینکڑوں راہیں — واں ٹھہرنے کو چاہیے باہیں
وہ رہے جو رکھے بہت سے لوگ — یا کوئی جوگی جو کرے واں جوگ
ورنہ مشکل بہت ثبات قدم — دل میں اک ہول ہی رہے ہر دم
باؤ سی دن کو سائیں سائیں کرے — رات ہووے تو بھائیں بھائیں کرے
گر شکستہ ہوئی کہیں دیوار — بے زری سے بنانا ہے دِیوار
کار پردازوں کو تشدّد ہے — شور ہے گالی ہے تشدّد ہے

در ہجو خانۂ خود

کیا لکھوں میر اپنے گھر کا حال ۔۔۔ اس خرابے میں، میں ہوا پامال
گھر کہ تاریک و تیرہ زنداں ہے ۔۔۔ سخت دل تنگ یوسف جاں ہے
کوچۂ موج سے بھی آنگن تنگ ۔۔۔ کوٹھری کے حباب کے سے ڈھنگ
چار دیواری سو جگہ سے خم ۔۔۔ تر تنک ہو تو سوکھتے ہیں ہم
لونی لگ لگ کے جھڑتی ہے ماٹی ۔۔۔ آہ کیا عمر بے مزہ کاٹی
کیا تھمے مینھ شقف چھلنی تمام ۔۔۔ چھت سے آنکھیں لگی رہے ہوں مدام
اس چکش کا علاج کیا کریے ۔۔۔ راکھ سے کب تلک گھڑے بھریے
جا نہیں بیٹھنے کو مینھ کے بیچ ۔۔۔ ہے چکش سے تمام ایواں کیچ
آنکھیں بھر لاکے یہ کہے ہیں سب ۔۔۔ کیوں کہ پردا رہے گا یارب اب
جھاڑ باندھے ہے مینھ نے دن رات ۔۔۔ گھر کی دیواریں ہیں گی جیسے پات
ایک حجرہ جو گھر میں ہے واثق ۔۔۔ سو شکستہ تر از دلِ عاشق
کہیں گھوسوں نے کھود ڈالا ہے ۔۔۔ کہیں چوہے نے سر نکالا ہے
کہیں گھر ہے کسو چھچھوندر کا ۔۔۔ شور ہر کونے میں ہے مچھر کا
کہیں مکڑی کے لٹکے ہیں جالے ۔۔۔ کہیں جھینگر کے بے مزہ نالے
کونے ٹوٹے ہیں طاق پھوٹے ہیں ۔۔۔ پتھر اپنی جگہ سے چھوٹے ہیں
اینٹ چونا کہیں سے گرتا ہے ۔۔۔ جی اسی حجرے ہی میں پھرتا ہے

کوئی گھورا کرے کوئی بھونکے / خفتہ خفتہ بھی شور سے چونکے
سانجھ ہوتے قیامت آئی ایک / شور عف عف سے آفت آئی ایک
گلّہ گلّہ گھروں پہ پھرنے لگے / روٹی ٹکڑے کی بو پہ گرنے لگے
ایک نے آکے دیگچہ چاٹا / ایک آیا سو کھا گیا آٹا
ایک نے دوڑ کر دیا پھوڑا / پھر پیا آکے تیل اگر چھوڑا
جاگتے ہو تو دو بہ دو کتّے / سو کرا ٹھو تو رو بہ رو کتّے
آدمی کی معاش ہو کیوں کر / کتّوں میں بود و باش ہو کیوں کر
بستی دیکھی سو ایسی تھی آباد / کہ بیاباں سخت ہے دے باد
چار چھپّر کہیں چماروں کے / سو بھی ٹوٹے گرے بچاروں کے
پھر چلو آگے تو نہیں ہے کچھ / ڈھونڈھ سا اور جو کہیں ہے کچھ
پھوٹی ٹوٹی کوئی حویلی ہے / سو بھی میدان میں اکیلی ہے
اس سے آگے بڑھے تو ڈھینور تھے / اجڑے بجڑے انھوں کے کچھ گھر تھے
اور آگے گئے تو تھا بازار / اس میں بنیوں کی تھیں دکانیں چار
اور دس بیس گھر گنواروں کے / اور دو چار فاقہ ماروں کے
پھوٹی مسجد خطیب تھا نہ اذاں / یہی خانہ خطیب کا تھا واں
نہ تھی قید صلوٰۃ و رسم صوم / اس پہ سیّد امام واں کی قوم
بندے سب جن کا تھا خدا نہ کوئی / اس طریقے سے آشنا نہ کوئی
راہ و رسم و طریق سب بے ڈھب / پہلے گالی تھی پیچھے حرف بہ لب
ایک تکیہ نہ جس میں فرش کاہ / حال درویش قابل صد آہ
گرد جو چار خاک کے سے ڈھیر / جن کو کہتے تھے لیٹے ہیں یاں شیر
اپنا تو اعتقاد تھا ہی کم / پر کبھو بلّی بھی نہ دیکھی ہم
کچھ نہ دیکھا ہم ان بھی گوروں سے / کام نکلا سو اپنے زوروں سے
آس پاس اس گھڑی کے آئی جھیل / گم تھے برسات میں طریق و سبیل
اس سے واں کی ہوا بہت مرطوب / ہووے نزلہ زکام بے اسلوب
کتنے زوروں میں ہوتی ہے کھانسی / ایسے جیسے گلے میں دیں کھانسی
کیا کڈھب چرخ کج نے پھینکا تھا / پر خدا کچھ ہمارا سیدھا تھا
جس نے قدرت نمائی کی اپنی / اس بلا سے رہائی کی اپنی

بند رکھتا ہوں در جو گھر میں رہوں — قدر کیا گھر کی جب کہ میں ہی نہ ہوں
گھر بھی پھر ایسا جیسا ہے مذکور — ہے خرابی سے شہر میں مشہور
جس سے پوچھو اسے بتاوے شتاب — ساری بستی میں ہے یہی تو خراب
ایک چھپّر ہے شہرہ دلّی کا — جیسے روضہ ہو شیخ چلّی کا
مینہ میں کیوں نہ بھیگیے یک سر — پھونس تو بھی نہیں ہے چھپّر پر
واں پہ ٹپکا تو یاں سرک بیٹھا — یاں جو بھیگا تو واں تنک بیٹھا
حال کس کو ہے اولتی کا یاد — مگری اس جھگڑے میں گئی برباد
کہیں صحنک رکھوں کہیں پیالا — کہیں ہانڈی کے ٹھیکرے
ٹپکے دو چار جا تو بند کروں — پیچ کوئی لڑاؤں فند کروں
یاں تو جھانکے ہزار میں تنہا — کچھ نہیں ہائے مجھ سے ہو سکتا
بس کہ بد رنگ ٹپکے ہے پانی — کپڑے رہتے ہیں میرے افشانی
کوئی جانے کہ ہولی کھیلا ہوں — کوئی سمجھے ہے کہ یہ خیلا ہوں
بان جھینگر تمام چاٹ گئے — بھیگ کر بانس چھاٹ پھاٹ گئے
تنکے جاں دار ہیں جو بیش و کم — تن پہ چڑیوں کو جنگ ہے باہم
پوچھ مت زندگی کیسی ہے — ایسے چھپّر کی ایسی تیسی ہے
بوریا پھیل کر بچھا نہ کبھو — کونے ہی میں کھڑا رہا یک سو
ڈیوڑھی کی ہے یہ خوبی در ایسا — چھپّر اس چونچلے کا گھر ایسا
جنس اعلیٰ کوئی کھٹولا کھاٹ — پائے پٹی رہے ہیں جن کے پاٹ
کھٹملوں سے سیاہ ہے سو بھی — چین پڑتا نہیں ہے شب کو بھی
شب بچھونا جو میں بچھاتا ہوں — سر پہ روز سیاہ لاتا ہوں
کیڑا ایک ایک پھر مکوڑا ہے — سانجھ سے کھانے ہی دوڑا ہے
ایک چٹکی میں ایک چھنگلی پر — ایک انگوٹھا دکھا دے انگلی پر
گرچہ بہتوں کو میں مسل مارا — پر مجھے کھٹملوں نے مل مارا
ملتے راتوں کو گھس گئیں پوریں — ناخنوں کی ہیں لال سب کوریں
ہاتھ تکیے پہ گہ بچھونے پر — کبھو چادر کے کونے کونے پر

چار پائی جب اس میں بچھوائی
پہلے چل پاسہ ہی نظر آئی

پیکر اپنی خدا نے رکھی ہے
ڈانس ایک ایک جیسے مکھی ہے

آ گئے اس حجرے کے ہے اک ایوان
وہی اس ننگِ خلق کا ہے مکان

کڑی تختے سبھی دھوئیں سے سیاہ
اس کی چھت کی طرف ہمیشہ نگاہ

کبھو کوئی سنپولیا ہے پھرے
کبھی چھت سے ہزار پائے گرے

کوئی تختہ کہیں سے ٹوٹا ہے
کوئی داسا کہیں سے چھوٹا ہے

دب کے مرنا ہمیشہ مدِّ نظر
گھر کہاں، صاف موت ہی کا گھر

مٹی تودہ جو ڈالی چھت پر ہم
تھے جو شہتیر جوں کماں ہیں ہم

مضطرب ہو کے جو بچھائی بہت
ہر کڑی نے کڑی اٹھائی بہت

اینٹ مٹی کا در کے آگے ڈھیر
گرتی جاتی ہے ہولے ہولے منڈیر

کنگنی دیوار کی سٹ لے حال
پدڑی کا بوجھ بھی سکے نہ سنبھال

طوطا مینا تو ایک بابت ہے
پودنا پھدکے تو قیامت ہے

کیونکہ ساون کٹے گا اب کی بار
تھرتھراوے بھنبھیری سی دیوار

ہو گیا ہے جو اتفاق ایسا
شاق گزرے ہے کیا کہوں کیسا

ہو کے مضطر لگے ہیں کہنے سب
اڑ بھنبھیری کہ ساون آیا سب

تیتری یاں جو کوئی آتی ہے
جانِ محزوں نکل ہی جاتی ہے

نہیں دیوار کا یہ اچھا ڈھنگ
کہیں کھسکی تو ہے قیامت ننگ

ایک دن ایک کوّا آ بیٹھا
بے گماں جیسے ہوّا آ بیٹھا

چیل سے لوگ دوڑے کرتے شور
کہ نہ خایط میں کچھ رہا تھا زور

ہو نہ ایسا کہ اپنی چال چلے
دوڑے اُچھلے کہ ہاں ہاں چلے

نہیں وہ زاغ چار پاؤں پھرا
ایک کالا پہاڑ آن گرا

مٹی اس کی کہیں کہیں بھسکی
جی ڈہا اور چھاتی بھی دھسکی

سان کر خاک لگ گئے دو چار
بارے جلدی درست کی دیوار

اُکھڑے پکھڑے کواڑ ٹوٹی وصید
زلفِ زنجیر ایک کہنہ جدید

خاک لوہے کو جیسے کھاوے پاک
چھیڑ بیجیے تو پھر نری ہے خاک

اب وہی گھر ہے بے سروسایہ — اور میں ہوں وہی فرومایہ
دن کو ہے دھوپ رات کو ہے اوس — خواب راحت ہے یاں سے سوسو کوس
قصہ کوتہ دن اپنے کھوتا ہوں — رات کے وقت گھر میں ہوتا ہوں
نہ اثر بام کا نہ کچھ در کا
گھر ہے کا ہے کا نام ہے گھر کا

در ہجو خانۂ خود کہ بہ سبب شدت باراں خراب شدہ بود

جسم خاکی میں جس طرح جاں ہے — اس طرح خانہ ہم پہ زنداں ہے
ظلمتیں اس کی سب پہ روشن ہیں — زندہ درگور ہم کئی تن ہیں
ہے جو سرکوب اک بڑی دیوار — واں سے جھانکو تو ہے اندھیرا غار
بخت بد دیکھ سارے پرنالے — اس کے معمار نے اِدھر ڈالے
اب جو آیا ہے موسمِ برسات — دن کو ہے اپنے ہاں اندھیری رات
صحن میں آب نیزہ بالا ہے — کوچۂ موج ہے کہ نالا ہے
مینھ میں گھر کے پانچ چھ چھپّر — غم غریبوں کے ہوتے ہیں سرپر
پر تلک تنکے تھے کچھ ایک نئے — سو وے چڑیوں کے گھونسلوں کو گئے
دل ہے کچھ مکڑیوں کا احسان مند — کہ جنھوں نے کیے ہیں جھانکے بند
پھوس کچھ ہے کہیں سو آٹا ہے — بانس کو جھینگروں نے چاٹا ہے
کیا کہوں آہ گھر ہے کہنے کو — باندھتا ہوں مچان رہنے کو
ٹٹیاں تھیں جو آگے چھپّر کے — بہتی پھرتی ہیں صحن میں گھر کے
تا گلے سب کھڑے ہیں پانی میں — خاک ہے ایسی زندگانی میں
اب تو اپنا بھی حال ہے بدتر — سر پہ گٹھری ہے تپہ ہے چھپّر
پانی بہہ کر جُھکا جو ہے دالان — سر پہ رہتا ہے طُرّۂ ایوان
چاک اس ڈول سے ہے ہر دیوار — جیسے چھاتی ہو عاشقوں کی فگار
متصل ٹپکے ہے نہ باراں ہے — گریۂ زار سوگواراں ہے

بِل بِلایا جو پائنتی کی اور — وہیں مسلا کر ایڑیوں کا زور
توشک ان رگڑوں ہی میں سب پھاٹی — ایڑیاں یوں رگڑتے ہی کاٹی
جھاڑتے جھاڑتے گیا سب بان — ساری کھاٹوں کی چولیں نکلی ندان
نہ کھٹولا نہ کھاٹ سونے کو — پائے پٹی لگائے کونے کو
یہ جو بارش ہوئی تو آخرکار — اس میں سی سالہ وہ گری دیوار
ایسے ہوتے ہیں گھر میں تو بیٹھے — جیسے رستے میں کوئی ہو بیٹھے
دو طرف سے تھا کتوں کا رستہ — کاش جنگل میں جا کے میں بستا
ہو گھڑی دو گھڑی تو دُھتکاروں — ایک دو کتے ہوں تو میں ماروں
چار جاتے ہیں چار آتے ہیں — چار عف عف سے مغز کھاتے ہیں
وہ جو ایواں تھا حجرے کے آگے — اس کے اجزا بکھرنے سب لاگے
کوٹھا بوجھل ہوا تھا بیٹھ گیا — پانی جُز جُز میں اس کے بیٹھ گیا
کڑی تختہ ہر ایک چھوٹ پڑا — ناگہاں آسمان ٹوٹ پڑا
میں تو حیران کار تھا اپنا — کوئی اس دم نہ یار تھا اپنا
اینٹ پتھر تھے مٹی تھی یک سر — خاک میں مل گیا تھا گھر کا گھر
چرخ کی کج روی نے پیسا تھا — پر خدا میرا مجھ سے سیدھا تھا
کتنے اک لوگ اس طرف دھائے — یا ملک آسمان سے آئے
صورت اس لڑکے کی نظر آئی — ہم جو مُردے تھے جان سی پائی
قدرت حق دکھائی دی آکر — یعنی نکلا درست وہ گوہر
داشت کی کوٹھری میں لا رکھا — گھر کا غم طاق پر اُٹھا رکھا
مومیائی کھلائی کچھ ہلدی — فرصت اس کو خدا نے دی جلدی
آنکھ کھولی اِدھر اُدھر دیکھا — اِس خرابی کو بھر نظر دیکھا
غم ہوا سُن کے دوست داروں کو — پھر بندھا یہ خیال یاروں کو
کہ مری بود و باش یاں نہ رہے — گو تصرّف میں یہ مکاں نہ رہے
شہر میں جا بہم نہ پہنچی کہیں — چار ناچار پھر رہا ہوں وہیں

در مذمت برشگال کہ باراں دراں سال بسیار شدہ بود

کیا کہوں اب کی کیسی ہے برسات
جوشِ باراں سے بہہ گئی ہے بات

بوندِ تھمتی نہیں ہے اب کی سال
چرخ گویا ہے آب در غربال

وہی یکساں اندھیر برسے ہے
آسماں چشمِ وا کو ترسے ہے

چرخ تک ہو گیا ہے پانی جو
ماہ و ماہی ہیں ایک جا ہر دو

لے زمیں سے ہے تا فلک غرقاب
چشمۂ آفتاب ہیں گرداب

خشک بن اب کی بار سبز ہوئے
موشِ دشتی کے خار سبز ہوئے

تنگ آبی سے جان مستِ اغراق
ڈوبنے پر ہے کشتیِ آفاق

کیسا طوفان مینھ چھایا ہے
زخمِ دل نے بھی اب اٹھایا ہے

نہ ہے جلسہ نہ ربطِ یاراں ہے
شہر میں ہے تو باد و باراں ہے

روز و شب یاں ہمیشہ جھمکا ہے
ان دنوں رنگِ برق چمکا ہے

پڑی بوندوں کی چوٹ سے ڈریے
سنگِ باراں جہاں ہو واں مریے

پڑھتے ہیں یار درسِ حیرانی
آرسی کے بھی گھر میں ہے پانی

آدمی ہیں سو کب نکلتے ہیں
مردمِ آبی پھرتے چلتے ہیں

معبد اب سارے گرتے آتے ہیں
زاہدِ خشک ڈوبے جاتے ہیں

شعر کی بحر میں بھی ہے پانی
بہتی پھرتی ہے اب غزل خوانی

مستی ہے اب جو چاہیں سیرابی
بطِ مے تو ہوئی ہے مرغابی

ہر طرف ہیں نظر میں ابرِ سیاہ
پانی ہے جس طرف کو کریے نگاہ

خضر کیوں کر کے زیست کرتا ہے
اب جیواں میں پانی مرتا ہے

لکھے کیا میر مینھ کی طغیانی
ہو گئی ہے سیاہی بھی پانی

گھر کی صورت جو اور ہوتی ہے
چھت بھی بے اختیار روتی ہے

مینھ یک بارگی جو ٹوٹ پڑا
کڑی تختہ ہر ایک چھوٹ پڑا

داسے پایانِ کار ٹوٹ گئے
طاقچے بھر رہے تھے پھوٹ گئے

یوں دھنسا گھر کہ بارِ خاطر تھا
آہ کس کا غبار خاطر تھا

اُکھڑی دہلیز سب منڈیر گری
لہر پانی کی جھاڑو دیتی پھری

ساری بنیاد پانی نے کاٹی
اینٹ کے گھر کو کر دیا ماٹی

آؤ اب چھوڑ کر یہ گھر نکلیں
کسو ٹٹی پہ بیٹھ کر نکلیں

ڈب کے مرنے سے ڈوب مرنا خوب
ہے کنارا یہاں سے کرنا خوب

سن کے ہر اک کے جی میں ڈر آیا
خاطروں میں یہ حرف ٹھہرایا

گٹھری کپڑوں کی میں اٹھائی تھی
سر پہ بھائی کے چارپائی تھی

بوجھ کپڑوں کا جن نے باندھا تھا
اس کا سارا فگار کاندھا تھا

ساتھ کوئی چراغ لے نکلا
کوئی سر پر اجارغ لے نکلا

چھاج کی کر کے کوئی اوٹ چلا
مینھ کے مارے کوئی لوٹ چلا

اپنا اسباب گھر سے ہم لے کر
الگنی سب کے ہاتھ میں دے کر

صف کی صف نکلی اس خرابی سے
تاکہ پہنچیں کہیں شتابی سے

میر جی اس طرح سے آتے ہیں
جیسے کنجر کہیں کو جاتے ہیں

جس نے اس وقت آنکھ کو کھولا
ہنس کے بے اختیار وہ بولا

سن کے اس بات کو نرائے ہم
بارے اک بھائی کے گھر آئے ہم

تب سے رہنے کو اب تلک ہیں خراب
نہیں ملتا ہے گھر بہ قدر حباب

جس میں خوش یک نفس معاش کریں
طور پر اپنے بود و باش کریں

مرغ بازوں کو ہے قیامت جوش
جس کو دیکھو تو مرغِ در آغوش

مرغ لڑتے ہیں ایک دو لاتیں
سیکڑوں ان سفیہوں کی باتیں

اُن نے پَر جھاڑے یہ پھڑ کنے لگے
اُن نے کی نوک یہ کڑ کنے لگے

وہ جو سیدھا ہوا تو یہ ہیں کج
ساتھ اس کے بدلتے ہیں سج دھج

مرغ کی ایک پر فشانی ہے
ان کی صد رنگ بد زمانی ہے

ایک بولے کہ کاری آئی چوٹ
ایک کہتا ہے بس گیا اب لوٹ

جھکتے ہیں آپ کو ترا تے ہیں
لاتیں گو یا کہ یہ ہی کھاتے ہیں

طرفہ ہنگامہ طرفہ صحبت ہے
بعد نصف النہار رخصت ہے

کھانچے سر پر بغل میں مارے مرغ
لے گئے جیتے ہارے سارے مرغ

پھر جو روزِ معیّن آوے گا
نالہ مرغِ سحر سُناوے گا

عالم آوے گا گرو ویسا ہی
گرد ہنگامہ ہو گا ایسا ہی

میرؔ اُن کا نہ ہووے گو قائل
مرغ معنی پہ وہ بھی ہے مائل

دربیانِ مرغ بازاں

دلّی سے ہم جو لکھنؤ آئے
گرم پرخاش مرغِ یاں پائے

مرغ ہے ایک ایک جیسے کلنگ
قاز و سارس سے جنگ جس کا ننگ

لات کی گھات کر جو مُڑ جاوے
بسر طائر کا رنگ اُڑ جاوے

زہرہ ققنس کا اس خطر سے آب
شب نہ سووے ہراس سے سرخاب

آدمی جو بڑے کہاتے ہیں
مرغ مارے بغل میں آتے ہیں

لات ماری جو کاٹ کر حلقوم
حیدرآباد تک پڑی ہے دھوم

نے ثنا سے بطیں ہی ہیں تر لب
مرغ عیسیٰ ہیں مدح خواں ہر شب

ٹینی کے سر پہ آج ٹیکا ہے
اس کے آگے کنبیل پھیکا ہے

اڑ گیا حلق کا جو لڑتے پوست
کی صدا مرغ دوست نے ہی دوست

شورِ جنگ آوری کا تا کہسار
کبک کا گھر خروں پر ہے بار

مرغ بازوں سے ساز کر دیکھا
درِ الطاف باز کر دیکھا

ربط رکھا بہت انھوں کے ساتھ
ایک پر مرغ کا نہ آیا ہاتھ

مرغ کا مرغ ہووے مرغ انداز
مرغ ایسا ہو تو بجا ہے ناز

یعنی اپنا حریف جب پاوے
پَر ہلانے نہ دیوے کھا جاوے

بازی بد بد کے جب لڑاتے ہیں
کانٹے لوہے کے باندھ لاتے ہیں

جیسے منگل کو پالی کی ہے دھوم
گلیوں میں روز حشر کا ہے ہجوم

کسب جو کرتے تھے یہ فن شریف
ان میں سے کوئی نہ تھا میرا حریف

کتنے اک نو مشق تھے گرمِ سخن
سو بچارے آپ ہی ناآگاہِ فن

مدّعی میرا ہوا یہ بے ہنر
مردۂ صد سالہ سا بے نور تر

ایک جا آکے شتر قد گھر گیا
واں شترِ غمزہ سا مجھ سے کر گیا

رہ گیا میں پی کے لوہو کا سا گھونٹ
یعنی دیکھوں بیٹھے ہے کس کل یہ اونٹ

جب لگا ہی ناچنے مستی سے خوب
تب لیا میں نے قلم کے زیرِ چوب

مستی اس کی ساری اب جھڑ جائے گی
دھوم ساری گلیوں میں پڑ جائے گی

جب بڑوں سے مار ناہموار کھائیں
کج خرامی سے تب اپنی باز آئیں

راہ سیدھا ہو کے چلتا ہے بلے
اونٹ جب آیا پہاڑوں کے تلے

سر کے تئیں اس کے جو دیکھوں کر نگاہ
بانس پر اک اوندی ہانڈی ہے سیاہ

تیرہ رو مضحک سراپا زور ہے
دم اگر ہووے تو پھر لنگور ہے

ایک دن بیٹھے تھے یاں ذاتِ شریف
وارد اُس دن ہو گئے کتنے ظریف

ایک بولا دیکھ کر حیران ہو
یہ جزائر کا کوئی حیوان ہو

یاں تو ایسا جانور دیکھا نہیں
سر کہیں ہے پاؤں اس کے ہیں کہیں

ایک نے ہنس کر دیا اس کو دھکیل
اور بولا اے تری قدرت کے کھیل

ایک بولا کر کے چشمک میری اور
واہ صاحب جانور پالا ہے زور

اُس کو یاروں نے غرض کیا کیا کہا
لیک یہ خر نا مشخص ہی رہا

بے سبب سرگرم کیں ہم سے ہوا
مستحقِ لعنتِ عالم ہوا

چل قلم اب ہے ارادہ جنگ کا
پاس کب تک کیجیے نام و ننگ کا

یا زبردستوں کو دعویٰ کھا گیا
یہ چھپا رستم کہاں سے آگیا

ناقباحت فہم کو دعوے پڑا
ہو کے تنکا سا پہاڑوں سے اڑا

ہاتھی کی ٹکّر کو ہاتھی ہی اٹھائے
چیونٹی کا کیا جگر جو منہ پہ آئے

میں نے پاس اس کا کیا حد سے زیاد
پر کمی کرتا ہے یہ ابنِ زیاد

رشکِ شہرت سے مری مرنے لگا
میری عزت کا حسد کرنے لگا

لگ گئی چپ اُس کو میرے شور سے
یہ نہ سمجھا ہے خدا کی اور سے

در ہجو نا اہل مسمّٰی بہ زبان زدِ عالم

سُنیو اے اہلِ سخن بعد از سلام
چھیڑتا ہے مجھ کو اک تخمِ حرام

شاعری کو میرے ہو گے جانتے
تم چناں چہ سب مجھے ہو جانتے

میں ہمیشہ سے رہا ہوں باوقار
کن دنوں تھا ہجو کا کرنا شعار

رہیو شاہد کچھ نہیں میرا گناہ
مدّعی بے ہیچ ہے یہ روسیاہ

تھا تحمّل مجھ کو، میں درویش تھا
دردمند و عاشق و دل ریش تھا

پر کروں کیا لاعلاجی سی ہے اب
غصّے کے مارے چڑھی ہے مجھ کو تب

ایسے کتنے ہیں جو اب شاعر بنے
مدّتوں یہ لونڈے آئے مجھ کنے

ایک باتوں سے مری آدم ہوا
اک نظر سے شہرۂ عالم ہوا

ایک نے دیواں کی مرے نقل لی
اس دِوانے کی کنھوں نے عقل لی

ایک میرے طرز پر کہنے لگا
دوسرا پیرو مرا رہنے لگا

سارے عالم میں ہوں میں چھایا ہوا
مستند ہے میرا فرمایا ہوا

دور سے کرتا ہے بیٹھا سب کی دید
کوئی سر کھینچو ہے میرا مستفید

کوئی بے تہ گو نہ جانے میری قدر
پائیں ہے پائین آخر صدر صدر

ہے گی شخصیت خدا کی اور سے
ہاتھ کب آوے بزرگی زور سے

جو بڑے ہیں وے ہی آخر ہیں بڑے
ایسے مچّے بہت پھرتے ہیں پڑے

شہر میں آیا میں بعد از بست[2] سال
گم تھا یاں سررشتۂ قال و مقال

تنبیہ الجہّال

صحبتیں جب تھیں تو یہ فنِ شریف — کسب کرتے جن کی طبعیں تھیں لطیف
تھے ممیّز درمیاں انصاف تھا — خار و خس سے کیا یہ عرصہ صاف تھا
دخل اس فن میں نہ تھا اجلاف کو — کچھ بتاتے تھے کبھی، سو اشراف کو
تھے جو اس ایّام میں استادِ فن — ناکسوں سے وے نہ کرتے تھے سخن
گر چمار اس کارخانہ میں نہ ہو — ٹوٹے جوتے کو کہاں لے کر پھرو
چار و ناچار اس کنے جانا پڑے — کوڑیاں دے جوتی گٹھوانا پڑے
حاجت اس فرقے سے مطلق یاں نہیں — جو نہ ہو شاعر تو کچھ نقصاں نہیں
یہ تو دنیا میں ہے اس فن کا کمال — دین کا اس فرقے کے پوچھو نہ حال
کذب ہو جس جائے رونق بخش سمع — واں کی دیں داری رکھو اور دل جمع
جھوٹ آوے اس قدر جب درمیاں — تو یقین ایمان کیا، دیں کہاں
ہم تلک تھی بھی وہی رسم قدیم — یعنی جن کے ہوتے تھے ذہنِ سلیم
پیار کرتے تھے انھیں استادِ فن — ان کے ہوتے رہبرِ راہِ سخن
جلف واں زنہار پاتے تھے نہ بار — شاعری کا ہے کو تھی ان کا شعار
نکتہ پردازی سے اجلافوں کو کیا — شعر سے بزّازوں، ندّافوں کو کیا
الغرض یاروں نے قیدیں دیں اٹھا — جو کوئی آیا، اسے دی پاس جا
ٹک نہ استعداد سے کی گفتگو — کچھ نہ رکھی شاعری کی آبرو

یہ قبولِ خاطرِ لطفِ سخن
دے ہے کب سب کو خدائے ذوالمنن

ایک دو ہی ہوتے ہیں خوش طرز و طور
اب چناں چہ میر و مرزا کا ہے دور

دشمنی تھی اُس کو مجھ سے کیا ضرور
حیف ایسی عقل لعنت یہ شعور

ہوں جو میں پرتو فگن تو ہے یہ کیا
خور کے آگے ذرّہ کب ٹھہرا رہا

خونِ دل آشام ہیں جو صبح و شام
وے بھی لیتے ہیں ادب سے میرا نام

یہ مری رہ کا نہ حائل ہو سکے
یہ موئی جوں کیا مقابل ہو سکے

میں نے اُلٹی اژدروں کی دم میں صف
ادھ موئی سی چھپکلی کیا ہو طرف

رکھتی ہے میری شرافت اشتہار
گو یہ ناسیّد کہے ہے کیا چمار

دار و دستی سے ہے اس کے منہ کو شرم
تب تو میں باتیں کروں ہوں نرم نرم

ان عزیزوں کا نہایت پاس ہے
ورنہ یہ ملعون کیا کتّاس ہے

جو نہ سمجھا تیغ خامے کی ہے پاس
کانوں کا یوں جس طرح کٹتی ہے گھاس

جب سے لے آیا قدم اپنا یہ شوم
تب سے ویراں ہو گئی یہ مرز بوم

کیا کمی ہے یہ جو عزت کم کرے
گو نہ شیطاں سجدۂ آدم کرے

کرتی ہے تعظیم میری کائنات
لعنت اس پر ہوتی ہے دن اور رات

بیت کہنا چاہتا ہے سو ہنر
شاعری سمجھا تھا کیا خالہ کا گھر

چار سکھیاں کہہ کے شاعر ہو گیا
اس فنِ مشکل کا ماہر ہو گیا

کچھ نہیں معلوم اس کا سرّ کار
تب تو ٹھہرایا ہے اس کو راز دار

بس قلمِ نفریں ہے میری بس اسے
ہے دماغِ بحث پاجی اب کسے

رکھ زباں کیدھر گیا تیرا مزاج
پوچ گو بہتیرے پھرتے ہیں پواج

اژدر نامہ

یہ موذی کئی ناخبردارِ فن — نئی ناگنیں جن کے ٹیکوں پہ پھن
نہیں جانتی ہوں میں مارِ سیاہ — زمانہ ہے آتش کا میری نگاہ
نفس ہے مرا افعی پیچ دار — گیا جس سے خصمِ قوی من کو مار
جدھر پھر نظر دیکھوں لگ جائے آگ — دمِ دم کشی اب یہ کھیلیں ہیں ناگ
جہاں میں ہوں، وہ چلا ہے پُرشر و شور — عصا سے چلے راہ واں مار و مور
مری آنکھ سے زہرہ ٹپکا کیا — جلا آگے میرے کبھو کب دِیا
اگر شورِ زاغاں سے ڈر جائے مار — تو کیا اجگروں کا رہے اعتبار
ہزار اجگر اندوہ سے جائے لُٹ — وے ایسے کیڑے مکوڑے ہیں چٹ
بہ ظاہر یہ لائے تو ہیں پر نکال — وے ہوں گے ان کے جیو کے وبال
جہاں شیر کا زہرہ ہوتا ہو آب — شغال اور روبہ کا واں کیا حساب
مری ان گزندوں کی صحبت ہے یہ — طرف ہوں مری ان کی طاقت ہے یہ
مری قدر کیا ان کے کچھ ہاتھ ہے — جو رتبہ ہے میرا مرے ساتھ ہے

کہاں پہنچیں مجھ تک یہ کیڑے حقیر
گیا سانپ پیٹا کریں اب لکیر

چار سکھیاں کہہ کے دیں نا کس کے ہاتھ
پھر اسے مجلس میں لائے اپنے ساتھ

آپ بیٹھے صدر میں وہ دستِ چپ
کرنے لاگے شاعری سے حرفِ گپ

بولے ان کو آج کل سے ہے خیال
ذہن ان کا تیزی رکھتا ہے کمال

ہو رہیں گے کچھ اگر صحبت رہی
اور ہم سے بھی انھیں الفت رہی

جب ہوا ثابت وہ ان کا مستفید
سب نے جانا اس کو شاگردِ رشید

کی اشارت تا کہ وہ کھولے دہن
آگے استادوں کے ہو گرمِ سخن

ان کے ایما سے وہ کچھ پڑھنے لگا
صاحبانِ فن کے منہ چڑھنے لگا

نیم قد اُٹھ اُٹھ کے یہ سننے لگے
جا و بے جا سر کے تئیں دُھننے لگے

وہ سراپا جہل ناگہ وقت کار
ہم سے تم سے کرنے لاگا اعتذار

سر میں رکھ کر دعویٔ طبع لطیف
میرؔ و مرزاؔ کا ہوا آخر حریف

کیسی کیسی یوں گئیں طبعیں بہ باد
آفریں شاگرد و رحمت اوستاد

جب تلک یاں تھی تمیز زشت و نیک
کاہے کو یوں شعر کہتا تھا ہر ایک،

اہل فن کی رہتی تھی سب کو تلاش
ان کے ہاں کرتے تھے جا کر بود و باش

در ہجو اکول

ایک ہے پُر خور آشنا بے پیر
سینہ سوراخ جس سے ہے کف گیر

صد منی دیگ ہے شکم اس کا
نفس اژدہا ہے دم اُس کا

شکل مت پوچھ کھانے کا ہے بلّی
منہ ہے چھیپوں سے جیسے روٹی جلی

گال کلچے سے، پر توے سے سیاہ
کاسہ سر ہے جیسے اوندھا کڑاہ

کھانا نکلے پر آوے ہے کیسے
چیل ٹوٹے ہے گوشت پر جیسے

وہ قضا را ہوا مرا مہماں
کھا گئی اس کی میزبانی جاں

گھر میں جو کچھ تھا بیچ منگوایا
کھانا اس کے لیے میں پکوایا

کتنا کھانا بیاں کروں تجھ سے
جس پہ سو میہماں کروں تجھ سے

کھانے کی بُو جو ناک میں پیٹھے
مر گیا ہووے تو بھی اُٹھ بیٹھے

عقل باور اگرچہ کرتی نہیں
وہ مرے، بھوک اس کی مرتی نہیں

در مذمّتِ آئینہ دار

آج سے مجھ کو نہیں رنج و ملال ‏— جب سے نکلے بال تب سے ہے یہ حال
موشگافوں کا نہیں ہے نام اب ‏— مدّعیِ شعر ہیں حجّام اب
یاں نہ سیّد کچھ ہے نے نائی ہے شرط ‏— ہو کسو کسوت میں دانائی ہے شرط
سگ کو نجم الدین کے سرداری ہوئی ‏— نوح کے بیٹے کی وہ خواری ہوئی
سمجھے مرزا میر کو، مرزا کو میر ‏— نے وہ رگ زن جو نہ سمجھے سیر شیر
گرچہ اُن کو کہتے ہیں آئینہ دار ‏— لیک ان کا منھ نہ دیکھیں کاش یار
باپ سے اپنے اگر پیسے نہ پائیں ‏— داغ کو اس کے جراحت کر دکھائیں

چھیڑیو تو مغز بھی لے جائیں گے
سر کے تئیں سہلا کے بھیجا کھائیں گے

در بیان کذب

اے جھوٹھ آج شہر میں تیرا ہی دَور ہے
شیوہ یہی سبھوں کا، یہی سب کا طور ہے
اے جھوٹھ تو شعار ہوا ساری خلق کا
کیا شہ کا، کیا وزیر کا، کیا اہل دلق کا
اے جھوٹھ تجھ سے ایک خرابی میں شہر ہے
اے جھوٹھ تو غضب ہے، قیامت ہے، قہر ہے
اے جھوٹھ رنگ تیرے کرے کوئی کیا بیاں
رکھتا ہے جیسے غنچہ زباں تو تہِ زباں
یوسف کہ تھا نبی و صداقت شعار تھا
پھر حسن ظاہری سے بھی باغ و بہار تھا
پایانِ کار تیرے سبب چاک پیرہن
زنداں میں جا کے برسوں رہا چھوڑ کر وطن
اے جھوٹھ تُو تو ایک دل آویز ہے بلا
آشوب گاہ تجھ سے زمانہ رہا سدا
اے جھوٹھ راستی سے نہیں گفتگو کہیں
کہنے کو ہاں کہیں ہیں، حقیقت میں ہے نہیں

درمذمّتِ دنیا

سنو اے عزیزان ذی ہوش وعقل
کہ اس کارواں گہہ سے کرنا ہے نقل

پیمبر ہے، شہ ہے کہ درویش ہے
سبھوں کو یہی راہ درپیش ہے

بجا ہی کیا کوسِ رحلت مدام
کنھوں نے نہ بجتا سُنا یاں مقام

یہ بیٹھے جو ہیں سامنے ہیں کہاں
جہاں جلد ہے۔ ایک بزمِ رواں

جیسے دیکھو چلنے کا گرم تلاش
یہ منزل نہیں جائے بود اور باش

گدا ہو کہ ہو شاہ عالی تبار
تہِ خاک سب کا ہے دار القرار

نہ یک بوئے خوش ہی ہوا ہو گئی
وہ رنگینیٔ باغ کیا ہو گئی

جہاں ایک ماتم سرا ہے عجب
نہیں جائے باش اور جائے عجب

جوانی گئی موسم شیب ہے
شہود ایک دو روز کو غیب ہے

نہ وہ ذائقہ ہے نہ وہ ہے مشام
مزا کچھ نہیں، ہو چکی صبح و شام

ہوئے شعر کیا کیا فراموش ہائے
کہوں کیا گزرتی ہے خاموش ہائے

شباب آہ داغِ جگر دے گیا
قدِ خم زمیں کی طرف لے گیا

بدن زار، اعضا سبھی رعشہ دار
کرے کون خوباں سے بوس و کنار

کہے میں نہیں اپنے ٹک پاؤ و دست
کیا خاک میں مجھ کو پیری نے سخت

لبوں پر نہایت ضعیف ایک آہ
در و بام پر حسرتوں سے نگاہ

سیہ روئے شیب اک ستم کر گیا
لکھوں کیا کہ میں جیتے جی مر گیا

در بیان کدخدائی نواب آصف الدولہ بہادر

ہے جہانِ کہن تماشا گاہ　　آصف الدولہ کا رچا ہے بیاہ
آؤ ساقی کہ کدخدائی ہے　　طبع نواب ادھر کو آئی ہے
نئے سر سے جواں ہوا ہے جہاں　　عیش و عشرت کے محو خورد و کلاں
ہر طرف شہر میں ہے آرایش　　رہ رواں کی نہیں ہے گنجائش
شیشہ بار فلک ہے آتش باز　　کہکشاں سے ہوا ہوائی ساز
نہیں رستوں میں روشنی کے دیے　　نجم ہے چشم روشنی کے لیے
کیا ستاروں کا چھوٹنا کہیے　　آسماں کی طرف ہی تک رہیے
شب شادی کی دھوم کی کیا بات　　روز روشن تھی روشنی سی بات
آؤ ساقی کہ جمع ہیں احباب　　سب مہیا ہیں عیش کے اسباب
کر چمن زار دست و دل کی سیر　　ہیں نہال آج آشنا و غیر
گل نمط دل شگفتہ سب کے کیے　　خلعتِ فاخرہ سبھوں کو دیے
آؤ مُطرب لیے رُباب و چنگ　　کاڑھ منہ سے نوائے سیر آہنگ
شادمانی سے ہو نوا پرداز　　دے بہار گذشتہ کو آواز
آؤ ساقی کہ روشنی ہے خوب　　محو آرایش آج ہیں محبوب
شیشہ شیشہ شراب ہے درکار　　صحبتِ عیش کو چھکا یک بار
چل گلابی کو ہاتھ میں لے لے　　ایک دم جام متصل دے دے

اے جھوٹھ اس زمانے میں کیونکر چلے معاش
ہے تنگ جھوٹھ بولنے سے عرصۂ تلاش
سردار جس سے سب متعلق ہے کاربار
سچ بولنا ہے اس کے تئیں سخت ننگ و عار
مشکل حصول کام ہے یاں حاصلِ کلام
باتوں ہی باتوں کام ہوا خلق کا تمام
اے جھوٹھ دل مرا بھی بہت دردناک ہے
ان کاذبوں سے صبح نمط جیب چاک ہے
تھا میں فقیر، پر نہ گیا شاہ کے حضور
اتنے لیے کہ رتبہ عزت مرا ہے دور
آداب سلطنت سے نہیں مجھ کو رابطہ
حرکت نہ ہوتے مجھ سے کوئی غیر ضابطہ
بیس مضطرب گھر اس کے گیا اُٹھ کے پانچ بار
کہنے لگا زباں سے یہ ہوتے ہی وہ دوچار
دکھلاؤں گا چلا ہوں سوال آپ کا لیے
میں نے کہا فقیر کہو کس طرح جیے
بولا نہ ہو گا سعی میں ایدھر سے کچھ قصور
پھر دیکھیے کہ پردے سے کرتا ہے کیا ظہور
مدت مدید گزری مجھے کرتے انتظار
خجلت ہوئی جو حال لکھا میں نے بار بار
اس فرد دستخطی کو ہے یہ ماہِ ہفت میں
تنخواہ کا نہیں ہے ٹھکانا ابھی کہیں
برسوں ہوئے مہینوں کے وعدے ہوئے وعید
سچ کہتے ہیں کہ کچھ نہیں ان جھوٹوں سے بعید

در جشن ہولی و کتخدائی

آؤ ساقی شراب نوش کریں شور سا ہے جہاں میں گوش کریں
آؤ ساقی بہار پھر آئی ہولی میں کتنی شادیاں لائی
دونوں رستے عمارتِ خوش ہے تازہ کاریِ شہر دل کش ہے
اور بازار میں رنگ لائے ہیں سارے رنگیں ستوں لگائے ہیں
جس طرف دیکھو معرکہ سا ہے شہر ہے یا کوئی تماشا ہے
لکھنؤ دلّی سے بھی بہتر ہے کہ کسو دل کی لاگ ایدھر ہے
ایسے گل پھول ہیں جو صرف کار راہ رستے ہوئے ہیں باغ و بہار
بستہ آئیں دوکانیں ہیں یک سر جن میں سستی متاعِ لعل و گہر
شب شادی کو لڑکے ہوں جو سوار لیں صغیر و کبیر، و بہر نثار
گلِ کاغذ سے شہر ہے گلزار تو کہے آئی ہے بہار اے یار
کسو دلبر کے کھینچ لیویں ہاتھ کسو محبوب کو اٹھالیں ساتھ
کسو خوش رو کے منھ پہ منھ رکھ لیں کنج لب کا کہیں مزہ چکھ لیں
گرم ہو جو دماغ انساں کا لطف آوے نظر چراغاں کا
شمع و فانوس کا بہت ہے ہجوم شمعی رنگوں نے کر رکھی ہے دھوم
تارے سے ہیں چراغ چار طرف آسماں پر زمیں رکھے ہے شرف
کہیں نوبت کو چل کے سنیے گا نَے کے بجنے پہ سر کو دھنیے گا

ہے سواری کے فیل کی وہ دھوم
جیسے ابر بہار آوے جھوم

آئے دولت سرا سے ہو کے سوار
لعل ناب و گہر ہیں صرفِ نثار

اور ہاتھی ہیں جھومتے جاتے
جیسے آویں جوان مُدھ ماتے

پلٹنیں جاتی ہیں برابر یوں
صف ہو مژگاں دلبروں کی جوں

چوب نقارے پر لگا اس ڈھب
کہ رکھیں گوش اس صدا پہ سب

پھینکتے ہیں جو دستہ دستہ گل
رہ گزر میں ہیں رستہ رستہ گل

ساقیا دے وہ مے جو باقی ہے
شادی ایسی بھی اتفاقی ہے

ہو مبارک یہ جشنِ خوش انجام
دور گردوں یہ کام عیش مدام

آ مُغنّی غزل سرائی کر
کچھ مزے سے بھی آشنائی کر

پڑھ غزل میر کی جو ہووے یاد
ان کو تو اس میں کہتے ہیں استاد

موسم ابر ہو، سبو بھی ہو
گل ہو گلشن ہو اور تُو بھی ہو

سرکشی گل کی خوش نہیں آتی
ناز کرنے کو ویسا رو بھی ہو

کس کو بلبل ہے دم کشی کا دماغ
ہو تو گل ہی کی گفتگو بھی ہو

آؤ اے مطربانِ سیر آہنگ　　ساتھ اپنے لیے رباب و چنگ
ہو غزل خوانِ بزمِ عیش و طرب　　پر نہ کریو خیالِ ترکِ ادب
منعقد مجلسِ شہانہ ہے　　ادب آصفِ زمانہ ہے
بحرِ بخشش کی لہریں اب آئیں　　زر د گوہر کی کشتیاں لائیں
ہے بلند اس کرم کا کیا پایہ　　دیتے ہیں خلعتِ گراں مایہ
کیا بچھا ہے فراخ دسترخواں　　جس پہ ہے خلق اک جہاں مہماں
لطف کے ساتھ نعمتوں کا وفور　　زیر ہر جعبہ قاب ہے پُر نور
عمر و دولت ہو اس کی حد سے زیاد　　ہے اسی سے جہاں نشاط آباد

آؤ ساقی غزل سرا بھی ہو
لذّتِ شعر سے مزا بھی ہو

بیچ میں ہولی آئی ہے ساقی / پھرے ہے سرخوش ہے تا بچے باقی
سیر کر بے کنار نہر و گشت / لالہ و گل کھلے ہیں تا سرِ دشت
سبزِ گل ہے ہر کیاری / ایک ہے گل زمیں، زمیں ساری
قمقمے جو گلال کے مارے / مہ وشاں لالہ رُخ ہوئے سارے
خواں بھر بھر عبیر لاتے ہیں / گل کی پتّی مِلا اُڑاتے ہیں
جشنِ نو روز ہند ہولی ہے / راگ رنگ اور بولی ٹھولی ہے
پھر سرِ پُل سے تا عمارتِ نو / جلتے ہیں مجتمع دِیئے سو سو
ہاتھی رنگے گئے پڑی ہے دھوم / جیسے ابر سیاہ آئے جھوم
خیمہ استادہ کر چکے شب باز / پتلیوں نے کیا خرامِ ناز
یاں کی صحبت کا تھا نمونہ سب / شاہ دستور حکم و کار اب
آئے شکلیں بنا کے صورت باز / ڈوم ڈھاڑی بنے بجا کر ساز
کوئی شاعر بنا نہ جس کی نظیر / جیسے مستغرقِ خیال تھا میر
کر کے سعی و تلاش چاروں دانگ / خوب دیکھا تو ہے یہ عالم سوانگ
آؤ ساقی نہ رکھ خراب احوال / دیے جا جامِ بادہ مالا مال
کدخدا ہونے کو چلا دولھہ / بال گوپال عظم سے جوں شہ
موتی کرتے تھے ہر طرف سے نثار / تھا مگر فیل ابر گوہر بار
عمدہ سب ساتھ ہیں وزیر سمیت / شاعراں مدح خواں میر سمیت
تازی ترکی عراقی و عربی / کوتل آگے تھے خوش جلو میں سبھی
آؤ ساقی پلا شراب ہمیں / روشنی کی نہیں ہے تاب ہمیں
گرمی سے مشعلوں کے آئے تنگ / دودِ مشعل ہے جائے کاہی رنگ
شمعیں لاکھوں کنول میں ہیں روشن / زور پھولا ہے کاغذی گلشن
تارے موقوف کچھ سما پہ نہیں / توپیں چھوٹیں مگر ہوا پہ نہیں
ماہ بھی چشم روشنی کے لیے / ہے چراغاں ستارگاں سے کیے
گل فشاں میں پڑی جو پھل جھڑیاں / گھلتیاں ہیں دل کی گل جھڑیاں
چھوٹتے ہیں انار و مہتابی / رنگ ہیں دل بروں کے مہتابی

آفریں صنّاع لوگو آفریں — کیا لگایا باغ آکر کاغذیں
گل کتر کر پھول گل ہی کر دیے — رنگ تازے کاغذوں میں بھر دیے
نذر تو نواب کی اہلِ فرنگ — لے کے آتش بازی آئے رنگ رنگ
کیا ہوائی یاد میں لہرا گئی — تاری سانپوں کے سے من پھیلا گئی
رحمت اے آتش زناں کیا لاگ ہے — تہِ بساط آبِ دریا آگ ہے

لکھ غزل اب میرؔ رنگیں تو کوئی
سن کے ہو محظوظ جس کو ہر کوئی

دربیانِ ہولی

ہولی کھیلا آصف الدّولہ وزیر
رنگ صحبت سے عجب ہیں خرد و پیر

شیشہ شیشہ رنگ صرفِ دوستاں
صحن دولت خانہ رشکِ بوستاں

پھول گل آویں نظر دیکھو جدھر
لالہ و صد برگ سب باغ نظر

دستہ دستہ رنگ میں بھیگے جواں
جیسے گل دستہ تھے جوؑں پر رواں

رنگ افشانی سے پڑتی ہے پھُہار
رنگِ باراں تھا مگر ابرِ بہار

قمقمے جو مارتے بھر کر گلال
جس کے لگتا آن کر پھر منھ ہے لال

روشن الدولہ نے کی تھی روشنی
کب ہوئی تھی لیکن ایسی روشنی

وہ چراغاں گرچہ تھے درگاہ تک
تھے تماشائی گدا و شاہ تک

اب تو ہفت اقلیم کا عالم ہے یار
دیکھو تو ہر جنس کا آدم ہے یاں

تھا جہاں تک آب دریا تک بہاؤ
واں تلک تھا اس چراغاں کا دکھاؤ

کوچہ و بازار بام و در بنے
روشنی کے دونوں رستے گھر بنے

سوانگ کیا کیا بن کے آئے درمیاں
پیکھنے کا سوانگ تھا سارا جہاں

کشتیوں میں جو دیے بھر کر چلے
پانی میں شعلوں کے ریلے ہی چلے

اس روش سے تھے ستارے چھوٹتے
ناگہاں جو ہو ویں تارے ٹوٹتے

ماہتابی اک طرف سے جو دغی
چاند سا نکلا ہوئے حیراں سبھی

پانچ بچے اس نے اس نوبت دیے — بارے سب وے قدرتِ حق سے جیے
اپنی ماں کے رات دن سینے لگے — پانچوں بچے دودھ کچھ پینے لگے
دودھ کتنا جو کہ بس ہو سب کے تئیں — میں بھی منگوانے لگا کچھ سب کے تئیں
دو مہینے تک بہت تھی احتیاط — لتے بلّی سب سے موقوف اختلاط
بچے ریشم کے سے چندیں رنگ خال — کچھ سفید و کچھ سیہ کچھ زرد و لال
ایک عالم عاشق و بے تاب تھا — ان کی خاطر بے خور و بے خواب تھا
لے گئے ایک ایک کر سب تین تو — منی، مانی رہ گئیں مجھ پاس دو
منی کی پھر ایک صاحب نے پسند — تھی تھی نازک ایسی ہی طالع بلند
مانی کچھ بھاری تھی نکلی بردبار — رہ گئی یاں فقر کو کر اختیار
بوریے پر میرے اس کی خواب گاہ — دل سے میرے خاص اس کو ایک راہ
آنکھ سے معلوم ہو مشتاق ہے — بلّی یا اعجوبۂ آفاق ہے
گرم شوخی ہو اگر یہ مثلِ برق — بجلی میں اس میں نہ کچھ کر سکیے فرق
یا پری اس پردے میں ہے جلوہ گر — اٹھتی اودھر سے نہیں ہرگز نظر
ربط ہے اپنے بھی جی اس کے ساتھ — بیٹھے ہی تو بیٹھ پر میرا ہے ہاتھ
بلّی کا ہوتا نہیں اسلوبِ یہ — ہے کبودی چشم یک محبوب یہ
یہ نفاست یہ لطافت یہ تمیز — آنکھ دوڑے ہے نہ ہو کیسی ہی چیز
چوہا چڑیاں اُن نے کچھ کھایا نہیں — لوچ کو جانا اس کے تئیں آیا نہیں
حُبِّ ہُرہ جو کہ ہے ایمان میں — ہے اسی بلّی کی شاید شان میں
تھا بہت منّی کا جتّا آرزو — سو جنی دو بلّیاں ہیں ماہ رو
موہنی اور سوہنی ہے ان کا نام — پھرتی ہیں پھندنا سی دونوں صبح و شام
قصہ کوتاہ موہنی آگے ہوئی — یک قیامت جان پر اُس بن ہوئی

صبر بن چارہ نہ تھا آخر کیا
بلّی ماروں میں اسے گڑوا دیا

مثنوی موہنی بلّی

ایک بلّی موہنی تھا اس کا نام
ان نے میرے گھر کیا آکر قیام

ایک دو سے ہو گئی الفت گزیں
کم بہت جانے لگی اٹھ کر کہیں

ربط پھر پیدا کیا میرے بھی ساتھ
دیکھتی رہنے لگی میرا ہی ہاتھ

چھیچھڑا ٹکڑا جو کچھ پایا کرے
فقر میرا دیکھ کر کھایا کرے

دخل کیا ہے جا نکلے یہ چھینکے کی اور
ٹکڑا اُسے کو دیکھے نہ گو بھوکی ہو زور

اس مروّت پیشہ سے کیا ہے گِلا
خوف سے آپھی گہے جو ہا مِلا

برسوں یاد آوے یہ پاکیزہ خُو
آگے آتی ہی نہیں چلتے کبھو

رفتہ رفتہ کوٹھوں پر جانے لگی
پہروں پہروں میں یہ پھر آنے لگی

حاملہ ہو کر گئی بچّے دیے
ایک دو بھی سو نہ ان میں سے بچے

حفظ اس کی کوکھ کا لازم ہوا
جھاڑے پھونکے کا ہر اک عازم ہوا

نذریں مانیں نقش لائے ڈھونڈ کر
نیل کے ڈوروں میں باندھے پیٹ کر

بی بلائی سے بہت التجا
گربۂ محراب سے چاہی دعا

گوشت کی چیلوں کو پھینکیں بوٹیاں
ماش کی موٹی پکائیں روٹیاں

لڑکیاں بٹھلائیاں کھاٹوں تلے
اس طرح جوں دبکی بلّی کم ملے

کیں مناجاتیں دل شب لاتعد
گربۂ زاہد سے بھی چاہی مدد

بوہریرہ کے تئیں مانا بہت
بلّیوں کو بھی دیا کھانا بہت

برابر رہے گور و شیر ژیاں
برابر تھا دونوں کو وسواس جاں

گئے پیش تر چھوڑ نخچیر گہ
شغانوں کی روباہ بازی تھی یہ

پڑے سیکڑوں دام تالاب میں
نہ چھوٹی تنک خاک اس آب میں

نہ تیتر نہ طاؤس صحر کے بیچ
نہ ماہی نہ مرغابی دریا کے بیچ

ہوا حائلِ راہ بحرِ عمیق
کہ ہو وہم ساحل پہ جس کے غریق

مہیب اور آلودۂ خاکِ آب
بعینہ پھٹی آنکھ تھا ہر حباب

غضب لجّہ خیزی بلا جوش پر
تلاطم قیامت لیے دوش پر

چلے بس تو کچھ کوئی چارہ کرے
مگر دیکھ ہی کر کنارہ کرے

تردّد میں ہر اک کے ہوں کیونکہ پار
کنارے پہ سرگشتہ گرداب دار

رواں آب ایسی روانی کے ساتھ
کہ جوں رفتگی ہو جوانی کے ساتھ

لگے پاؤں چلنے جہاں شور تھا
کہ کم آب میں بھی بڑا زور تھا

تامّل سے اقبال نواب دیکھ
توقف کیا پہلے تو آب دیکھ

پھر اس پار جا کر اشارہ کیا
کہ لشکر نے وہیں گزارہ کیا

شباشب اترنے لگے لشکری
نہ جوش آب کا وہ نہ ویسی تری

اترنے لگا لشکرِ بے کراں
کراں تا کراں تھی یہ محشر عیاں

سلامت ہوا پار سب اژدہام
رہے دنگ خضر علیہ السلام

پکڑ لائے چیتے گوزن اور گور
عصا سے چلے راہ یاں مار و مور

بہت ہم نے دیکھے وزیر و شہاں
شکار ایسے دستور سے تھا کہاں

نمک خوار مجھ سے تو ہیں گے ہزار
یہ میرا بھی ہونا ہے یہاں یادگار

غرض امیر تا دورِ چرخِ بلند
رہے آصف الدّولہ اقبال مند

کرے اُس کا اقبال ہر لحظہ کام
شکار اس کے دشمن رہیں صبح و شام

شکار نامۂ اوّل

چلا آصف الدولہ بہر شکار
نہادِ بیاباں سے اُٹھا غبار

روانہ ہوئی فوج دریا کے رنگ
لگا کانپنے ڈر سے شیر و پلنگ

طیور آشیانوں سے جانے لگے
وحوش اپنی جانیں چھپانے لگے

گئے مشت ہاتھی مکانوں کو چھوڑ
دیے پنجۂ شیر نلیوں سے توڑ

پلنگانِ صحرا کے دل خوں کیے
نہنگانِ دریا ہوئے مر جیے

ہوئے لشکری جب کہ سرگرم گشت
مقید ہوئے مست فیلانِ دشت

عجب تر ہے یہ صید کرنے کا ڈھنگ
کہ چورنگ ہاتھی ہوئے بید رنگ

نہ چیتل نہ پاڑھا نہ ارنا نہ شیر
ہوئے گولیاں کھا کے یک لخت ڈھیر

درندوں کا پیدا نہ نام و نشاں
نہ شیرِ ژیاں و نہ پیلِ دماں

پہاڑ ایک ہاتھی مقابل ہوا
بزور آمد و شد کا حامل ہوا

جو اس مار کھانے پہ اکڑا رہا
کئی روز رسّوں سے جکڑا رہا

اشارہ ہوا اس کے چورنگ کا
سبھوں کو ارادہ ہوا جنگ کا

برسنے لگا مینہ تیروں کا زور
ہوا فیل باراں کا جنگل میں شور

لگی پڑنے بجلی سی تیغِ سیاہ
پریشاں ہو جیسے ابرِ سیاہ

نہایت وہ ہاتھی ہوا لخت لخت
گرا یوں کہ جیوں پارۂ کوہِ سخت

گوزن اور ہرنوں کی کیا دیجے شرح
گئے شیر مارے سو کتوں کی طرح

جہاں تک نظر جائے دکھی ہے کانس
اگر سبزہ بھی تھا تو تھوہڑ کا بانس

نہ سبزہ نہ کھیتی نہ آبِ رواں
کوئی شیرِ غرّاں کہ پیلِ دماں

کوئی دشت ایسا کہ تھا سبزہ زار
ہوا دل کش و جرگہ جرگہ شکار

بڑا لطف تھا سیر میں گشت میں
نہ تھی دختِ رز حیف اس دشت میں

عجب لطف کا تھا وہ کوہِ گراں
کہ صد چشمہ کا اس میں پانی رواں

شجر سبز و پتھر بہت صاف تھے
سبھی جیسے الماس شفّاف تھے

پہر دن سے بارش لگی ہونے زور
رہا ساری وہ رات طوفاں کا شور

نہ پوچھ اور اسباب مردم کا حال
نہ چادر رہی خشک نے کوئی پال

رہا ایسی سردی میں کیدھر شکار
ہوئے لوگ خیموں کے اندر شکار

بہت اسپ و اشتر موئے پاؤں پیٹ
نکالا اُنھیں خیمہ گہہ سے گھسیٹ

کسو بن میں ارنوں کا پاکر نشاں
لگی جانے ہر صبح فوجِ گراں

ہوا ایک جنگل میں آکر گزر
کسو کو نہ تھی واں کسو کی خبر

تراکم قیامت تھا اشجار کا
ستم پھر ہوائے ستم گار کا

کوئی خار بن حائلِ رہ ہوا
پھٹے پیرہن ہوش سب تہ ہوا

درختانِ بے برگ و بر بدنما
نہ اک شاخ پر مرغِ رنگیں نوا

رہائی ہی مقصود تھی واں سے یار
پڑی اپنی سب کو کہاں کا شکار

زمیں پر قدم کوئی کیوں کر دھرے
بیاباں فراخی سے تنگی کرے

بلندی و پستی تھی اتنی کہ ڈھب
کہ گاہے زمیں گہ فلک پر تھے سب

ہوا دن تو یوں کھینچتے رنج شام
گئی رات چوروں کے ڈر میں تمام

کہے ہے کوئی دن آتا ہے یہ
پکارے کوئی کون جاتا ہے یہ

ہوا خیمہ گاہ دامنِ کوہ سب
رہا آکے نواب واں تین شب

پہاڑی کہ تودا کہوں خاک کا
کہ انبار تھا خار و خاشاک کا

چلو ہی چلو ہے یہ چلتے نہیں
کہ اشجار آگے سے ٹلتے نہیں

کہیں ہاتھی آیا ہے بھڑکا ہے اونٹ
کھڑے لوگ پیتے ہیں لوہو کے گھونٹ

قیامت نمودار ہر ہر قدم
چلے کوئی کیا رکھ کے سر پر قدم

باز قدم رنجہ فرمودن آصف الدولہ بہادر

روز دیگر برائے شکار

چلا پھر بھی نواب گردوں شکار
اسد باؤ کے گھوڑے پر ہو سوار

روانہ ہوئی فوج دریا مثال
نہنگوں کی اب کھینچی جاوے گی کھال

زمیں ہو گئی جائے خوف و خطر
فلک کو لگے دیکھنے شیرِ نر

نشیب و فرازِ بیاباں کو سُن
جو ذی ہوش ہیں وے تو ہوتے ہیں سُن

چڑھو آسماں پر جو آوے چڑھاؤ
پھر اُترو تو تحت الثریٰ ہی کو جاؤ

جو اس میں کہیں ہوتے لغزش تو خیر
کہ در پیش ہے اور عالم کی سیر

سپہ کی بلا ترک تازی رہی
نہ سارس کی وہ سرفرازی رہی

نہ جو فیل دشتی کی مستی گئی
وہیں مٹ گیا اس کی ہستی گئی

اگر بن ہے گویا بنا ہے اسے
کرے قصد واں کا تو کیونکر گھسے

مگر مور سے کچھ نکلتا ہے کام
بہت رنج کھینچے سے چلتا ہے کام

خریدار دستار سر خار بن
زمین پر رکھو پاؤں کانٹوں کو چُن

تو آگے بیاباں پُر خار ہے
کہیں جھاڑ بوٹا کہیں غار ہے

ترائی جو واں سے گزرنا ہوا
کہاروں کے سر چڑھ اُترنا ہوا

بیابانِ وحشت اثر پُر خطر
یہی ڈر ہے ڈر کیا اِدھر کیا اُدھر

قطعہ در تعریف اسپ

وزیر زماں آصف دوراں نواب آصف الدولہ بہادر

وزیر زماں نے لیا ایک اسپ — کہ ہے رشکِ گل گون بادِ بہار
نظر پوست کے اس کے آتا ہے خوں — کیا جلد پر اس کے گل کو نثار
اڑا کر اسے بارہا سیر کی — نہ نکلا کبھو ابلق روزگار
کروں اس کی کیا تیز گامی کی شرح — ہرن اُس پہ شمشیر سے ہو شکار
ٹک اک کسمساوے جو راکب تو پھر — نہیں اُس کو رانوں میں ہرگز قرار
جہاں باگ اُچک جائے محبوب کی
عنانِ دل اس کے ہے پھر اختیار

مرثیہ خروس کہ در خانہ فقیر بود

کئی برس سے ہمارے کنے تھا ایک خروس
خروس عرش کی اولاد سے ولے افسوس
دیا کرے وہ اذاں دونوں وقت صبح و شام
بجا ہے مرغ مصلّی رکھیں گر اس کا نام

کہیں بچ کے نکلے کہیں جھک چلے
کہیں مضطرب تھے کہیں رُک چلے
اسی طور منزل کو کر قطع راہ
پہنچتے رہے ہم بہ حال تباہ
ولیکن وہی خاک زشت و پلشت
ہوئی بود آدم سے رشکِ بہشت

پہاڑی سے لشکر چلا سوئے کوہ
چلے بس تو کریے سیہ روئے کوہ
قدم رکھ جو نواب وہاں تک گیا
سر اس شعبہ کا آسماں تک گیا
کڈھب وہ جگہ سیر گہ ہو گئی
حضور اس کے فردوس تہ ہو گئی
ہوا خیمہ استادہ ایسی جگہ
کہ آنے لگی دیر واں سے نگہ
نظر والوں کے جی بھی ڈھلنے لگے
گرفتہ دل اس جائے کھلنے لگے

ہوئے دامن کوہ میں کچھ مقام
سفر کی بھی مدت ہو شاید تمام

در تعریف آغا رشید کہ خطّاط بود

و بہ فرمایش میاں اعزّالدین کہ فقیر و خوشنویس بودند

میر خطّاط یک قلم دیکھے
لیکن آغا سے لوگ کم دیکھے

یعنی عبدالرشید تھا استاد
خوشنویسی کی جن نے دی ہے داد

وہ تصرّف کہیں جو کرتا ہے
شکل نقّاش رنگ جو بھرتا ہے

خطِّ شیریں جو اس کا پاتے ہیں
ہم حلاوت بہت اٹھاتے ہیں

حرف کس کس ادا سے لکھتا ہے
کون ایسی صفا سے لکھتا ہے

ہے الف قامتِ نکورویاں
لام ہے زلف سلسلہ مویاں

دال کا خم رہے ہے ایسا خوب
جیسے جھکتے ہیں مست ہو محبوب

میم جس لطف سے لباب ہے
دہنِ تنگ مہ وشاں کب ہے

نہیں ہے مرغ چمن میں جہاں کے ایسا آج
بہ رنگِ کلہ تاج خروس سر پر تاج
رہا ہمیشہ سے وہ مُرغ مستعدِّ جنگ
طرف نہ اس کے ہوئے بچگی میں قاز و کلنگ
قضا جو پہنچی تھی نزدیک وہ بھی جھنجھلائی
حریف ہوکے دلیرانہ سامنے آئی
خصومت اس کی تھی یک مادہ سگ سے شام وسحر
کبھو وہ لات اسے مارتا کبھو شہ پر
یہ بھیا تھا نہ سمجھا ادا کو کینے کی
لگائی سامنے ہوتے ہی ایک سینے کی
ملائی ان نے بھی گردن لگی کہیں بے کل
کہ ایک دم گئی آہ اس کی گردن ڈھل
ہوا کے مرغ ہوئے داغ اس کے ماتم سے
سیاہ پوش رہے طائرِ حرم غم سے
قفس کے مرغ نے سن ترک آب و دانہ کیا
طیور نے بھی نہ پھر قصد آشیانہ کیا
خموش میرؔ، تجھی کو نہیں یہ رنج و تعب
کباب آتشِ غم میں ہیں مرغ و ماہی سب

مور نامہ

دشت سے بستی میں آیا ایک مور   زور تھا واں حسن کا رانی کے شور

اُڑ کے گھر راجا کے پہنچا بے قرار   دیکھ اس کو ہو گیا حیرانِ کار

جاذبہ تھا حسن کا اس کے کمال   جانور بھی ہو گیا محوِ جمال

گر خرامِ باز سے جی لے گئی   خوش نگاہی جان تازہ لے گئی

رو برو جا کر ہوا وہ بھی کھڑا   ٹک ٹھہر کر مضطرب ہو گر پڑا

اضطرابِ عشق نے تاثیر کی   دل دہی کرنے اُٹھی دل گیر کی

پیار سے کہنے لگی مت ہو اداس   پاس رہ میرے کروں گی میں بھی پاس

تو ہے وحشی اس قدر مانوس ہے   اُنس انساں کو نہ ہوا افسوس ہے

اس کشش کی تھی نہ مجھ کو کچھ خبر   ہوش اڑا کر لے گئی یہ مُشتِ پر

اب تو دل بھی لگ گیا ہے تیرے ساتھ   یک بیک سب سے اٹھایا میں نے ہاتھ

پاس رہ کر پاسِ ظاہر ہے ضرور   آوے راجا گھر میں تو پھر دُور دُور

وہ مبادا ربط سے ہو بدگماں   دوستی ہو جاوے تیری خصمِ جاں

دل سے کیسے کیسے گھر ویراں ہوئے   لوگ کیا کیا بے سروساماں ہوتے

مختلط رہنے سے بعد از چند روز   شور بدنامی اٹھا اک سینہ سوز

کھل گئی غمّاز لوگوں کی زباں   سب پہ ظاہر ہو گیا رازِ نہاں

کان راجا کے بھرے دشمن ہوا   بدگماں و بدبرو و بدظن ہوا

مثنوی

ہے غبار وادی وحدت جہاں
کثرتِ اعیان ہوگی اب عیاں

عشق اپنا آپ ہی شیدا ہوا
تھا جو پنہاں پردے میں پیدا ہوا

نظمِ کل کا ڈول ڈالا عشق نے
انس سے انساں نکالا عشق نے

وہ حقیقت سب میں یاں ساری ہوئی
ہے گی ہر شے عشق کی ماری ہوئی

عشق ہی کا ہے جہاں میں سب ظہور
نور و ظلمت ہو کر ظل و حرور

عشق گل ہے، عشق بلبل، عشق بو
عشق ہے سرو چمن عشق آب جو

عشق ہر کشور میں لاتا ہے کتاب
عشق کے لوگوں سے ہیں کیا کیا خطاب

یاں سے پیغمبر ہے لایا عشق کا
عشق کو پیغام آیا عشق کا

مسجد و منبر کیے تازہ بنا
واں امامِ پاک خود آکر بنا

جل چکے کو ہندی کہتے ہیں ستی
ست بمعنی استقامت واقعی

آگ میں جا بیٹھے زن کا ظرف کیا
عشق ہی کا جاذبہ دے ہے جلا

گرمیِ ہنگامہ اس کا قہر ہے
پھونک دیوے گر دیار و شہر ہے

عشق و دل میں ہے قدیمی دشمنی
عشق سے ہے دل گدازی جاں کنی

بَن جلا کر بستیوں میں آ لگی ‏ پھیل کر یاں دل جگر کو جا لگی
جمع کر خاشاک و خار و خس شتاب ‏ جل گئی وے آگ وہ بھی بس شتاب
کیا لگی تھی دل کو رانی جل گئی ‏ خاک ہو کر خاک ہی میں رِل گئی

جل کے لشکر ہو گیا تھا بے چراغ
یہ خبر سُن ہو گیا راجہ بھی داغ

جانور کا انس کچھ ثابت نہیں — انس انساں کی سی یہ تہمت نہیں
عزت اپنی بھی نہیں ہے مقتضی — جیتی رہتی عشق کی ہو تہمتی
سن کے راجہ نے کہا یہ اس کی دھوم — دام داروں کو بلا کاے قوم شوم
تو خبر ہے کس طرف وہ خارزار — آپ جاؤں گا ادھر بہر شکار
ہر طرف راجہ کے پہنچے دام دار — ہوں تلاشی تا کدھر ہے دشت خار
صید پیشہ وے گئے ہر چار اور — دیکھیں کس جنگل میں ہے وہ مور شور
راہ میں ان سب کو یہ آئی خبر — جس بیاباں میں ہے وہ تفتہ جگر
خار کا جنگل نہیں، ہے دشت مار — روز روشن میں بھی ہے تیرہ و تار
ہے عجب ماروں میں مور آگر رہے — مار بھی پھر کیسے، اژدرا اژدہے
مور کیا چوری پچھے آیا ہے یاں — عشق کا اعجاز اسے لایا ہے یاں
دشت ہر یک خار زار لق و دق — پاؤں چلتے چلتے جاسوسوں کے شق
کیا کرے جو رزق یوں مقسوم ہے — واں ملے مرنا جہاں معدوم ہے
طے ہوئے وے دشت جوں ہی ہولناک — دشت ماراں پہنچے بے خوف و باک
دیکھ وا منقار اس کی رحم کر — کچھ نہ کچھ رکھ دیتے منہ میں جانور
کوئی دانہ بوند پانی گھاس پات — کاٹتا تھا اس طرح دن اور رات
سن کے راجہ یہ خبر شاداں ہوا — چشمگیں تر خانہ آباداں ہوا
حکم کش لوگوں سے اپنے یہ کہا — دیر اس موذی کے غم میں میں رہا
مجھ کو جانا اس طرف کا ہے اہم — کھا گیا ہے جان اس دشمن کا غم
ساتھ راجا کے گیا جم غفیر — ہم صغیر و ہم جوان و ہم کبیر
منزلیں طے ہو کے آئے دشت و در — اترے واں جا لوگ لشکر سربسر
بھڑکی آتش عشق کی جنگل جلے — دوں لگا دو طائر و اژدر چلے
جل گیا طاؤس بھی اس آگ میں — جی گئے بہتیرے دل کی لاگ میں
مور کا مردہ گیا راجہ کے پاس — اور بھلسے بھلسے طائر بے حواس
پھر پڑی جو آگ سب لشکر جلا — اور راجہ کا بھی اودھر گھر جلا
یعنی رانی نے سنی جو یہ خبر — آتش غم سے جلا اس کا جگر

قنات آگے حجروں کی تھی کھینچ سب
لگی رہنے وہ رشکِ مہ روز و شب

پدر مادر ایسے نہ تھے درمیاں
قبیلہ کے کچھ لوگ لائے تھے یاں

کہ شادی کہیں اس کی کر دیجیے
گئے لوگوں کا چندے غم کیجیے

سو نسبت ہوئی ہے کسی سے درست
اہم کتخدائی ہے اس کی نخست

مسافر ہوا اس پری سے دوچار
ہوا اس پہ سو جان و دل سے نثار

بہت نازک اندام و شیریں کلام
قد و قامت اس کا قیامت تمام

ادا ایک غضب، ناز اک قہر تھا
کرشمہ خرابی کنِ شہر تھا

گل اندام و گل پیرہن گل بدن
دل آرام و دلچسپ دل کش سخن

اس آفت نے اک روز مہندی لگا
سراپا سے فتنہ ہزاروں جگا

دیے چھاپ شوخی سے دیوار و در
رہا نازک ان انگلیوں کا اثر

اُٹھے نقش پنجوں کے اس ڈھنگ سے
کہ چھاپے کے گل کب ہوں اس رنگ سے

کئی دن میں شادی قریب آ رہی
سرا میں سے اٹھ شہر میں جا رہی

نہ افسانہ یاں کا یہیں رہ گیا
مسافر سے عشق اس کا کیا کہہ گیا

جو سونے کو ہو تو کہاں اس کو خواب
پری یاد آوے ہو آنکھیں پُر آب

نہ سایہ خوش آوے نہ دھوپ اس کو بھائے
جہاں جائے وحشت لے کر ساتھ جائے

سرا میں مسافر جو شب آ رہا
وہیں بھٹیارنی نے جا کر کہا

کہ اے نو سفر عشق کی راہ کے
جدائی کش اس غیرتِ ماہ کے

تو اس حجرے میں جو رہا چند ماہ
سو گلخن سا ہے حال حجرہ تباہ

تو اس حجرے میں چار دن جا کے رہ
رہی تھی جہاں آ کے وہ رشکِ مہ

کروں (بسم کل) جھاڑ خاشاک و خاک
یہ گھر بھی پُر نور و صاف اور پاک

مسافر اس گھر میں اٹھ جا رہا
سکونت کو ان نے جہاں تھا کہا

منقّش نظر آئے دیوار و در
حنائی انھیں پنجوں کا تھا اثر

فشاں اس کے ہاتھوں کا دل لے گیا
ہر اک نقش صد رنگ غم دے گیا

بڑھی ناتوانی نہ طاقت رہی
نہ اک بات کرنے کی فرصت رہی

کئی دن رہا بس طلب چشم وا
وہیں شوق کس جی عدم کو گیا

مثنوی

خدا ایک فرقے میں مانا ہے عشق
کہ نظم کل ان سب نے جانا ہے عشق

نہ ہو عشق تو اُنس باہم نہ ہو
نہ ہو درمیاں یہ تو عالم نہ ہو

کہیں داغ ہو کر جگر پر جلا
کہیں زخم سینہ ہوا برملا

کسو جان میں ہے تمنّائے وصل
کسو دل سے اٹھا مہیائے فصل

کہیں عشق و عاشق ہے معشوق ہے
کہیں خالق و خلق مخلوق ہے

غرض طرفہ ہنگامہ آرا ہے عشق
تماشائی عشق و تماشا ہے عشق

مساعد نہ تھا ایک سے روزگار
کیا اُن نے ترک وطن اختیار

پریشانی لائی کہیں سے کہیں
بجز بے کسی ساتھ کوئی نہیں

سرا ایک تھی شہر کے درمیاں
فرود آیا واں یہ مسافر جواں

ہوا آب گردش سے بیمار یہ
رہا اس سبب کوئی دن اس جگہ

مراعات اسباب کے چند روز
دوا سے بڑھا اور کچھ دل کا سوز

دوا چھوڑی غیرت سے وحشت ہوئی
جنوں کرنے کی اس پہ تہمت ہوئی

یکایک ہوا قافلہ ایک نمود
قریب اس کے حجروں میں آیا فرود

تھی ساتھ اس کے ایک دختر بے مثال
گلستانِ خوبی کی تازہ نہال

پری شرم گیں اس کے رخسار سے
غشی حور کو اس کی رفتار سے

قیامت ادا فتنہ درسر تھی وہ
عجب طرح کی آہ دلبر تھی وہ

شتاب اس کی تربت پہ لے چل مجھے / کشش اس کی رکھتی ہے بے کل مجھے
مخاطب چلی لے کے غافل اُسے / کہ جاذب ہے وہ جذب کامل اُسے
جنازہ پہ آئی نہ تھی وہ پری / ہوئی گور پر اس کی جلوہ گری
برابر گئی شق ہوئی اس کی قبر / گیا اس کے دل سے سکوں اور صبر
شتابی گئی ساتھ واں کو چھوڑ / لیا مُردہ عاشق نے گویا مروڑ
بغل گیر عاشق ہوئی زیرِ خاک / ہوئی ہم کناری میں آخر ہلاک
زمیں مل گئی جب یہ آخر ہوئی / مسافر سے مل کر مسافر ہوئی
اچنبھا سا یہ سانحہ ہو گیا / عجب طور کا واقعہ ہو گیا
خبر شوئے ناساز کو بھی ہوئی / کہ وہ نازنیں جا سرا میں موئی
کہا گور کھولیں پھر بیلدار / کہ بن آنکھوں دیکھے نہیں ہے قرار
کھلی گور دیکھا تو چسپاں ہے وہ / گلے لگ رہی تھی وہ بے جاں تھی وہ

نئی گور کر دفن دن کو کیا
نہ غیرت سے شوہر نے ماتم کیا

نہ وارث تھا کوئی کہ اس کو اٹھائے ‏ رکھے نقشہ کاندھے یہ تا گور جائے
کچھ اس بھترانی نے تزئین کی ‏ مروّت تکفین کی
جنازہ نکالا بڑی شان سے ‏ نماز اس کی کی سو مسلمان سے
کیا اس سرا ہی میں مدفوں اُسے ‏ کیا تھا محبت نے مجنوں اُسے
سرا کے ہے سب لوگوں کو انتظار ‏ کہ کب آوے گی رشک باغ و بہار
سرا اس کے رہنے سے گلزار تھی ‏ کرم خصلت و لطف کردار تھی
کہا شو نے منزل کریں گے جہاں ‏ کوئی دن رہیں گے ضرورت کو وہاں
زن اصرار کر اس ہی جا میں گئی ‏ کشش عشق کی لے سرا میں گئی
اُترتے دگرگوں ہوا حالِ دل ‏ وہی کوٹھری میں تھی پتھر کی سل
وہ آنکھیں کہ تھیں رشک چشم غزال ‏ ٹھٹک رہ گئیں آئینہ کے مثال
لگی رونے آزردہ ہو زار زار ‏ گیا جذب اُلفت سے صبر و قرار
سفر کردہ کا حال پرساں ہوئی ‏ بہت سی بہت دل پریشاں ہوئی
کہا سو کہا بھترانی سے یہ ‏ کہ وہ یہاں جو رہتا تھا کیدھر ہے کہہ
خیال اس کا جاں سے مجھے لے گیا ‏ مسافر عجب داغ ایک دے گیا
جدھر جاؤں وہ بھی چلا جاوے ہے ‏ مرے ساتھ پرچھائیں سا جاوے ہے
مگر شو سے مجھ کو ندامت ہوئی ‏ مری جان پر یہاں قیامت ہوئی
نشاں دے ترے پاس رہتا تھا وہ ‏ سدا درد دل مجھ سے کہتا تھا وہ
گیا یاں سے اُٹھ کر تو کیدھر گیا ‏ کہیں جا کے جیتا ہے یا مر گیا
کہا بھترانی نے بے تاب دیکھ ‏ کہ قرباں میں اب نہ یہ خواب دیکھ
مسافر سرا میں کہا مر گیا ‏ جُدا تجھ سے کام اپنا وہ کر گیا
کیا تیری فرقت نے اس کو ہلاک ‏ ہوا میرے ہاتھوں سے وہ زیرِ خاک
سُن اس واقعے کو بہت غم کیا ‏ عزا میں بہت حال درہم کیا
چُپ اب عشق کا راز رسوا نہ ہو ‏ خدا جانے ظاہر جو کیا کیا نہ ہو
ترے چپکے رہنے سے ممنون ہوں ‏ میں اس منت احساں کی مرہون ہوں
مبادا سُنے شوئے ناساز کچھ ‏ لگا وے اسے اور غماز کچھ

سنی سب نے یہ خوں چکاں گفتگو
مگر اک سیہ کار ہو رُو بُرو
سروں کو کیا شرم سے ٹک فرو
لگا کہنے کیا ہے یہ طولِ کلام

کہاں بات کرنے کی فرصت ہے یاں
ہے مہلت جو کچھ ہے غنیمت ہے یاں
دم آب موقوف بیعت ہے یاں
ہمیں قتل و غارت کا ہے اہتمام

نبی زادہ ہے تشنگی سے نڈھال
عتاب اس پہ کرتا ہے ہر بدخصال
تمہیں اس کے جی مارنے کا خیال
خطاب اس سے کرتا ہے اب ہر کدام

اٹھایا جبیں پر جو زخم سناں
جھکا پشتِ زیں سے امام زماں
ہوا خاک پر خون ازبس رواں
گئی چھوٹ مرکب کی کف سے لگام

غش آیا لہو جب بہت سا گیا
سر و تن ہوئے اتفاقاً جُدا
جھکا یعنی سجدے کا مائل ہوا
نہ چالیس دن تک ہوا التیام

لگا آگ خیمے جلانے لگے
ستائے ہوؤں کو ستانے لگے
پدر مُردہ کو کھینچ لانے لگے
کھلے سر گئے مردمانِ خیام

۲

زباں پر حسن، زیر لب وا حسین
اُٹھے گی کوئی کہہ کے جویا حسین
کہے ایک یہ ہو گیا کیا حسین
تو سامع سروں کے تئیں لیں گے ڈال

عجب حال ہو گا جو لڑکے تمام
کہے گا کوئی غم سے گریا امام
پکاریں گے ہے دوست ہے دوست شام
تو ہو گا بکا مسجدوں میں کمال

مراثی

کوئی کہتی تھی اے شہ یہ ستم کیا ہم پہ ہوتا ہے
نہیں کوئی پونچھتا آنسو گروہ اک غم سے ڈرتا ہے
تو کن نیندوں سحر سے قتل گہ میں آج سوتا ہے
ہمارا شام کی جانب کو لے جانا مقرر ہے

جہاں تاریک ہے بھتیجے مر گئے سارے
رفیق ایک ایک گن کر دشمنوں نے جان سے مارے
جفائیں سہتے سہتے باز ماندے شاہ کے ہارے
چراغ اک نیم کشتہ سا ہے باقی سو بھی مضطر ہے

جو کچھ اے میر آگے چل کے پیش آیا انھیں مت کہہ
کہاں تک نوحہ و زاری کرے گا ہر گہ و بے گہ
یہیں سے رنگ تیرے دل کا پیدا ہے بس اب چپ رہ
کہ جو آنسو گرے ہے آنکھ سے یاقوتِ احمر ہے

۴

خاک تیرے فرق پر اے بے مروت آسماں
ایک قطرہ آب کو ابن علی دیتا ہے جاں
بھائی بیٹے اس کے مارے جاتے ہیں کیا کیا جواں
کھول چشم مہر و مہ، پھر وقت ملتا ہے کہاں

آنکھیں ہیں سارے ستارے پر نہیں تجھ کو نظر
ہاتھ دھلوا ایسے مہماں کے سعادت جان کر
ہو سکے تو صرف کر مقدور اس کا پانی بھر
آگیا ہے ساقیِ کوثر کا نورِ چشم یاں

گھر سیاہ اپنے کریں گے اس عزا میں سب امیر
اس کے ماتم میں بہت سے لوگ ہوویں گے فقیر
سینہ کوبی کرتے کوچوں میں پھریں گے خورد و پیر
عورتیں بیتاب نکلیں گی گھروں سے مو فشاں

یار و انصار اس کے مارے جائیں گے یک بارگی
ہو گی اس جمع معزز میں عجب آوارگی
اترے گا گھوڑے سے وہ زخمی بصد بیچارگی
ہو گا سر نیزے پر جوں خورشید حشر اس کا عیاں

ماتمی سارے کہیں گے ایک فلک یہ کیا کیا
کنبہ اس کا مار کے سارا، اسے تنہا کیا
پھر یہ ہنگامہ سر بے کس پہ کیا برپا کیا
جس سے وہ جی دے گیا، ہے غم کدہ یہ خاکداں

کریں گے سیہ خانہ اہلِ عزا / بناویں گے شہروں میں دشت بلا
جہاں ایک ہووے گا ماتم سرا / گریں گے جو آنسو تو خوں کی مثال

پڑھیں گے کوئی مرثیہ تیر کا / دلوں میں کرے کام جو تیر کا
پھٹے گا جگر کو دک و پیر کا / نپٹ خوں چکاں ہوگی وہ قیل و قال

لگی آگ خیمے جلے سربسر / ہوئے لوگ ناموس کے دربدر
نہ وارث، نہ صاحب، نہ جاگہ، نہ گھر / ملا خاک میں جاہ و مال و منال

اٹھا بیبیوں میں سے یکبار شور / کہ ٹک دیکھ عابد ہماری بھی اور
نہ وارث ہے تجھ بن، نہ کچھ ہم میں زور / ستم ہے قضا گر تجھے دیوے ٹال

عزیز آہ تیرے جو تھے کٹ گئے / مچی غارت ایسی کہ ہم لٹ گئے
ردائیں کہن رگ گئیں گھٹ گئے / یہ اب حال ہے دیکھیں کیا ہو مآل

نہ احوال کا کوئی عالم ہے یاں / نہ داور، نہ یاور، نہ حاکم ہے یاں
نہ تو ہے نہ اکبر نہ قاسم ہے یاں / کریں دادِ دل کا سو کس سے سوال

۳

تحیات اے عزیزاں! بابت اہل پیمبرؐ ہے / درود اے دوستاں شائستۂ اولاد حیدرؑ ہے
نیاز اے حق پرستاں! لائق شبیرؑ و شبرؑ ہے / سلام اے مومناں! ایسے جو ہوں ہر لحظہ ان پہ ہے

بہت دل جوئی اُمت میں تھا صرفِ توانائی / سو وہ اُمت ہمارے آج کے دن خوب کام آئی
گیا گھر بار غارت، مار ڈالے بیٹے اور بھائی / خرابی آل کی دیکھے محمدؐ آج کیدھر ہے

کیوں خون ترا خاک سا پامال ہوا ہے — تھا تُو تو سبھوں کا گلِ دستار حسینا

یہ آتشِ غم کس سے کہیں جا کے بجھاوے — شعلے سے جو اٹھتے ہیں جگر میں سے بٹھاوے
یوں جلتے رہیں کب تئیں، ہم سب کو جلاوے — کاش آ کے کوئی ابرِ شرر حسینا

۷

گردوں نے کس بلا کو یہ کر دیا اشارا — ابنِ علی کو جن نے اس گھاٹ لا اتارا
دریا کے خاک سر پر جو کر رہا کنارا — دنیا سے خشک لب یہ سید گیا ہمارا

تھے لوگ سب حرم کے جوں بید سر برہنہ — ان میں سکینہ خورشید سر برہنہ
تھی شہر بانو یکسر نومید سر برہنہ — نوحے سے جس کے جنگل تھا زلزلے میں سارا

کہتی تھی خوب دیکھی بیٹے کی کدخدائی — کیا دھوم ہو رہی تھی جس دم برات آئی
کون آوے ہو براتی سب مر گئے تھے بھائی — یا دولہا آن اُترا یا مرنے کو سدھارا

ہے عابدیں جو باقی بیمار و ناتواں ہے — درپیش پھر سفر ہے ساتھ اس کے کارواں ہے
دل جوئی سکینہ کیا ہو سکے عیاں ہے — شور اک اٹھا جو اُن نے بابا کے تئیں پکارا

۸

صرفِ خزاں ہے باغِ امامت — اچھی نہیں کچھ یاں کی علامت
ہر گل کے سر پر ہے اک قیامت — پیراہن اپنا تو بھی قبا کر

بابا نہ تھا جو چھاتی لگاتا — بھائی نہ تھا جو ہمت بندھاتا
بیٹا نہ تھا جو لاشیں اٹھاتا — مرنا بنا جو بے کس ہو آکر

۵

فلک قتلِ سبطِ پیمبر ہے کل — یہ ہنگامہ ہونا مقرر ہے کل
سحر شامِ تیرہ سے بدتر ہے کل — بلا کل مکل ہے کہ محشر ہے کل

نہ ہوگا کوئی یار و انصار آہ — نہ خویش و برادر نہ رتبہ نہ جاہ
مرے گا بہت ہو کے بے کس وہ شاہ — نہ قاسم، نہ اکبر، نہ اصغر ہے کل

نہ عبّاس ہوگا نہ ہوگا عَلم — کہ ہاتھ اس کے بازو سے ہوگا قلم
رہیں گے جو پیچھے کسانِ حرم — سو اُن کو نہ جاگہ نہ گھر در ہے کل

معزّز حرم کے رہیں گے جو لوگ — پریشاں پھریں گے گرفتار سوگ
اسیری و غارت سے چالوں کو روگ — نہ پردہ انھوں کو نہ چادر ہے کل

سکینہ کہے گی پدر، کیا ہوا؟ — کرے دل وہی جو گلے سے لگا
نہ کلثوم کے پاس ہوگی رِدا — نہ زینب کے تارک نہ معجر ہے کل

٦

یوں اہل حرم کہتے ہیں وارث نہیں سر پر — جو تیرے تلف ہو گئے آباد رہے گھر
رکھتے تھے توقع کہ جواں سال ہے اکبر — سو کھا گئی اس کو بھی وہ تلوار حسینا

قاسم پہ کبھی اپنی نظر پڑتی تھی جا کر — کہتے تھے اسے سونپے گا شہ ہم کو بلا کر
سو آگے ہی تجھ سے وہ گیا سر کو کٹا کر — کیا روتیے کوئی نہیں غم خوار حسینا

کس واسطے سب روئے زمیں لال ہوا ہے — کل ہے کو ترے باغ کا یہ حال ہوا ہے

یہ کر کے گئے آگے روتے ہوئے غم دیدہ
بس گریہ سے خامے کے کاغذ تو ہے نم دیدہ
اب تو بھی قلم رکھ دے اے میر ستم دیدہ
دیوانی کر اس جا پر یہاں عقل ہے دیوانی

۱۰

سنو یہ قصۂ جاں کاہ کربلائے حُسین
جہاں سے واسطے اُمت کے جی سے جائے حُسین
رکھو ادھر کو بھی ٹک گوش از برائے حُسین
ہزار حیف کہ اُمت نہ ہو فدائے حُسین

جو تعزیے کی ہو مجلس بکا کرو یارو
بجائے چشم بھی اب گوش وا کرو یارو
غمِ حسین میں چپکے رہا کرو یارو
کہ سرگذشت کہے ہے سرِ جدائے حسین

جراحتوں سے تھا یاقوتِ رنگ خوں جاری
لڑی سی ٹوٹ گئی موتیوں کی یکباری
حسین ہائے تری اٹھ گئی صبا ساری
ملے ہیں خاک میں کیا لعل پارہائے حُسین

کیا حُسین کا برباد خانماں سارا
حسین آپ مرا بے کسانہ بے چارا
پسر حسین کا کس ظلم سے جواں مارا
حسین رونے کی جا گہ ہے ہائے ہائے حسین

کوئی کہے تھی کہ اکبر کو مر نہ جانا تھا
چچا کے ساتھ نہ قاسم کو آہ آنا تھا
نہ جنگ گاہ میں عبّاس کو بلانا تھا
کوئی رہا نہ جسے ہم کو سونپ جائے حسین

بہن سے کہتی تھی رو رو کے زینب اے کلثوم
شتابی راہ جو کرتا تھا قطع تھا معلوم
چلا تھا بھائی مدینے سے کیسے وقت شوم
کہ سر کے مارے ہی جانا تھا مدعائے حسین

۱۱

دل تنگ ہو مدینے سے جب اٹھ چلا حسین
لوگوں نے یہ کہا بھی کہ یاں سے نہ جا حسین
ناموس اپنے ساتھ لیے سب، اٹھا حسین
لیکن گیا حسین سو جی سے گیا حسین

اس حال میں آ خیمہ جلایا اسباب ظاہر لوٹا لُٹایا
اس گھر کا ماتم یوں کر اٹھایا یک جا کیے سب میداں میں لاکر

اکبر جواں کو آنکھوں سے کھویا اصغر پیا سا گودی میں سویا
آنکھیں نہ اس دم تیری تھیں گویا جس دم گیا وہ خوں میں نہاکر

بھائی کو دیکھے رو رو سکینہ جن کی نظر سے جل جائے سینہ
پھرڑ رہے ان کے، جن کو تھا کینہ رہ جائیں آنکھیں دونوں ملاکر

قاسم کی شادی ویسے رچائی لوہو سے مہندی بھر کر لگائی
جوں شمع دُلہن روتی بنائی آخر مُوا وہ چھاتی جلاکر

۹

ایمان یہ کیسا تھا، کیسی یہ مسلمانی کی آلِ پیمبر سے جو دشمن جانی
بے آبی میں کشتی تھی شبیر کی طوفانی دریا کے کنارے پر اس کو نہ ملا پانی

دل سینے میں صد پارہ بے طاقت و بیچارہ ناموس بیاباں تھے یک شہر تھے آوارہ
سر باپ کا نیزہ پر کرتا تھا جو نظّارہ چاہے تھا کہ ناخن سے نوچوں سر و پیشانی

کیوں تاجِ شہی تیرا ہے خاک برابر یوں کیوں مارے گئے تیرے سب خویش و برادر یوں
کیوں سر کے تئیں رکھا نیزے کے اوپر یوں برباد کیا بارے کیوں تختِ سلیمانی

پڑ گرد بیاباں میں آوارہ ہوئے از بس بیچارہ و بے وارث، بے جا و مکاں بیکس
جا بیٹھیں کہیں چھپ کر اپنا جو چلے کچھ بس کیا دیکھی ہے رسوائی، کیا خاک ہے یاں چھانی

۱۲

اس لشکرِ شکستہ و خستہ کو ایک بار
میداں میں کارزار کے ہو کر ہوا گزار
دیکھا وہ خاک و خوں میں کٹا سر جو تاجدار
کہنے لگا ہر ایک کہ اے شہ! یہ کیا ہوا؟

اُمت نے نبی کی کیا تجھ کو یوں ہلاک
تھا کیا سبب کہ بسترِ راحت ہوئی ہے خاک
کچھ وجہ بھی کہ دھوپ میں جلتا ہے جسم پاک
رویت علی کی جاتی رہی کیا بلا ہوا

فرزند و زن اسیر ہوئے ٹک تو آنکھ کھول
خیمے گرے پڑے ہیں کھڑے غول کے ہیں غول
حیرت سے ہم تو چپ ہیں بھلا تو تنک تو بول
اک شور ہے جو منہ مندے تو ہے پڑا ہوا

کیا کہیے ترے غم سے جگر ہو گیا گداز
تجھ پیشوا کی لاش کو ہے خاک و خوں سے ساز
کر ذبح تجھ کو دوڑے ہیں شامی پئے نماز
خوب اُن سے تیرا حقِ امامت ادا ہوا

سینے تمام داغ ہیں دل میں ہیں آبلے
ہرگز نہ اِس چمن میں گلِ آرزو کھلے
جی چاہتا تھا مسندِ عزت تجھے ملے
سو ہم نے تجھ کو خاک میں دیکھا مِلا ہوا

خیمے جلے، اسیر ہوئے، دیر تک گھرے
لوٹے گئے، اداسیں، مضطرب پھرے
کیا گیا نہ پیش آیا ہمیں جاتے ہی ترے
پژمردہ کیا ہے، یہ جو ستم بر ملا ہوا

برباد اس طرح سے نہیں جاتے گھر کہیں
ملتے نہیں ہیں خاک میں یوں دُر تر کہیں
چلتی نہیں ہے تیغِ وفا اس قدر کہیں
جو تن نظر پڑے ہے تو ہے سر کٹا ہوا

۱۳

وقتِ رخصت کے جو روتی تھی کھڑی زار بہن
بولے شہ روؤ نہ بس اے مری غم خوار بہن
کیا کروں جان کے دینے میں ہو ناچار بہن
اب رہا روزِ قیامت ہی پہ دیدار بہن

طے کر کے مرحلوں کو گیا کوفے کے قریب
پیماں سے اپنے پھر گئے وے سارے بے نصیب
بدعہدی اُن کی دیکھ کے آگے چلا غریب
تھا ساتھ اک ثبات کے پر وہ نہ تھا حسین

سیلاب اس کے خون سے اس خاک پر بہا
انصاف کر کنھوں نے نہ افسوس ہی کہا
وارث نہ کوئی عابدِ بیمار بن رہا
سو وہ ضعیف و مضطرب و لب پہ وا حسین

میں ناتواں ساتھ مرے ایک کارواں
تِس پر کہیں ہیں راہ چلا چل ڈُواں ڈُواں
میں دردِ دل کو جا کے الٰہی کہوں کہاں
ہوتا تو کان رکھ کے یہ سنتا تھا حسین

نے بھائی نے بھتیجے، نہ بیٹے، نہ اپنے لوگ
مارے گئے تمام، غم ان کے ہیں جی کے روگ
پُرسے کو کون پوچھے گا جو بیٹھے بھی سوگ
کنبہ تو تیرے آگے ہی سب ہو چکا حسین

کیا جانتے تھے ہم کہ یہ ایسا ستائیں گے
گھر بار کو علی کے کھڑے ہو لٹائیں گے
سبطِ نبی کے سر کے تئیں یوں کٹائیں گے
اسلامیوں سے ہم کو گماں یہ نہ تھا حسین

بیگانہ وار تو اے شہ کم سپہ گیا
چلتے ہوئے کسو سے نہ اک حرف کہہ گیا
ناچار تیرے منھ کو ہر ایک دیکھ رہ گیا
صد رنگ تجھ سے رکھتے ہیں ہم سب گِلا حسین

اس دردِ دیں کو دیکھ جگر ہو گئے گداز
سبطِ نبی پہ دستِ ستم کر چکے دراز
افسوس ہے نہ باندھ کے صف وے پڑھیں نماز
لو ہو میں اپنے سجدہ کرے تو ادا حسین

لے سب اسیر شام کی جانب کو ہیں رواں
ناچار ان کے ساتھ ہوں میں زار و ناتواں
کر جاؤں تیری فکر سو فرصت مجھے کہاں
حافظ نگاہباں ہے تیرا خدا حسین

فرصت نہ تھی کہ رسمیں میت کی کرنے پاوے
ہر گام ضعفِ تن نے سو مرتبہ گرایا

گھر کی طرف جو دیکھا سو لٹتے گھر دیکھا
بھائی میں دم نہ دیکھا بے سر پدر کو دیکھا
دیکھا جدھر، نہ اپنا کوئی اُدھر کو دیکھا
ہوتا کوئی تو کہتا تو مرے کو نہ آیا

قوت نہ پاؤں سر میں، حیراں غمِ پدر میں
پانی نہ کچھ جگر میں، نومیدی سی نظر میں
دشمن تمام گھر میں، ناموس رہ گذر میں
غیرت نے دل جلایا، خجلت نے جاں کھپایا

اصغر موا بچارا، اکبر سوؤں سدھارا
قاسم کو جی سے مارا، بابا کا سر اُتارا
قوم و قبیلہ سارا یوں کر گیا کنارا
پانی دیا نہ قطرہ، دریائے خوں بہایا

بابا کی جستجو میں، ملنے کی آرزو میں
اک حُزن گفتگو میں، اک درد مُو بمُو میں
طوقِ گراں گلو میں، پھر سر پہ ایسی دھو میں
اُس خاک میں ملے کو کیا خاک میں ملایا

باقی اسیر تھے سب فریاد و نالہ برلب
مت پوچھنا کوئی اب تھا دن سیاہ جوں شب
ہے میرؔ بات بے ڈھب خاموشی ہی ہے انسب
ان قیدیوں کو کن نے ہو ملتفت چھڑایا

۱۵

آزار تیرے جور سے انواع پا گیا
یاقوت پارہ خاک میں اپنے ملا گیا
کیا کیا زبان حسین جہاں میں اٹھا گیا
ناموس دی بہ باد جدا سر جدا دیا

آنکھوں میں اس کے ہو نہ جہاں کس طرح سیاہ
کیا سوجھے اس کو جہرے پہ کس کے کرے نگاہ
اکبر اندھیرے گھر کا اجالا تھا اس کے آہ
بادِ ستم نے تِس کو دیا سا بجھا دیا

ہم دم جو تھے حسین کے مارے گئے سبھی
یاری کی، یاوروں کی، نہ جہلت کسو کو دی

ہاتھ سے بیٹوں بھتیجوں کو نہ یوں دے جاتا
بے کسانہ رفقا کے نہ گلے کٹواتا
کسو کو ساتھ لیے کاہے کو یاں میں آتا
علم اگر ہوتا کہ یہ دشت ہے خوں خوار بہن

ہائے یہ وقت نہیں طاقتِ دل کھونے کا
کڑھیو تب جب تجھے غم ہو نہ مرے ہونے کا
ابھی کیا رووے ہے آگے ہے سماں رونے کا
یاد آؤں گا بہت میں جگر افگار بہن

خاک میں اپنے جگر پارے پڑے پاتا ہوں
رنگ صحبت سے کھڑا خونِ جگر کھاتا ہوں
جی میں جو کچھ ہے سو جی ہی میں لیے جاتا ہوں
وقت ہے تنگ، مناسب نہیں اظہار بہن

ایسی بدحالی سے گرتا نہ جو اکبر بیٹا
اپنے دل کے لہو سے خاک کھڑا منہ دھوتا
آج کے دن جو سلامت مرے سر پر ہوتا
دیکھتا ہوں نہ مجھے حیدرِ کرّار بہن

جور کے تیر کا اصغر کا گلا تھا قابل
قاسم ایسا تھا کہ مارا پڑے ہو کر گھائل
میں رہوں ایسا کہ مرے درپئے خوں ہوں حائل
عالم الغیب ہی جانے ہے یہ اسرار بہن

جس گھڑی جان مری تن سے جدا ہووے گی
دن کی ہو جاوے گی شب، تیرہ ہوا ہووے گی
درہمی برہمی سے حشر بپا ہووے گی
اس قیامت میں سکینہ سے خبردار بہن

شہر بانو کو نہ ٹک پاس سے ہلنے دیجو
فرطِ اندوہ سے دل اس کا سنبھلنے دیجو
غم کی ماری کو نہ جنگل میں نکلنے دیجو
اُس کے سب اہل جنوں کے سے ہیں اطوار بہن

۱۴

سجاد کو فلک نے کس کس طرح ستایا
کنبہ کو ووں کھپایا، گھر بار یوں لٹایا
سر باپ کا کٹایا تھا سر پہ جس کا سایا
لاشے کو اس کے تس پر یوں دھوپ میں جلایا

رخصت نہ تھی کہ مردہ اس کا اٹھا کے جاوے
مہلت نہ تھی کہ گھر کے لوگوں کے تئیں چھپاوے

مرتے حسین کے وہ زمانہ نہیں رہا
جو ہے سو مدعی ہے یگانہ نہیں رہا
ناموسِ احمدی کو ٹھکانہ نہیں رہا
فریاد لے کے جائیں کہاں، وامصیبتا

زہرا نے دودھ جس کے تئیں مہر سے دیا
حیدر نے جس کو سر پہ رکھا جب تلک جیا
آغوش میں نبیؐ نے جسے پرورش کیا
سر اُس کا اور نوکِ سناں وامصیبتا

بیٹی یہی کہے ہے کہ بابا کب آوے گا؟
کب کیا گیا ہے، کب تئیں تشریف لاوے گا
شاید یہ حرف جان ہی کے ساتھ جاوے گا
کڑھنے سے اس کے ہے یہ عیاں وامصیبتا

وحشی ہی فرطِ غم سے نہیں دشت میں اُداس
جاتے نہیں طیور بھی میر آشیاں کے پاس
کیا مرد و زن ہر ایک کے مفقود ہیں حواس
ماتم زدہ ہیں خرد و کلاں وامصیبتا

۱۷

قاسم کی شادی اُس دن رچائی
جس دن کہ شہ سے کچھ بن نہ آئی
دلہن اسمے نے ایسی بنائی
وہ بزم جن نے ساری رُلائی

عباس جس سے بازو امامت کا تھا قوی — تیغ جفا سے بازو وہی اس کا کٹا دیا

مظلوم سیدوں کا نہ ثابت ہوا گناہ — آل نبی کا پاس کیا خوب واہ! واہ!
مارا جہاں وہاں نہ ملا قطرہ آب آہ — لوہو سے ان پیاسوں کے دریا بہا دیا

گھر پر علی کے ایسی مصیبت تھی جب پڑی
ہر پردگی نکل کے ہوئی بے ردا کھڑی
کیدھر تھے تیرے دیدۂ مہر و مہ اس گھڑی
مل کر زمیں سے تونے نہ ان کو چھپا دیا

بس میرؔ اب تو خامۂ آتش زباں کو تھام
سوز جگر سے تیرے تو جلتے ہیں دم تمام
مانند شمع کشتہ خموشی سے کر کلام
کیا کہیے؟ گردش فلکی نے رِجھا دیا

۱۶

اندھیر شامیوں کے ستم سے بڑا ہوا
سر ہے سناں پہ شاہ کا تن ہے پڑا ہوا
خورشید ایک نیزے پر آکر کھڑا ہوا
محشر ہوئی جہاں میں عیاں، وامصیبتا

آکر وطن سے ابن علی جان سے گیا
اہل حرم پھرے ہیں بیاباں میں بے ردا
عابد چلا ہے ہاتھ بندھے وا محمدؐا
زینب ہے سر پہ خاک فشاں، وامصیبتا

۱۸

نسیمِ غم سے ہے آتش بجاں امام حسین — دم ایک اور ہے اب میہماں امام حسین
چراغ آخرِ شب ہے گایاں امام حسین — سحر نمود ہوئی پھر کہاں امام حسین

نبی نے برسوں تئیں جس کا ناز اٹھایا تھا — علی نے آنکھوں پہ قدرت جسے بٹھایا تھا
جسے کہ مہد میں جبریل نے جھلایا تھا — وہ خاک و خون میں اب ہے طپاں امام حسین

تمام شکل نبی ہی کا تھا علی اکبر — اسی کو دیکھتے مشتاق روئے پیغمبر
ہوا برابر خاکِ سیہ وہ گوہر تر — دیا ہے ہاتھ سے کیسا جواں امام حسین

فرات اخاک سر اس کے کہ جس کا ایسا آب — کہ جس سے موجیں اٹھیں با ہزار پیچ و تاب
تمام بادیہ کے وحش و طیر ہوں سیراب — دکھاوے تشنہ لبی سے زباں امام حسین

قیامت ہو کے نمودار ہو گی محشر کو — سخن میں لاویں گے جب اس جواں کے سر کو
عجب نہیں ہے جو بے تابی آوے داور کو — کرے گا گر یہ مصیبت بیاں امام حسین

۱۹

کہانی رات تھی آلِ نبی کی — مرادِ جانِ زہرا دل جلی کی
مصیبت دیدگی ابنِ علی کی — گئی سن نیند یک باری سبھی کی

پدر شاہِ ولا اور اس کا نانا — محمد جس کو دو عالم نے جانا
فلک نے خاک کو یک عمر چھانا — تب اس محبوب نے جلوہ گری کی

یہ شہ تھا کم سپہ، ساتھ اُن کے لشکر — یہ بے کس اور وہ مغرور و مُفتر
اُدھر اسبابِ ظاہر جمع یک سر — فقط اک اس کنے ہمّت شہی کی

دولہا اگر تھا ظاہر نویلا — لیکن نہایت بے کس اکیلا
بابا کا مرنا اس طور جھیلا — طاقت سے آگے ایذا اٹھائی

ایک زخم سا زخم آکر اٹھایا — دیکھا چچا نے طاقت نہ لایا
گھوڑے سے گرتے چھاتی لگایا — نازک وہ پیکر بے جان پائی

آرائش بزم کیا کہیے بارے — آہوں کے شعلے گل ریز سارے
گرتے تھے آنسو جیسے ستارے — چھوٹے تھی منھ پر سب کے ہوائی

اصغر پیاسا مرنے لگا جب — مردم حرم کے گریاں ہوئے سب
لاچار ہو شہ بھی آپ ہی اٹھا تب — ایک چلّو پانی کرنے گدائی

گردن کٹائی اکبر نے جب کی — تر چشم ہے گی ہر خشک لب کی
عالم سیہ ہے آنکھوں میں سب کی — دیتا نہیں کچھ اُس بن دکھائی

افراط غم سے بس تنگ آکر — جینے سے بیٹھا دل کو اٹھاکر
وعدہ پہ آخر میداں میں جاکر — خنجر کے کارن ضربت اُٹھائی

دنیا کی خاطر دیں ان نے چھوڑا — ابن علی سے سررشتہ توڑا
یک بار ادھر سے منھ اپنا موڑا — تھا آشنا سو نکلا دغائی

غربت میں مارا لاکر وطن سے — محروم رکھا تس پر کفن سے
ہاتھ اک پسر کے باندھے رسن سے — کی ناتواں پر زور آزمائی
اب شام کو ہم جاتے ہیں سارے — شب کو دکھایا دن کو ہمارے
کیا پیش آوے واں پہنچے بارے — طالع میں اپنے ہے نارسائی

گُل و بوٹے بھی ماٹی میں آٹے ہیں　　جفا کا ہر طرف چلتا ہے آرا

وہ سیّد کشتۂ شمشیر نامرد　　پڑا ہے خاک میں جس پر منوں گرد
علی کا نورِ عین و نازپرورد　　تمہاری آنکھوں کی پُتلی کا تارا

نہیں فرصت کہ سونپوں خاک کے تئیں　　تسلّی دوں کسو غمناک کے تئیں
مگر سونپوں خدائے پاک کے تئیں　　کہ وارث کون ہے اس میں ہمارا

۲۱

کہاں آیا تو اپنے پاؤں چل کر　　جہاں سر یوں دیا آخر کو جل کو
کہیں سو کہیں اب ہاتھ مل کر　　یہی کہتے ہیں سب ہے، دوست ہے دوست

وطن سب کا عرب مدت کا باسا　　امامِ دیں محمدؐ کا نواسا
ہوا آنکھوں کے آگے سب کے پیاسا　　عجب بل صد عجب ہے دوست ہے دوست

جنھوں سے تھی اُمید مہربانی　　دریغ ان سب نے رکھا تجھ سے پانی
ہوئی دریا پہ مشکل زندگانی　　موا تو تشنہ لب ہے دوست ہے دوست

ہوئی نانا کی اُمت دشمنِ جاں　　رہا تو دیر خاک و خوں میں غلطاں
رہی دین داری و اسلام و ایماں　　نہ عزت نے ادب ہے دوست ہے دوست

غیور ایسا نہ کوئی ہم نے پایا　　جگر حسرت نے پانی کر دکھایا
موا لب خشک، پر لب پر نہ آیا　　کبھو حرفِ طلب ہے دوست ہے دوست

۲۲

کرتا ہے یوں بیان سخن رانِ کربلا　　احوال زار شاہِ شہیدانِ کربلا

لگے آزار پر پہنچانے آزار — لے آئے بیچ میں بیعت کی گفتار
کھنچی پُرخاش کو آخر کو تکرار — نہ اک گم رہ نے اس کی ہمرہی کی

وطنِ مالوف کو القصّہ چھوڑا — نبی کی گور سے ناچار توڑا
زمانے نے یکایک منہ نہ موڑا — نہ یک دم آسماں نے ہمدمی کی

ہوا دشت بلا کو جب روانہ — پھرا حد سے زیادہ پھر زمانہ
مِلا اس کو وہاں پانی نہ دانہ — فلک نے اس کی مہمانی بڑی کی

مخالف جوق جوق اودھر سے دھائے — سنان و تیغ و خنجر لے کے آئے
عزیزوں نے گلے اپنے کٹائے — نہ پوچھو شامیوں نے جو بدی کی

۲۰

کیا گردوں نے فتنے کو اشارا — بلا کو کربلا میں لا اُتارا
ہوا آخر طلب سیّد ہمارا — کٹا ناموس پیغمبر کا سارا

مروّت شامیوں سے بن نہ آئی — ہوئی یہ چشم و روئے بے وفائی
ستم کی تیغ سب نے آزمائی — حسین ابن علی کو جی سے مارا

پڑی راہ اس طرف اس کارواں کی — جہاں لاشیں پڑی تھیں کشتگاں کی
ہراک نے خوں چکاں لب سے فغاں کی — ہوا آشوبِ محشر آشکارا

کوئی رو رو کے زہرا کو پکاری — کہ دیکھو خوار ہے اولاد ساری
نہیں لیتیں خبر جو تم ہماری — ہوا شاید جگر پتھر ہمارا

جگر ہم سب کے اس غم سے پھٹے ہیں — شجر اس باغ کے سارے کٹے ہیں

قتل ہوا پھر کس خاطر سردار. بھلا ان لوگوں کا
یہ جو مسافر آ اترے تھے کا ہے کو ان پہ چڑھائی ہوئی

ایک بہن کہتی تھی۔ یوں گھر بار ترا کیوں لوٹ لیا
کوئی نہ چھوڑا پیچھے. جیتا ہائے یہ کیا ستھراؤ کیا
کنبہ مر کر ڈھیر ہوا، آخر کو تو نے جی بھی دیا
بارے تقصیر ایسی سزا کی کیا تجھ سے اے بھائی ہوئی

ایک کہے تھی نوشہ قاسم کیسا بیاہ رچایا تھا
کیا ساعت تھی نحس وہ جس میں بیاہنے کو تو آیا تھا
لگ گئی چپ ہے ایکا ایکی اتنی ہی کیا لایا تھا
منھ بولے ہے اب تک تیرے ہاتھ کی مہندی لگائی ہوئی

کیا سمجھی یہ قوم سیہ رو کیا ان نے یہ خیال کیا
زہر حسن کو دے کر مارا، حیدر کا وہ حال کیا
اب جو حسین رہا تھا بے کس تس کو یوں پامال کیا
اوّل سے لے تا آخر کیا ان لوگوں سے بھلائی ہوئی

۲۴

آئی ہے شب قتل حسین ابن علی کی — رخصت ہے سحر عزتِ والائے نبی کی
کٹ جائے گی سب آلِ رسولِ عربی کی — برہم ہی ہوئی جان کو صحبت یہ کبھی کی

ہر گز نہ ملے گا کسو کو ایک دم آب — کیا خورد و کلاں پیاس سے ہو جائیں گے بیتاب
تڑپیں گے پڑے خاک میں کیا کیا دل بیتاب — دریا پہ یہ آفت پڑے گی تشنہ لبی کی

باآنکہ تھا فرات پہ میدانِ کربلا — پیاسا ہوا ہلاک وہ مہمانِ کربلا

انصاف کی نہ ایک نے کی چشم نیم باز — کھولے ستم نے ہاتھ زبانیں کیاں دراز
قتلِ امام مقصد و تیاریِ نماز — بدتر تھے کافروں سے مسلمانِ کربلا

ہیں تودہ تودہ لاشوں پہ جن کی یہ خاک دھول — سب یہ شگفتہ رُو ہیں نگاہوں میں جیسے پھول
منھ دیکھ ان کے کہتے تھے صلوٰۃ بر رسولؐ — گلزار تھی یہ وادیِ ویرانِ کربلا

اب سب ہی خاک و خوں میں وہی ہیں اٹے پڑے — اشجار نونہال ہیں سارے کٹے پڑے
دل ہیں فگار، سینے ہیں سب پھٹے پڑے — مسلخ سے کم نہیں یہ گلستانِ کربلا

موقوف غم نہ ہوگا یہ جب تک کہ ہوں گا میں — مدت تلک مصیبتیں اپنی کہوں گا میں
جیتا رہوں گا جب تئیں روتا رہوں گا میں — اب تھم چکے یہ دیدۂ گریانِ کربلا

شاید غبار رکھتی ہیں چشمانِ مہر و ماہ — احوال پر ہمارے نہیں مطلقاً نگاہ
پردہ ہے جو گر پڑے گردونِ روسیاہ — ہیں سر برہنہ خاک نشینانِ کربلا

پیٹے ہیں ہم حسینؑ کو جو کھول کھول بال — کیا خاطروں سے جاتے رہیں گے ہمارے حال
اشجار بید کے جو ہیں سو سالہائے سال — دیویں گے یاد بے سر عریانِ کربلا

ہفتم سے آب دانہ کا قدغن ہوا تھا یاں — جز ذکرِ تیغ تیز نہ کچھ آیا درمیاں
سادات کشتہ جانتے ہیں یا انھوں کی جاں — جو دیکھ کر موئے ہیں یہ حرمانِ کربلا

۲۳

ہائے کنھوں نے یہ بھی نہ پوچھا کیا ہے گنہ ان لوگوں کا
ثابت کچھ تو کیا چاہیے ہے حال بُرا ان لوگوں کا

یہ خوں چکاں فسانہ رکھتا نہیں پایاں
مہماں عزیز ایسا تعظیم کا جو شایاں
اس پر یہ جو ہوئے بے حد ایسی جفا نمایاں
بے داغ سب کے دل پر اس ظرفہ ماجرا کا

۲۶

اُس گلِ باغِ امامت کے ہیں پھول
آبیاری جن کی کرتی تھی بتول
سو تنِ نازک پہ اس کے خاک دھول
دیدنی ہے رنگ صحبت یا رسول

پھر گئی کیا آہ یک باری ہوا
اڑ گئے سب طائرانِ خوش نوا
کیا زمانے نے ستم رکھا روا
جائے بلبل زاغ بیٹھے پھول پھول

ظالماں پژمردہ گل سب کر گئے
خار و خس سے گلستاں اب بھر گئے
آدمی کی جنس یعنی مر گئے
باغ جنگل ہو گیا پھرتے ہیں غول

جس کا نانا رحمت اللعالمین ص
باپ جس کا وہ امیر المومنین
خود امام برحقِ دینِ مبیں
تس کو ماریں یہ ظلوم اہل جہول

تھا غرض شاداب کیا یہ گلستاں
پھول و گل تھے رنگ رنگ اس میں عیاں
آگئی یک بار اس پر یوں خزاں
کل جو تھے غنچے موئے ہو کر ملول

۲۷

یک دم کہ تیری ہستی میں ہو جائے گا غضب
سادات مارے جائیں گے دریا پہ تشنہ لب
برسوں فلک کے رونے کا پھر ہے یہی سبب
مت آ عدم سے عالمِ ہستی میں زینہار

فردا حسین می شود از دہر نا امید
اے صبحِ دل سیہ بہ چہ رُو می شوی سفید

جس جا کہ پڑا خاک میں ہوگا وہ تنِ پاک — ہووے گی کھڑی مو پہ کناں زینب غمناک
کلثوم اڑا دے گی کھڑی ہو کے بہت خاک — پرسش نہ کرے گا کوئی اس خاک ملی کی

آنکھوں سے لہو روتی جگر چاک پھرے گی — فریاد کناں منہ پہ ملے خاک پھرے گی
اصغر کے لیے بانو الم ناک پھرے گی — سننے کو نہیں بات کوئی اس جان جلی کی

یک چند جدا جا کے وہ رنجور رہے گا — بے گور و کفن یہ تنِ پُرنور رہے گا
ہر جائے بہم میر یہ مذکور رہے گا — کیا سمجھے تھے وے لوگ جو بے ادبی کی

۲۵

چہلم ہے اے محباں! اس شاہِ دوسرا کا — جو آرزوئے جاں تھا پیغمبر خدا کا
مذبوح دار و دستہ سب خنجرِ جفا کا — رہتا کوئی تو ہوتا غم اس کے کچھ عزا کا

بھائی نہ تھا کہ روتا مُردے پہ ٹک کھڑا ہو — اکبر نہ تھا کہ اس کو واں گور اور گڑھا ہو
قاسم نہ تھا کہ جس کا دل داغ ہو گیا ہو — وہ جان کر موا تھا احوال پہ چچا کا

جا سے گیا نہ اپنی وو وہیں رہا شکیبا — کیا حوصلہ تھا یارب، کیسا دل و جگر تھا
مرنا سبھوں کا دیکھا ان نے خموش یکجا — بولا نہ غیر ازیں کچھ چارہ نہیں قضا کا

نوگل چمن کے اپنے مرجھائے ان نے پائے — اشجار سرکشیدہ اکھڑے نظر میں آئے
پودے جو تھے سو پھل سب خلقِ بریدہ لائے — پھر جانا خوب دیکھا یکبارگی ہوا کا

بہنوں کو پیٹنے کی مطلق ملی نہ فرصت — بیٹے کو راہ چلنا اس پر کہ تھی نہ طاقت
حلوائے مرگ کیا کیسی رسومِ میّت — ہر ایک مبتلا تھا درد و غم و بلا کا

اس ہمسرِ بے وارث اندوہ کی ماری کا   اس دخترِ بے مشفق نادان بچاری کا
اس جمع پریشاں کی اوقات گزاری کا   اس خانہ خرابی کا بیٹے کی نزاری کا
مرنے کا نہ تھا جی، پر ناچار موا آخر
سر جس کے لیے دُھنتا تھا پھر سو ہی ہوا آخر

ناگہ نظرِ زینب میداں کی طرف آئی   اک لاش میں بھائی کے پیکر کی طرح پائی
بے تاب ہوئی از بس آخر گری چلائی   رو رو کے لگی کہنے کچھ وجہ کہی اے بھائی
منھ تک جو ترا! یدھر ہوتا نہیں ہے ہرگز
مُردے پہ ترے کوئی روتا نہیں ہے ہرگز

وہ خانۂ دولت ہے اب غیرتِ ویرانہ   برباد کیا سارا اسباب امیرانہ
ہیں پردہ نشیں اکثر رستے میں فقیرانہ   چلنا ہمیں آیا ہے درپیش اسیرانہ
مُردے کو ترے ہم جو چھوڑے ہوئے جاتے ہیں
افراطِ خجالت سے ہر دم ہوئے جاتے ہیں

۲۹

حسین ابن علی عالی نسب تھا   سزائے عزت و بابِ ادب تھا
جفا و جور کا شائستہ کب تھا   سلوک اسلامیاں سے یہ عجب تھا
کہ اس مہمان کی عزت نہ کیجیے
ضیافت یک طرف پانی نہ دیجیے

محمدؐ جس کی سب امت کہاویں   اسی کی آل کا لوہو بہاویں
علی سن کر جسے سب سر جھکاویں   اسی کے گھر کو بن پانی رُلاویں
رہے اسلام، نادر لوگ، خوش دور
عجب آئیں، عجب ایماں، عجب طور

اسے بے کس جو پایا مار ڈالا   رکھا میداں میں سر کو نیزہ بھالا
پسر کو کانپتا گھر سے نکالا   بٹھائیں عورتیں رستے پہ لا، لا
نہ کچھ کی دل دہی زین العبا کی
نہ کچھ روتے محمدؐ سے حیا کی

ماریں گے تیر شام کے نامرد سارے لوگ　　دیویں گے ساتھ اس کا جنھوں لیا ہے جوگ
تاحشر خلق پہنے رہیں گے لباس سوگ　　ہوگا جہان جوانِ سیہ پوش سوگوار
فردا حسین می شود از دہر نا اُمید
اے صبح دل سیہ بہ چہ رومی شوی سفید
دن شب کو کس امید نے اوپر کرے بھلا　　جو جانتا ہو یہ کہ ستم ہوگا برملا
نکلے گی تیغ جور کٹے گا مرا گلا　　اے وائے دل میں اپنے لیے حسرتیں ہزار
فردا حسین می شود از دہر نا اُمید
اے صبح دل سیہ بہ چہ رومی شوی سفید
خورشید کی بلند نہ ہو تیغ خوں فشاں　　ہے درمیاں نبی کے نواسے کا پائے جاں
ایسا اگر ہوا تو قیامت ہوئی عیاں　　وہ حلق تشنہ ہوگا نہ تیغ آب دار
فردا حسین می شود از دہر نا اُمید
اے صبح دل سیہ بہ چہ رومی شوی سفید
صاحب ہوئے اسیر ہوئے، شام جائیں گے　　سر کو جھکائے شرم سے ہر گام جائیں گے
ناچار رنج کھینچتے ناکام جائیں گے　　لطفِ خدائے عزّ و جل کے امیدوار
فردا حسین می شود از دہر نا اُمید
اے صبح دل سیہ بہ رومی شوی سفید
آثار دکھ کے ہیں در و دیوار سے عیاں　　چھایا ہے غم زمیں سے لے تا بہ آسماں
کچھ میر ہی کے چہرے پہ آنسو نہیں رواں　　آیا ہے ابر شام سے روتا ہے زار زار
فردا حسین می شود از دہر نا اُمید
اے صبح دل سیہ بہ چہ رومی شوی سفید

۲۸

حیدر کا جگر پارہ وہ فاطمہ کا پیارا　　نکلا تھا مدینے سے ناموس لیے سارا
اس چرخ سیہ رو نے اک فتنے کو نکارا　　اس ظلم رسیدہ کو کن سختیوں سے مارا
کرتا تھا وہ آنکھوں سے خون جگر افشانی
دریا کے کنارے پر پایا نہ تنک پانی

تو تنِ تنہا اِدھر اور ہزاروں اُدھر
ایک پہ یہ اژدھام، یا امام یا حسین

۳۲

الوداع! اے افتخارِ نوعِ انساں الوداع | بادشاہ کم سپاہ اے اہلِ ایماں الوداع
ہو گئے پانی جگر حسرت سے جب تو نے کہا | خشک لب اہلِ حرم سے ہو کے گریاں الوداع
یوں چمن کو کس نے دکھلایا ہے آ کے معرکہ | سرخ تھی سب تیرے خوں سے خاک میداں الوداع
ہائے رخصت تیری یوں کیونکر ہوئی ہے اتفاق | دشت تو بے آب سب، یہ سر پہ طوفاں الوداع
خاک میں بھی دفن ہونا تیری قسمت میں نہ تھا
اے تمام اندوہ! کم انبوہ سلطاں الوداع

۳۳

وا ماندہ ترے کہتے ہیں سر دیکھ کے تیرا | ہم کیوں کہ کریں عمر بسر ہائے حُسینا
منظور نجابت، نہ شرافت، نہ سیادت | اب عیب ہوئے سارے ہُنر ہائے حُسینا
وارث نہیں جو پانی دیں ہم پیاسے ہوؤں کو | باقی ہے سو بیمار پسر ہائے حُسینا
تیرا ہی جگر تھا کہ ستم تو نے یہ دیکھے | سب ٹکڑے ہوئے تیر جگر ہائے حُسینا
ایسا تو گیا اٹھ کے کہاں گھر سے کہ ہم تک | پھر آئی نہ کچھ خیر خبر ہائے حُسینا
ہم دست تلطف کے ترے اٹھتے ہی سارے | ہر خس کے ہوئے دست نگر ہائے حُسینا
کیا اکبر و قاسم ہیں سبھی حلق بریدہ | یہ پودے عجب لائے ثمر ہائے حُسینا
انواعِ ستم دیکھتے ہیں تیرے موئے پر
کھول آنکھ ٹک انصاف تو کر ہائے حُسینا

ریاست کے لیے شبّیر مارا بھلا یوں اس کی تھی تقدیر، مارا
سبھوں کو کیوں ہے بے تقصیر مارا علی اصغر کے پھر کیوں تیر مارا
چھنائیں عورتوں کی کیوں ردائیں
روا کاہے کو رکھیں یہ جفائیں
جلے خیمے لُٹا گھر بار سارا ہوا کنبہ سبھی بتدری ہمارا
جوان و پیر سب کو تشنہ مارا اگرچہ یہ تھا دریا کا کنارا
یہ قطرہ آب کا دُرّ و گہر تھا
کہ لب خشگی سے ہر اک چشم تر تھا

۳۰

موئے یار و برادر اس کے پیارے سو ہو کر تشنہ لب دریا کنارے
تماشائی تھے لوگ اُمت کے سارے کہیں سو کیا کہیں ہم غم کے مارے
فآہا ثمّ آہا ثمّ آہا
رضائے حق کا مرتے تک تھا جویا لگی چپ ایسی تھا تصویر گویا
پھر آیا جی بہت لیکن نہ رویا غرض بے آبی نے سب گھر ڈبویا
فآہا ثمّ آہا ثمّ آہا
نہ پوچھو جس دم اس کا خوں بہا تھا ستم خنجر کا گردن نے سہا تھا
طرف قبلہ کے منہ کر جھک رہا تھا کہا سو یہ دمِ آخر کہا تھا
فآہا ثمّ آہا ثمّ آہا
اسیرِ خستہ دل بے زور و زور تھا کٹا سر باپ کا پیش نظر تھا
نہ یاور تھا نہ داور تھا نہ گھر تھا قیامت تھی غضب تھا شور و شر تھا
فآہا ثمّ آہا ثمّ آہا

۳۱

ہائے رے تیرا جگر یاور و خویش و پسر قتل ہوئے بالتمام، یا امام یا حسین
قہر، ستم، ہے غضب ساحل دریا پہ سب مارے گئے تشنہ کام، یا امام یا حسین
ہوتے ہیں ٹکڑے جگر لوگ جو حسرت کے ساتھ کہتے ہیں ہنگام شام، یا امام یا حسین

سَلام

سلام

۱

آوے ہے بے اختیار صلِّ علیٰ لب پہ ساتھ
لیتے ہیں جب تیرا نام تجھ پہ درود و سلام

راہ روِ راہِ راست، قطرہ زناں گریہ ناک
کہتے گئے گام گام تجھ پہ درود و سلام

رو کے ترے رنگ سے خوبی بھی اس باغ کی
اے گلِ خیر الانام تجھ پہ درود و سلام

بھیجتے ہیں صبح و شام بعد قعود و قیام
اہلِ مساجد تمام تجھ پہ درود و سلام

۲

اے بدخشانِ نبی کے لعلِ احمر السّلام
وے گلستانِ علی کے لالۂ تر السّلام

ایک ساعت ہی میں اُمّت پھر گئی نانا کی سب
کیا قیامت لائی تیرے سر کے اوپر السّلام

بوند بھر پانی نہ دریا، پر تجھے پینے نہ دیا
اے تمنائے دلِ ساقیِ کوثر السّلام

۳

ساقیِ کوثر کے پیارے السّلام
تشنہ لب سیّد ہمارے السّلام

بحرِ خوں میں غرق ہو چھوٹے بڑے
لگ گئے تم سب کنارے السّلام

کیا کہے اب میرؔ غم کش اِس سوا
کالے ہمیشہ کے دکھیارے السّلام

ترکیب بند سے

۴

اے گل خوش رنگ گلزار شہادت السّلام — تیری مظلومی کی دیں گے شہادت السّلام
جور دیکھے تو نے کیا کیا لعل سنگ جور سے — اے کہ گذری تیرے اوپر سخت حالت السّلام
کارواں در کارواں بار الم تجھ سے کھنچا — حوصلہ کس کا جو کھینچے یہ ملامت السّلام
تند باد ظلم نے تجھ کو دیا سا گل کیا — اے کہ تو تھا زیب ایوان رسالت السّلام

۵

گھر ترا اک بار ویراں ہو گیا — دم نہ مارا گو کہ بے جاں ہو گیا
خاک سے مل کر تو یکساں ہو گیا — السّلام اے رفتۂ راہِ رضا

چشم رکھیں تجھ سے سب درویش و شاہ — کج رکھیں تیرے بھروسے پر کلاہ
آفتاب حشر سے دے تو پناہ — السّلام اے سایۂ لطف خدا

ترکیب بند سے

میری تو بساط چشم تر ہے — سو نذر ہے اس پر گر نظر ہے
اس دشت میں زندہ ہوں میں جس میں — ہر گام پہ جان کا خطر ہے
گرمی تو کر اے صنم کہ آخر — پتھر کے جگر میں بھی شرر ہے
کیا ہوتا ہے قتل گہ میں دیکھیں — تیری شمشیر میرا سر ہے
آنے سے ڈرو نہ دل میں مرے — خوباں یہ تو تمہارا گھر ہے
لبریز گلہ ہوں گرچہ لیکن — ہونٹھوں پہ نہ حرف کا اثر ہوں

ہوں میں تو چراغ اخیر شب کا — کوئی دم کا ہوں میہماں میں

شب ہی عالم میں ہو گئی تھی — اپنے دل کا غبار دیکھا
آنکھیں گئیں روتے روتے لیکن — تو نے نہ اِدھر کو یار دیکھا
اب وعدہ نہ کر زیادہ بس ہم — جانا ترا اعتبار دیکھا
کہتے تھے یہ ہم نہ کر تمنا — اے جانِ امیدوار دیکھا

URDU NF

آنکھوں میں ٹھہر رہے ہے آنسو ہونٹھوں پہ دھرا رہے ہے شیون
تجھ بن نہیں سانس اور کچھ ہے چبھتا ہے جگر میں ہو کے سوزن
اے برق! ادھر نہ آ ہمارے ہر خوشے میں شعلوں کے ہے خرمن
ہم وے ہیں کہ باغ کر دکھائیں اشک گل گوں سے طرف دامن

سرکش نہ ہو زیر چرخ ان نے پامال کیے ہیں کیسے کیسے

کہتے ہو جسے فلک ہوا ہے میرے ہی غبار دل سے پیدا
وہ خستہ ہوں میں ہی جس کو کہیے رونق افزائے کوہ وصحرا

مرنے سے ڈرا نہ مجھ کو قاتل جی دینا تو مدعا ہے میرا
کاکل کو نہ کھول الجھنے کو دل زور ہی من چلا ہے میرا

ایسا ہی نہ تھا بتوں میں آ گے آخر کوئی میرا بھی خدا تھا

قطرہ تو ہے پر نہ ہاتھ اٹھاؤ دریا کو کرے ہے یہ کفایت

حامدی کاشمیری ۱۹۵۴ء سے ۱۹۵۹ء تک انگریزی کے لیکچرار کی حیثیت سے کام کرنے کے بعد ریاستی کلچر اکاڈمی میں اسسٹنٹ سکریٹری مقرر ہوئے۔ ۱۹۶۱ء میں شعبۂ اردو، کشمیر یونی ورسٹی میں لیکچرار مقرر ہوئے، ۱۹۷۸ء میں شعبے کے صدر اور پھر پروفیسر مقرر ہوئے، ۱۹۸۸ء میں شعبے میں ڈیپارٹمنٹ آف سپیشل اسسٹنس کے کوآڈینیٹر مقرر ہوئے، اسی سال ڈین فیکلٹی آف آرٹس نامزد ہوئے، ۱۹۹۰ء میں یونی ورسٹی کے وائس چانسلر مقرر ہوئے اور تاحال اسی عہدے پر مامور ہیں۔

حامدی کاشمیری شاعری، فکشن اور تنقید سے متعلق ستائیس کتابوں کے مصنف ہیں، ان میں عروسِ تمنا، نایافت، لاحرف اور شاخِ زعفراں شعری مجموعے ہیں، تین افسانوی مجموعوں اور چار ناولوں کے علاوہ انھوں نے سولہ تنقیدی کتابیں شائع کی ہیں، نئی شاعری اور نئی تنقید کو تخلیقی آگہی عطا کرنے میں حامدی کاشمیری کا نمایاں رول رہا ہے۔

[redacted]





میر تقی میر